میڈیا روپ اور بہروپ
سہیل انجم

میڈیا روپ اور بہروپ

سہیل انجم

ISBN : 978-81-929097-5-2

نام کتاب	:	میڈیا روپ اور بہروپ (اپڈیٹ ایڈیشن)
مصنف	:	سہیل انجم
تعداد	:	500
قیمت	:	400
پہلا ایڈیشن	:	۲۰۰۷
دوسرا ایڈیشن	:	۲۰۰۸
تیسرا ایڈیشن	:	۲۰۱۴
چوتھا ایڈیشن	:	۲۰۱۵
پانچواں ایڈیشن	:	۲۰۲۲
ناشر	:	سہیل انجم

مصنف کا پتہ : 370/6A ذاکر نگر، نئی دہلی۔110025
M. 9818195929 - 9582078862

sanjumdelhi@gmail.com

فہرست

انتساب

میں اپنی یہ قلمی کاوش اپنے والدین کے نام معنون کرتا ہوں

کہ

جن کی محبت وتربیت آج بھی میرے لئے مشعل راہ

اور

جن کی دعائیں میرے لئے قیمتی اثاثہ ہیں۔

(سہیل انجم)

(۱)

ابتدائیہ

پیش لفظ

گزشتہ دو دہائیوں میں ہندوستان نے جن شعبوں میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے ان میں میڈیا کا شعبہ بھی ہے۔ اس شعبے میں جو انقلاب آیا ہے وہ بہت خوش آئند ہے اور اس نے ہندوستان کو عالمی سطح پر ایک اہم مقام دلایا ہے۔ میڈیا جمہوریت کا چوتھا ستون ہے اور یہ چوتھا ستون آج انتہائی طاقتور ہو گیا ہے۔ اتنا طاقتور کہ اگر باقی تین ستونوں میں سے کسی ایک میں ذرا بھی لرزش پیدا ہوتی ہے تو یہ چوتھا ستون اس کو تھام لیتا ہے اور اس طرح ہندوستانی جمہوریت کی عمارت پھر پہلے کی مانند محفوظ و مامون ہو جاتی ہے۔ یہاں میڈیا کو پوری آزادی حاصل ہے۔ وہ جو چاہے کرے اور جس سیاستداں یا جس شخصیت سے جو سوال چاہے پوچھے۔ کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ہندوستانی آئین نے میڈیا کو جو آزادی دی ہے وہ بھی اس کی انقلاب آفریں ترقی میں معاون بنی ہوئی ہے۔ یہ بات بہت ہی حوصلہ بخش ہے اور اس سے حوصلہ پا کر ہی تعلیم یافتہ نوجوان گروہ در گروہ میڈیا میں داخل ہو رہے ہیں۔ میڈیا میں بہت ساری برائیوں کے باوجود اس پر لوگوں کا اعتبار قائم ہے اور بہت سے ایسے لوگ جو کسی معاملے میں ان کے خیال میں پھنسا دیئے جاتے ہیں وہ خود کو پولیس کے حوالے کرنے سے قبل میڈیا کے حوالے کر دیتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ پولیس میں جانے کے بعد وہ آزادی سے کچھ نہیں کہہ سکیں گے اس لئے اس سے پہلے میڈیا میں آکر وہ اپنی بات رکھتے ہیں اور میڈیا سے انصاف کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالیہ دنوں میں ایسے متعدد واقعات ہوئے ہیں کہ پولیس نے ملزموں کو میڈیا کے نیوز روم سے گرفتار کیا ہے۔

یہ صورت حال میڈیا کے مزید فروغ کی جانب واضح اشارہ کرتی ہے اور اگر اپنی تمام تر خرابیوں کے باوجود میڈیا نے اپنا اعتبار اور وقار برقرار رکھا تو اس کو مزید آگے بڑھنے سے

کوئی نہیں روک سکے گا۔ آج ہندوستان میں ۳۵۰ سے زائد ٹی وی چینل ہیں جن میں ۳۶ نیوز چینل ہیں۔ جبکہ بیس سال قبل ہندوستان میں صرف ایک چینل ہوا کرتا تھا۔ یہ میڈیا کا فروغ ہی ہے کہ آج ہندوستان دنیا کا تیسرا بڑا ٹیلی ویژن مارکیٹ بن گیا ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ہندوستان نیوز چینل ، انٹرٹینمنٹ چینل ، بالی ووڈ ، ریڈیو ، اخبارات ورسائل اور جرائد میں فروغ کے سبب دنیا کا سب سے بڑا انٹرٹینمنٹ مارکیٹ بن جائے گا۔ ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کی انٹرٹینمنٹ انڈسٹری ۲۰۱۵ء تک ۱۰۸ کھرب ڈالر سے بھی تجاوز کر جائے گی اور اس میں ہندوستان کا حصہ ۲۰۰ ارب ڈالر کا ہوگا۔

میڈیا کے فروغ اور ٹی وی چینلوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ کے سبب چینلوں میں زبردست مقابلہ بھی چل رہا ہے اور بریکنگ نیوز کے لیے جانے کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑ رہے ہیں۔ اب تو یہ بریکنگ نیوز بریکنگ نیوز نہ رہ کر ٹوٹتی ہوئی خبریں ہوگئی ہیں۔ اب تو شاہد کپور اور قرینہ کپور کی بوسہ بازی کا منظر بھی بریکنگ نیوز بن جاتا ہے۔ عدالت سلمان خان کے خلاف سماعت کرتی ہے تو وہ بھی بریکنگ نیوز بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ ایشوریہ رائے کے انٹرویو کو بھی بریکنگ نیوز کے طور پر دکھایا جاتا ہے۔ بریکنگ نیوز کے اس رجحان نے حقیقی بریکنگ نیوز کے تصور کو ہی پاش پاش کر دیا ہے۔ یہ رجحان میڈیا کے وقار اور اعتبار میں گراوٹ کا سبب بن سکتا ہے۔ اس پر نیوز چینلوں کے ذمہ داروں کو غور کرنا چاہئے۔ اس صورت حال نے سنجیدہ صحافت کو بھی نقصان پہنچایا ہے تاہم ابھی اتنا نقصان نہیں پہنچا ہے کہ اس پر سے اعتبار ہی اٹھ جائے۔

آج جو نوجوان میڈیا میں آرہے ہیں ان میں بعض ایسے ہوتے ہیں جن کو کچھ زیادہ معلومات نہیں ہوتی۔ بی بی سی کے پال ڈونہر (Paul Donahar) نے کئی سال قبل کے ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ بقول ان کے ایک نوجوان جرنلسٹ اس وقت کے وزیر داخلہ اندر جیت گپتا کا پیچھا کر رہا تھا، اور جب وہ ان کے قریب پہنچا تو اس نے پہلا سوال یہ کیا کہ ''سر! آپ کچھ کہیں گے؟'' اور اس کا دوسرا سوال تھا ''سر! آپ کون ہیں؟'' اس قبیل کے نوجوان جرنلسٹ آج بھی مل جائیں گے۔

آج نیوز چینلوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ اگر کوئی بڑا واقعہ ہوا تو وہ پورے دن بلکہ کئی کئی دنوں تک اس کو دکھاتے رہتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے اور کوئی دوسری خبر ہی نہیں ہے۔ میڈیا والے ایسے واقعات کو تلاش بھی کرتے ہیں جن سے وہ فائدہ اٹھا سکیں اور اپنا ٹی آر پی بڑھا سکیں۔ حالیہ واقعہ ہریانہ کے بچے پرنس کا ہے جو ۶۰ فٹ گہرے گڈھے میں گر گیا تھا اور جس کو نکالنے میں ساٹھ گھنٹے لگے تھے۔ اس واقعہ کو ایک تفریحی واقعہ کے طور پر دکھایا جاتا رہا اور بچے پر اس کے والدین پر کیا گزر رہی ہے اس پر کم توجہ تھی۔ جب فوجی جوانوں نے بچے کو نکالا تو کیمرے کا فوکس فوجی جوانوں کے بجائے اس پر تھا کہ بچہ کہاں ہے اسے کہاں لے جایا جارہا ہے اب کیا ہو رہا ہے اور آئندہ کیا ہونے والا ہے۔ بچے کو بچانے کا آپریشن ختم ہونے کے بعد کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ ٹیوب ویل کا گڈھا کھلا کیوں چھوڑ دیا گیا تھا اور جنھوں نے ایسا کیا تھا ان کے خلاف کوئی کارروائی ہونی چاہئے یا نہیں۔ چند روز بعد ایک نجی ٹی وی چینل اسے اس انداز میں ادھر ادھر لے جارہا تھا جیسے کہ اسے اس نے گود لے لیا ہو۔ پرنس کو بمبئی لے جایا گیا فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں سے ملوایا گیا۔ ایک چینل پر گانوں کے مقابلے میں شریک ہونے والے بچوں کے ساتھ اس کو پورا دن رکھا گیا۔ دراصل ٹی وی چینلوں نے پرنس کو بزنس کرنے کا ایک ہتھیار بنالیا۔ اس سے اپنا ٹی آر پی بڑھایا۔ لیکن کسی نے بچے کی تجسس آمیز آنکھوں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی، کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں اس سے اس کا بچپن تو متاثر نہیں ہو رہا ہے۔ حالانکہ ایسے واقعات ہندوستان میں عموماً ہوتے رہتے ہیں۔ مگر ہر واقعہ پر میڈیا مہربان نہیں ہوتا۔ ''را'' کے سابق سکریٹری وکرم سود سوال کرتے ہیں کہ ہمارا میڈیا ان چیزوں کو دکھانے اور شاہد قرینہ کی بوسہ بازی کو سنسنی خیز بنا کر پیش کرنے کے بجائے نیشنل جیوگرافک چینل، اینیمل پلانٹ اور ڈسکوری چینل کی مانند دستاویزی فلمیں کیوں نہیں بناتا۔ نکسل مسئلے پر کوئی دستاویزی فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔ حکومتوں کی ناقص کارکردگیوں پر فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔ خودکشی کرنے والے کسانوں پر فلم کیوں نہیں بنتی۔ ملک میں پانی اور گیہوں کی قلت پر فلم کیوں نہیں بنائی جاتی۔ سماج کو بہتر بنانے اور فرقہ وارانہ یگانگت پیدا کرنے والے پروگرام کیوں نہیں دکھائے جاتے۔ کیوں صرف سنسنی خیزی

ہی کو پروان چڑھایا جاتا ہے۔ میڈیا کا کام صرف بزنس کرنا ہی نہیں بلکہ سماج کو اطلاعات فراہم کرنا بھی ہے۔ مگر آج جس انداز میں اطلاعات فراہم کی جارہی ہیں ان میں تجارتی پہلو کو اولیت حاصل رہتی ہے۔ اسی طرح آج نیوز چینل جس قسم کا اسٹنگ آپریشن کررہے ہیں اس کو سنجیدہ طبقے کی تائید حاصل نہیں ہے۔ آج کا اسٹنگ آپریشن اسکینڈل کو بے نقاب کرنے والا کم، لوگوں کو پھنسانے والا زیادہ بن گیا ہے۔

آج میڈیا کی سوچ میں بہت تبدیلی آ گئی ہے۔ خاص طور پر ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء اور ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۱ء کے واقعات کے بعد اس کا زاویہ نظر تبدیل ہو گیا ہے۔ ۶ر دسمبر کے واقعہ نے ہندوستانی میڈیا کو اتنا متاثر نہیں کیا جتنا کہ نائن الیون نے کیا۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ نائن الیون مغربی میڈیا کے حواس پر چھایا ہوا ہے اور ہندوستانی میڈیا مغربی میڈیا کی نقالی میں اس سے بھی دو قدم آگے نکل گیا ہے۔ آج میڈیا کے پاس دو دماغ ہیں اور دو زبانیں ہیں، دو نقطہ نظر ہے، دو زاویہ نگاہ ہے اور دو عینکیں ہیں۔ ایک عینک سے وہ مسلمانوں کو دیکھتا ہے اور دوسرے سے باقی دنیا کو۔ پہلی عینک سے پوری دنیا کا مسلمان دہشت گرد اور تخریب پسند نظر آتا ہے اور وہ اسی عینک سے مسلمانوں کو دیکھنا پسند بھی کرتا ہے۔ ٹی وی چینلوں کے بیشتر اینکر اسی چشمے کو پہنے ہوئے ہیں اور اسی سے وہ مسلمانوں کو دیکھتے ہیں۔

مالیگاؤں بم دھماکوں کے بعد ایک نیوز چینل پر ڈسکشن چل رہا تھا، اینکر بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو سوال پوچھ رہا ہے وہ کسی نظریے کا چشمہ لگائے بغیر پوچھ رہا ہے مگر اس کا ہر سوال مسلم مخالف تھا۔ بالآخر مباحثے میں شریک جاوید اختر اور تیستا سیتلواڈ کو اسے ڈانٹنا پڑا۔ یہ کہنا پڑا کہ تم اپنے سوالات کا زاویہ ٹھیک کرو، تمہارا ہر سوال فرقہ پرست ہے۔ یہ کسی ایک چینل کی کہانی نہیں ہے بلکہ بیشتر چینلوں پر ایسا ہی ہو رہا ہے۔ تیستا نے مالیگاؤں دھماکوں کی رپورٹنگ کے سلسلے میں ان اخبارات اور نیوز چینلوں کی اچھی خبر لی جو ان دھماکوں کے ساتھ ساتھ مالیگاؤں کی فرقہ وارانہ منافرت کی تاریخ بیان کرنے پر زیادہ زور دے رہے تھے۔

میڈیا کی بدلی ذہنیت کا اندازہ ایک اور واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ اسی سال اپریل میں

بجرنگ دل اور وشو ہندو پریشد کے ایک معروف کارکن کے گھر میں بم بناتے ہوئے دو لوگوں کی موت ہوگئی۔ پولیس نے اس واقعہ میں بچ جانے والے ایک شخص اور ایک عینی شاہد سے پوچھ تاچھ کی۔ انھوں نے برین میپنگ اور نارکو انالیسس ٹیسٹ میں یہ اعتراف کیا کہ انھوں نے ہی ۲۰۰۳ء میں پربھنی میں مسجد کے باہر دھماکہ کیا تھا اور ۲۰۰۴ء میں جالنا اور پورنا میں مسجدوں کو نشانہ بنا کر دھماکے کئے تھے۔ مگر یہ خبر کہیں نظر نہیں آئی۔ اخبارات نے ممکن ہے کہ ایک کالمی خبر بنا کر کہیں چھاپ دی ہو مگر الیکٹرانک میڈیا نے اس پر مباحثہ نہیں کیا اور اس کو نمایاں کر کے پیش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ اخبار ہندوستان ٹائمز نے ۱۱ر ستمبر ۲۰۰۶ء کے اداریے میں اس واقعہ کو ضرور شامل کیا۔

تاہم میڈیا بعض اوقات ایسے کام بھی کرتا ہے جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے نقطہ نظر سے قابل ستائش ہوتے ہیں مگر ان کی تعداد بہت کم ہے۔ ہاں گجرات فسادات کے دوران میڈیا کی غیر جانبدارانہ کوریج کو فراموش نہیں کیا جا سکتا جس نے مودی اینڈ کمپنی کو پوری طرح بے نقاب کر دیا تھا۔

میں نے اس کتاب میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے مختلف پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور انتہائی غیر جانبدارانہ انداز میں میڈیا کے کردار کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔ ممکن ہے کہ بعض گوشے تشنہ رہ گئے ہوں یا میرے قلم کی گرفت سے بچ گئے ہوں۔ تاہم میں نے ایک عمومی نظر ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے چند مضامین بعض سیمناروں میں پڑھے گئے ہیں لیکن ۹۰ فیصد مضامین غیر مطبوعہ ہیں اور جن کو کہیں پڑھا نہیں گیا ہے۔

میں ان مضامین کی تیاری اور ان کو کتابی شکل میں پیش کرنے کے لئے بزرگ صحافی اور مشفق و محترم جناب محفوظ الرحمٰن صاحب کا انتہائی شکر گزار ہوں کہ انہی کی تحریک اور حوصلہ افزائی سے یہ مضامین تحریر کیے گئے اور اب کتابی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ میں روزنامہ قومی آواز دہلی کے ایڈیٹر جناب موہن چراغی صاحب اور سرکردہ صحافی اور ملک کے چند ممتاز کالم نگاروں میں سے ایک جناب سعید سہروردی صاحب کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس کتاب پر اپنی آراء تحریر کرنے کی

زحمت گوارا فرمائی۔ انتہائی ناسپاسی ہوگی اگر میں مفتی عطاء الرحمٰن قاسمی صاحب اور ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس کا شکریہ ادا نہ کروں، کیونکہ ان کی کوششوں اور تعاون سے یہ کتاب منظر عام پر آ گئی ہے۔ میں اپنی شریک حیات انیسہ انجم، بیٹے سلمان فیصل اور بیٹیوں نسیم صبا، ناہید درخشاں اور شمع فروزاں کا بھی شکرگزار ہوں کہ انھوں نے مجھ کو گھریلو کاموں کی ذمہ داریوں سے فارغ کر کے ایک ایسا علمی اور پُرسکون ماحول فراہم کیا جس میں میں ان مضامین کو تحریر کر سکا اور اس موضوع کا گہرائی سے جائزہ لے سکا۔ میں بیٹے سلمان فیصل کا اس لئے بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اپنی تعلیمی مصروفیات میں سے وقت نکال کر بیشتر مضامین کی کمپوزنگ کی اور مواد کی تیاری میں میرا ساتھ دیا۔ میرے اہل خانہ کا یہ تعاون مجھے حاصل نہ ہوتا تو شاید میں یہ کتاب آپ کے سامنے پیش نہیں کر پاتا۔ مضامین کیسے ہیں اور میں نے اس موضوع کا کتنا حق ادا کیا ہے اس کا فیصلہ آپ قارئین کریں گے اور مجھے آپ کی آراء کا شدت سے انتظار رہے گا۔

والسلام

سہیل انجم

محاسبہ میڈیا کا

سعید سہروردی

سہیل انجم نے ایسے موضوع پر قلم اٹھایا ہے، جو ہمارے دور میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔اس وقت پورے ماحول پر میڈیا کے اثر کو ''غلبہ'' کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ہم اس کے مقابلے میں خود کو بے بس پاتے ہیں۔اگر دنیا کے مسلمانوں کی نظر سے دیکھیں تو میڈیا ان کے خلاف ایک زبردست ہتھیار کے طور پر استعمال ہورہا ہے۔عالمی سطح پر یہ احساس پیدا ہورہا ہے کہ ہم کو جوابی حملے کی تیاری کرنی چاہیے۔کوئی حملہ دشمن کو سمجھے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتا۔سہیل انجم نے ''میڈیا۔روپ بہروپ'' کے ذریعہ اس تیاری کو علمی اور عملی شکل دی ہے۔اپنے موضوع کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے لکھا ہے ''چھوٹا سا لفظ 'میڈیا' اپنے دامن میں اطلاعات، نشریات اور ترسیل وابلاغ کی اتنی وسعت رکھتا ہے کہ دنیا اس کے اردگرد سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جب سے نیوز چینلوں کا زمانہ آیا ہے، یہ لفظ کثیر جہت بن گیا ہے''۔

میڈیا کا اردو متبادل تلاش کرنے میں دشواری ہوگی۔اپنی روایت اور کردار کے مطابق اردو نے اس لفظ کو اصطلاح کے طور پر قبول کرلیا ہے۔ان کی اس رائے سے اختلاف کی گنجائش نہیں۔''صحافت پہلے صرف اخبارات اور رسائل تک محدود تھی۔اس میدان میں ان کی بلا شرکت غیرے اجارہ داری تھی۔آج ایک اور شہسوار بھی اس میدان میں کود پڑا ہے، جو پہلے شہسوار کے مقابلے میں زیادہ تیز، زیادہ ذہین، زیادہ چمک دمک رکھنے والا، زیادہ دور رس، زیادہ زود اثر، زیادہ چالاک اور مطلوبہ مقام پر بہت جلد رسائی کرلینے کی قدرت رکھنے والا مرد میدان ہے''۔ الیکٹرانک میڈیا کی طاقت اور پرواز کا اعتراف کرنے کے بعد وہ یہ مانتے ہیں 'حالانکہ آج

الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پرنٹ میڈیا غیر اہم ہو گیا ہے۔ اس کی آج بھی اپنی اتنی ہی اہمیت اور معنویت ہے جتنی کہ پہلے تھی اور باخبر حلقہ کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت آئندہ بھی کم نہیں ہوگی۔'

الیکٹرانک میڈیا کو یہ فضیلت ہمیشہ حاصل رہے گی۔ وہ واقعات اور وارداتوں کو اخبارات اور رسائل سے پہلے پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ پرنٹ میڈیا واقعہ یا واردات پر تبصرہ کے لیے ہر ممکن ذریعہ کو استعمال کر سکتا ہے۔ اگر اس نظر سے دیکھیں تو دونوں ایک دوسرے کے رقیب اور حریف نہیں بلکہ معاون اور حبیب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی حدود متعین کرنے سے پہلے وہ اس موضوع پر اپنے کام کی تحریک اور ترغیب کو واضح کرتے ہیں۔ یہ بات اس باب کے عنوان ''نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل'' سے صاف ظاہر ہے۔ اخبار نویس کی حیثیت سے سہیل انجم نے اس کرب کو شدت سے محسوس کیا، جو ہر اس فرد کا مقدر ہے، جس کا واسطہ کسی نہ کسی شکل میں خبروں اور اخباروں سے پڑتا ہے۔ ان کے مطالعہ کا موضوع بنیادی طور پر ہندوستانی میڈیا ہے۔ اس جائزے میں پرنٹ میڈیا اور الیکٹرانک میڈیا دونوں شامل ہیں۔ دونوں کے میدان جداگانہ ہیں، لیکن ان کے تعصّبات مشترک ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کی ملکیت کم و بیش مشترک ہے۔ اگر ''انڈیا ٹوڈے'' پر سنگھ پریوار کا اثر ہے تو ''آج تک'' اس دباؤ سے کیسے بچ سکتا ہے؟ ہر چینل کا تعلق کسی ملکی یا غیر ملکی میڈیا تنظیم سے ہے۔ جو اس کے اخبار کی پالیسی ہوگی، اس سے وابستہ چینل کی بھی وہی ہوگی۔

انھوں نے دو اہم تاریخوں کے سلسلے میں میڈیا کے رول پر روشنی ڈالی ہے۔ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت ہوئی۔ اس وقت ہندوستانی الیکٹرانک میڈیا ترقی یافتہ نہیں تھا۔ غیر ملکی چینل سی۔ این۔ این کی ویڈیو ریکارڈنگ ساری دنیا میں دیکھی گئی۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملہ ہوا۔ دونوں وارداتوں کے درمیان دس برسوں سے کم کا عرصہ ہے۔ یہ عرصہ میڈیا کے عروج کا ہے۔ یہی وقت یک قطبی سپر پاور امریکہ کے غلبہ کا بھی ہے۔ ان دونوں وارداتوں کو الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ ساری دنیا میں دیکھا گیا۔ ۱۱ ستمبر کو زیادہ بڑے پیمانے پر۔

میڈیا کے کردار پر تبصرہ کرتے وقت یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ الیکٹرانک میڈیا نے ان وارداتوں کو اسی طرح دکھایا جیسے کرکٹ، ہاکی یا فٹ بال میچ دکھائے جاتے ہیں۔ان کا ویڈیو ریکارڈ بھی بن جاتا ہے، جو آئندہ صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا واقعات اور وارداتوں کا ویڈیو ریکارڈ بنانے کے ساتھ ان کے لاکھوں اور کروڑوں چشم دید گواہ بھی تیار کردیتا ہے۔ان وارداتوں کے ویڈیو ریکارڈ کی موجودگی میں ان کے بارے میں گمراہ کرنا ممکن نہیں۔اگر بھارتیہ جنتا پارٹی کے لیڈر بابری مسجد کی شہادت کے الزام سے بچ نہیں پاتے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ لاکھوں افراد نے موقعۂ واردات پر ان کو موجود دیکھا ہے، ان کی آواز سنی ہے۔ یہ ویڈیو ریکارڈ گجرات کے وزیراعلیٰ نریندر مودی کو مسلمانوں کی نسل کشی کا ملزم دکھاتا ہے۔ اسی ریکارڈ کی بنیاد پر سیکولر ذہن رکھنے والوں نے بابری مسجد کی شہادت کے بارے میں دستاویزی فلمیں بنائی ہیں۔

میڈیا کے رول اور اس کے اثر کو سمجھنے کے لیے ہمیں کچھ اور کرنا ہوگا۔ اردو نے میڈیا اور الیکٹرانک جیسے الفاظ کو قبول اور جذب کیا ہے۔اسی طرح دو مترادف انگریزی الفاظ میں سے کسی ایک کے اردو متبادل کو اصطلاح کی شکل میں قبول کرنا ہوگا۔ ایک لفظ ہے ''سسٹم'' (System) جس کا اردو متبادل ''نظام'' ہوسکتا ہے ۔ دوسرا لفظ ہے ''اسٹیبلشمنٹ'' (Establishment) جس کا متبادل ''بندوبست'' ہوسکتا ہے۔ دونوں کے مفہوم میں زیادہ فرق نہیں۔زیادہ غور کرنے کے بعد ''اقتدار'' کو ترجیح دوں گا۔ دونوں سے مراد قانون بنانے اور قانون نافذ کرنے والے ادارے اور ان کا غیر سرکاری ماحول ہے۔ہم ان میں سے کسی ایک کو اصطلاح کی شکل میں اختیار کرسکتے ہیں۔

قومی یا عالمی تناظر سے الگ کرکے میڈیا کے بارے میں آزادانہ اور منصفانہ رائے قائم کرنا ممکن نہیں۔ ہزار دعوے کیے جائیں، میڈیا دنیا کے کسی ملک میں پوری طرح آزاد نہیں۔ جمہوریت اور شخصی آزادی کا ڈھول پیٹنے والے امریکہ میں بھی نہیں۔

اقتدار سے الگ کرکے میڈیا کے رول کا جائزہ نہیں لیا جاسکتا۔اگر یہ احتیاط نہ برتی گئی تو ہم

ارباب اقتدار کے گناہ میڈیا کے کندھوں پر لاد دیں گے۔ بابری مسجد ہو یا ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر فضائی حملہ، ان میں کہیں نہ کہیں حکومت یا 'اقتدار' کے رول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ بابری مسجد میں مورتیاں اس وقت رکھی گئیں، جب ملک کو آزاد ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ کام ریاستی حکومت کے علم میں کیا گیا۔ ریاست کے کانگریسی وزیر اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنت تھے، جن کا مجسمہ پارلیمنٹ کے قریب نصب ہے۔ ایک شاہراہ ان کے نام سے منسوب ہے۔ سیکولر جمہوری مزاج رکھنے والے پنڈت جواہر لال نہرو ملک کے وزیر اعظم تھے۔ اس وقت نہ دوردرشن تھا، نہ ٹی وی، نہ نیوز چینل۔ سنگھ پریوار کی روح رواں آر۔ایس۔ایس چوری چھپے اپنی شاکھائیں لگاتی تھی۔ بابری مسجد کی شہادت کا ذکر کرتے وقت میڈیا سے زیادہ حکومت کے کردار پر حرف آتا ہے۔ گاندھی جی کو جب گولی لگی تھی تو آر۔ایس۔ایس کی جو شاکھائیں عوام کے علم میں تھیں، ان پر حملے ہوئے تھے۔ عوام کی ناراضگی کے ڈر سے پنڈت نہرو کی حیات تک آر۔ایس۔ایس ایک خفیہ تنظیم رہی۔ اس نے سینہ بہ سینہ، گوش بہ گوش اپنا حلقۂ اثر بڑھایا۔ اس عرصہ میں نہ میڈیا نے اس کی طرف توجہ کی، نہ اس نے میڈیا کا سہارا لیا۔ پہلے انھوں نے لال بہادر شاستری کے دورِ حکومت میں اقتدار سے رشتے قائم کیے۔ ۱۹۶۵ء کی ہند۔پاک جنگ نے ان کو کھل کر سامنے آنے کا موقع دیا۔ جے پرکاش نرائن کے سمپورن کرانتی آندولن میں شامل ہو کر قومی سیاست میں انھوں نے اپنی جگہ بنائی۔ پہلے جنتا پارٹی میں شامل ہوئے، پھر بھارتیہ جنتا پارٹی بنا کر الگ ہوئے۔ اب جے پرکاش نرائن کی بنائی ہوئی جنتا پارٹی کو ملک کی سیاست میں خوردبین سے تلاش کرنا پڑے گا۔ لیکن کانگریس کی سب سے بڑی سیاسی حریف بھارتیہ جنتا پارٹی ہے۔

جو تنظیمیں اپنی خفیہ سرگرمیوں کی وجہ سے اقتدار کی نظروں میں معتوب ہوتی ہیں، وہ میڈیا کے بجائے عوام پر اپنے اثر پر بھروسہ کرتی ہیں۔ ہندوستان کے بڑے سرمایہ داروں کے نقیب انگریزی اخباروں نے بائیں بازو کو نظر انداز کیا ہے یا ان پر ناقدانہ نظر رکھی ہے۔ اس چوکیداری کے باوجود مغربی بنگال، تری پورہ اور کیرالا میں ان کو اقتدار حاصل کرنے سے نہ روک سکے۔ اس سے یہ ظاہر ہے کہ میڈیا کی عملداری کی اپنی حدود ہیں۔ وہ جو چاہے نہیں منوا سکتا۔ ہندوستانی میڈیا

کا ذکر کرتے وقت ایمرجنسی کے دور کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اس زمانے میں اقتدار نے میڈیا پر پوری طرح غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ ایک صحافی نے اس دور پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا تھا، ''ان سے جھکنے کو کہا گیا تو وہ سجدے میں چلے گئے''۔ اب ایمرجنسی نہیں ہے لیکن حاکم یہ بات خوب جانتے ہیں کہ کس کو کب کیسے جھکایا اور مغلوب کیا جا سکتا ہے؟ بڑے سرمایہ دار اشتہارات کو حربہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ حکومت کے پاس اشتہار کے علاوہ دوسرے حربے بھی ہیں، جن سے بوقت ضرورت کام لیا جاتا ہے۔

ونود مہتہ، اس وقت ''آؤٹ لک'' کے ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے اپنی خود نوشت کا عنوان رکھا ہے ''مسٹر ایڈیٹر! آپ وزیر اعظم کے کتنے قریب ہیں''۔ یہ سوال ان سے اخبار کے مالک سنگھانیہ نے کیا تھا۔ ونود مہتہ نے سنگھانیہ کے لیے انگریزی روزنامہ ''انڈین پوسٹ'' جاری کیا تھا۔ اخبار کی آزاد روش اور اس کی تنقید سے وزیر اعظم راجیو گاندھی ناخوش تھے۔ انھوں نے سنگھانیہ کو بلا کر شکایت کر دی۔ سنگھانیہ نے ونود مہتہ سے جو سوال پوچھا اس کی تہہ میں یہی بات تھی۔ کچھ عرصہ بعد سنگھانیہ کو اندازہ ہوا کہ اخبار نکالنے سے ان کو فائدہ کے بجائے نقصان ہو سکتا ہے۔ اخبار بند ہو گیا۔ اس سلسلے میں ترن تیج پال اور ان کے اخبار ''تہلکہ'' کا ذکر کرنا مناسب ہے۔ انھوں نے سہیل انجم کے الفاظ میں ''اسٹنگ آپریشن'' کر کے ایک بڑا اقدام اٹھایا تھا۔ بھارتیہ جنتا پارٹی کے صدر بنگارو لکشمن کو روپیہ لیتے ہوئے کیمرے سے گرفت میں لیا تھا۔ اس کے علاوہ جارج فرنانڈیز کے گھر پر اور فوجی افسروں کی سودے بازی کی تصویریں بھی سامنے آئیں۔ بدعنوانیوں کے خلاف یہ شہادت پیش کرنے کا انعام کیا ملا؟ ''تہلکہ'' پر ہر طرف سے یلغار ہوئی۔ اس میں سرمایہ لگانے والوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ان کے کاروبار کو متواتر چھاپوں سے تباہ کر دیا گیا۔ اس وقت قومی جمہوری اتحاد کی حکومت تھی۔ جب تک واجپئی اور اڈوانی کا اقتدار رہا، 'تہلکہ' کو سانس لینے کا موقع نہیں ملا۔

جہاں تک گیارہ ستمبر کا تعلق ہے۔ اگر امریکہ سپر پاور نہ ہوتا تو ایسا کچھ بھی نہ ہوتا جو ہوا۔ اگر کوئی اور ملک ہوتا تو سلامتی کے اس معاملے میں صدر یا وزیر اعظم کا استعفیٰ لازمی ہوتا۔ اندر کی

بات تھی، خفیہ ایجنسی کے سربراہ کی برطرفی ضرور ہوتی۔ اس نے حکومت کو بروقت اطلاع نہیں دی۔ سفارتی ذرائع سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی کہ امریکہ کے خلاف اتنی شدید نفرت کیوں ہے، جو چند نوجوانوں کو اپنی جان پر کھیلنے پر آمادہ کرسکتی ہے؟ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ ایسا نہ ہونے سے ایک بات ظاہر ہوگئی کہ امریکی جمہوریت محض ڈھکوسلہ ہے۔ جمہوری عمل سے ایک ڈکٹیٹر اقتدار حاصل کرتا ہے، جسے قابو میں رکھنا آسان نہیں۔ امریکی صدر نے سارے الزامات سے بچنے کے لیے ایک مفروضہ ''دہشت گردی'' کا اختراع کرلیا۔ اس ''آسیب'' کا پیچھا کرتے ہوئے وہ افغانستان اور عراق کو برباد کر چکے ہیں لیکن اب تک یہ ثابت نہ ہوسکا کہ ان ملکوں کا گیارہ ستمبر کی واردات سے کوئی تعلق تھا بھی یا نہیں۔ اگر اس معیار سے دیکھیں تو ہندوستانی میڈیا اور ہندوستانی جمہوریت ہزار درجہ بہتر ہیں۔ یہاں حکومت کے خلاف آواز دبانے کی کوشش تو ہوسکتی ہے، لیکن اس کو پوری طرح دبانا اور کچلنا ممکن نہیں۔ اندرا گاندھی کو ۱۹۷۷ء میں یہ سبق مل گیا۔ بابری مسجد کی شہادت اور گیارہ ستمبر کی واردات دونوں قومی اور عالمی بندوبست کی بڑی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ بابری مسجد کی شہادت نے واضح کردیا کہ ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو آئین کے پابند اور وفادار نہیں، ان کو ضرورت سے زیادہ چھوٹ دی گئی ہے۔ گیارہ ستمبر کے بعد کے واقعات نے دکھادیا کہ دوسری جنگ عظیم کے بعد امن کے قیام کے لیے جو انتظام ہوا تھا وہ مفلوج اور معطل ہو چکا ہے۔

یہ وہ باتیں ہیں جو سہیل انجم کی کتاب پڑھنے کے بعد ذہن میں آئیں ورنہ انھوں نے اپنے موضوع کا کوئی پہلو اور گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا ہے۔ صحافیوں کے علاوہ عام قاری کے لیے بھی اس کا مطالعہ منفعت کا ذریعہ ہوگا۔

میڈیا کا پوسٹ مارٹم

محفوظ الرحمٰن
سابق چیف ایڈیٹر روز نامہ ''قائد''، لکھنؤ و سہ روزہ ''دعوت''، دہلی

جواں سال صحافی سہیل انجم کی تصنیف میڈیا روپ اور بہروپ کے مسودے کے بیشتر حصے کو میں نے پڑھا ہے اور میں یہ بات پورے وثوق اور پوری ذمہ داری کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فاضل مصنف نے حقائق کی تہہ تک اتر جانے کی جس غیر معمولی صلاحیت، جزرسی اور نکتہ سنجی و نکتہ آفرینی کا مظاہرہ کیا ہے وہ اگر موجودہ حالات میں بالکل ناپید نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ سہیل انجم برسہا برس تک صحافت کے خارزار میں اپنے تلووں کو لہولہان کرتے رہے ہیں۔ وقت کی چلچلاتی دھوپ میں وہ ایک مدت تک کسی شجر سایہ دار یا سائبان کی تلاش میں سرگرداں رہے ہیں اور محسوس ہوتا ہے کہ یہ تحمل، یہ قوت برداشت، ہر تلخ بات کو نرم لہجے میں کہہ ڈالنے کی غیر معمولی صلاحیت اور تنقیص کے بجائے صحت مند تنقید کی ڈگر پر چلتے چلے جانے کا جو حوصلہ ان کی کتاب کے سطور اور بین السطور دونوں میں ہی پوری قوت کے ساتھ جھلکتا ہے، غالبًا انہی دنوں کی دین ہے۔

سہیل انجم صحافی ہیں، معلم اخلاق نہیں۔ یہ بات انھیں اچھی طرح معلوم ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ جس سماج کے وہ فرد ہیں ان پر اس کی بھی کچھ ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وہ جس پیشے سے وابستہ ہیں کم از کم اس کے حوالے سے تو انھیں سماج کے تعلق سے کچھ نہ کچھ کرنا ہی چاہئے۔ چنانچہ انھوں نے صحافت خاص کر الیکٹرانک میڈیا کی بے راہ روی کی گرفت کی ہے مگر اپنے مخصوص انداز میں۔ انھوں نے اپنے قلم

کو جراح کے نشتر کی طرح استعمال کیا ہے، جلاد کے چھرے کی طرح نہیں۔ مثال کے طور پر اسٹنگ آپریشن کو وہ قابل اعتراض تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اسٹنگ آپریشن دانہ ودام کی قدیم تکنیک کی بھونڈی تجدید ہے۔ انھیں بریکنگ نیوز کے لیے دیانت اور صحت مند صحافت کے تمام اصولوں کو نظر انداز کر کے آپس کی مارا ماری بھی پسند نہیں۔ اور کسی بھی صحیح الفکر شخص کو بھی پسند نہیں آسکتی۔ ان کے لیے یہ بات بھی اذیت ناک ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں سیکس پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جرائم سے متعلق رپورٹیں بھی اس طرح دکھائی جارہی ہیں کہ ان پر سیکس کا عنصر غالب رہے۔ لیکن وہ ان تمام معاملات پر اظہار خیال کرنے میں احتیاط کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے۔ ان کی تنقید بھی دل سوزی اور دردمندی کی اعلیٰ مثال ہوتی ہے۔

سہیل انجم کی اس کتاب میں خاص طور پر اردو قارئین کو بہت کچھ ایسا ملے گا جس سے ان کی معلومات میں خاصا اضافہ ہوسکتا ہے۔ خبروں کی ترسیل کا پیچیدہ نظام، ایس ایم ایس اور ایسی بہت سی چیزوں پر سے یہ کتاب پردہ اٹھاتی ہے جو اردو والوں کے لیے خبروں کے حوالے سے نئی چیز ہوگی۔ سہیل انجم بنیادی طور پر اردو کے صحافی ہیں اور روایت کے مطابق انھیں اپنی کتاب کے بیشتر حصوں میں اردو کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں، ناانصافیوں اور حق تلفیوں کا رونا رونا چاہیے تھا لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا اور کرنا بھی نہیں چاہیے، اس لیے کہ اردو صحافت کو اس کا حق بھیک کی طرح نہیں ملے گا جب اردو والے اپنا حق حاصل کرنے کی پوزیشن میں آجائیں گے اور اپنے آپ کو ہر اعتبار سے اس لائق بنالیں گے کہ انھیں نظر انداز نہ کیا جائے تو یہ حق انھیں خود بخود مل جائے گا۔ اس تلخ حقیقت کو بہر حال نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اردو صحافت اپنی تکنیکی پیش رفت، اپنے معیار اور اپنے وسائل کے اعتبار سے دوسروں سے بہت پیچھے ہے۔ اسے اپنے آپ کو ان کی سطح پر لانا ہوگا۔ اس کے بعد ہی وہ کچھ حاصل کرنے کی پوزیشن میں ہوسکے گی۔ سہیل انجم نے اردو صحافت کے بجائے مجموعی طور پر پورے میڈیا کو موضوع بحث بنایا ہے اور سچی بات تو یہ ہے کہ اس کا حق بھی ادا کر دیا ہے۔

اردو صحافت: کچھ تلخ تجربات

موہن چراغی

ایڈیٹر روزنامہ قومی آواز، نئی دہلی

قومی آواز میں میرے ساتھی سہیل انجم نے اردو صحافت، نیشنل پریس، الیکٹرانک میڈیا اور مجموعی طور پر میڈیا سے متعلق دوسرے اہم موضوعات پر اپنے جن خیالات اور تاثرات کا اظہار کیا ہے، اور جو تجزیہ کیا ہے اس سے متفق ہونا ضروری نہیں۔ لیکن اس بات کو نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا کہ سہیل انجم نے فرسودہ روایات سے ہٹ کر ان موضوعات پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے جن پر صحافت کے بڑے چودھری خاموشی سے بھی اپنی رائے ظاہر کرنے سے خوف کھاتے ہیں۔

صحافت اب پیشہ ہے اور اسے مشن سمجھنا صحافت کے پیشہ سے ناانصافی ہے۔ صحافی اس سماج کا حصہ ہے جس سماج پر ہوس زر، نامعلوم منزل تک پہنچنے کے لیے کئی کئی سیڑھیاں پھلانگ کر آگے نکلنے کی قیامت خیز دوڑ اور سیاسی مٹھ دھاریوں کے سیاسی اکھاڑے تک رسائی حاصل کرنے کے لیے ہر مٹھ کے چوکھٹ پر ناک رگڑنے کی تیز خواہش کا بدگوشت چڑھ گیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ صحافی کسی بھی زبان میں لکھتا ہو، وہ نہ تو بدگوشت زدہ سماج سے باہر کوئی آسمانی مخلوق ہے اور نہ ہی وہ شدھ دودھ میں دھلا دیوتا ہے۔ صحافی ایک عام انسان ہے جو حیوانی خواہشات، کم وقت میں ڈھیر ساری دولت حاصل کرنے کی زبردست خواہش اور بیباک اور نڈر صحافت میں یقین رکھنے کی نمائش کی نیک یا بدخصلتوں سے پاک نہیں ہے۔ اس لیے صحافت کا،

چاہے وہ کسی بھی زبان کی ہو پوسٹ مارٹم کرتے وقت اس بات کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جانا چاہئے کہ جب ہم صحافت پر قلم اٹھائیں تو ہم کو پورے سماج کا پوسٹ مارٹم کرنا چاہئے۔ میں جب انگریزی زبان کی صحافت سے بھٹک کر اردو صحافت میں ۲۵ برس پہلے آیا تھا تو میرے ذہن میں اردو صحافت کے بارے میں ایک خاص خاکہ تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو زبان سے میں ٹوٹ کر پیار کرتا تھا۔ حالانکہ میرے پاس اردو زبان کی کوئی ڈگری نہیں ہے نہ میں شاعر ہوں اور نہ ہی ادیب، البتہ مجھے احساس ہے کہ میں اپنے اندر کے جذبات کو اردو زبان کے ذریعہ باہر لاسکتا ہوں۔ میں جب اردو صحافت کی جنت سے باہر تھا تو ہر وقت مجھے یہ خواہش ستاتی رہتی تھی کہ اس جنت میں کیسے داخلہ ملے گا اور جب اس جنت میں داخل ہونے کا موقع ملا تو مجھے مرحوم لیش پال کپور جیسے نڈر اور باصلاحیت سرپرست اور عشرت علی صدیقی جیسے عظیم اردو صحافی کی سرپرستی حاصل ہوئی۔ یہ وہ یگ تھا جب قومی آواز کا طوطی بولتا تھا اور اس میں کام کرنے والے سبھی ساتھی میری طرح بے چہرہ اور بے نام تھے۔ لیکن قومی آواز ہماری پہچان بن گیا۔ اور ہم بے نام ہو کر بھی نیک نام بن گئے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ جب تاجر پیشہ اور کاروباری ذہنیت کے لوگوں نے اردو صحافت کی طرف رُخ کیا اور سیاستدانوں نے اردو صحافت کو اپنے ووٹ بینک کا بیئرر چیک بنا دیا تو اردو صحافت جو کہ پہلے ہی Developed صحافت نہیں تھی عرش سے فرش پر آ گئی اور مجھ جیسا اردو صحافی بھی محسوس کرنے لگا کہ اس جنت میں داخل ہونے کی خواہش خودکشی تھی۔ ۲۵ برسوں کے تجربے کا نچوڑ یہ ہے کہ اردو صحافت ابھی تک اپنے وجود کو منوا نہیں سکی ہے اور نہ ہی تنگ و تاریک حلقوں سے آزاد ہو کر مثبت رول ہی ادا کر پا رہی ہے۔ ہم جب ۱۹۴۷ء سے قبل کے اردو اخبارات کے حوالے سے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو صحافت نے انقلابی رول ادا کیا ہے تو ہم بھول جاتے ہیں کہ اردو صحافت کے ساتھ بلند پائے کے باصلاحیت نثر نگار ضرور وابستہ رہے ہیں لیکن وہ سب کے سب صحافی نہیں تھے۔ اگر وہ صحافی ہوتے تو انھوں نے اردو صحافت کو ایک نئی سمت دی ہوتی۔ خبر نگاری کیا ہے، تجزیہ نگاری کیا ہے، سماج کے ہر طبقہ کے احساسات اور خواہشات کی عکاسی غیر جانبداری بلا تعصب اور رو کے ساتھ بہے بغیر کیسے کی جا سکتی

ہے اس طرف بلند پائے کے صحافی نمانثر نگاروں نے توجہ نہیں دی۔

اردو صحافت کا المیہ یہ ہے کہ خود اردو والوں اور سیکولر سیاست کا اٹھتے بیٹھتے اور سوتے جاگتے بے سُرا ہارمونیم بجانے والوں نے اردو زبان کو قومی دھارے سے دور رکھا۔ اردو زبان کو مسلمان بنایا گیا اور اس طرح اردو صحافت سماج کے ایک حلقہ کی ترجمان بن گئی۔ اگر اس بے معنی اور بے مقصد دلیل کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اردو اقلیت کی زبان ہے تو اردو صحافت بڑی اقلیت یعنی مسلمانوں کے حقیقی مسائل اور مشکلات کا احاطہ کرنے اور ان کی رہبری کرنے میں مکمل طور سے ناکام رہی ہے۔ اردو صحافت نے ہمیشہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے اور احساس کمتری میں مبتلا رکھنے میں ایک اہم رول ادا کیا ہے۔ اردو صحافت نے مسلمانوں کی خود اعتمادی کو توڑ کر انھیں اپنے وجود سے مایوس کیا ہے۔

اردو صحافت کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ اردو کو ووٹ بینک سیاست نے ترقی کے زینے طے کرنے کا ایک اہم میڈیم بنا دیا ہے۔ ایک سرمایہ دار نے جب اردو صحافت کی طرف رخ کیا تھا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی کہ یہ سرمایہ دار اردو اخبار کو ایک بامقصد میڈیم بنانے کے لیے سرمایہ کاری کرے گا لیکن اس نے بھی اس کو ووٹ بینک سیاست کا میڈیم بنا کر اپنے اردو اخبار کو اسی راہ پر لگا دیا جس راہ پر چل کر اردو صحافت اپنا وجود منوانے میں کامیاب نہیں رہی ہے۔ سہیل انجم نے اس طرف اشارے تو کیے ہیں لیکن کھل کر اپنے اندر کی بات باہر لانے سے گھبرا گئے ہیں۔ قصور ان کا بھی نہیں ہے کیونکہ اردو صحافت میں ایک ایسا مفاد خصوصی رکھنے والا گروپ حاوی ہے جو اپنے نجی مفادات کے لیے اردو میڈیا کو ووٹ بینک سیاست سے جوڑے رکھنے پر بضد ہے۔ ۲۵ برس تک میں نے اردو صحافت کو ایک زندہ میڈیم بنانے کی طرف ایڑی چوٹی کا زور لگایا لیکن ناکام رہا۔ قدم قدم پر اسپیڈ بریکر، قدم قدم پر فرسودہ روایات، بوڑھی سوچ اور زر پرستی حائل ہوتی رہی۔ جب میں قومی آواز میں شامل ہوا تھا تو میں پُر امید تھا کہ قومی آواز نئے انداز کا ایک عوامی میڈیم بنے گا۔ لیکن ۲۵ برسوں کے بعد اب میں اردو صحافت کے مستقبل سے اس حد تک مایوس

ہوں کہ اپنے آپ کو کوستا رہتا ہوں کہ میں نے انگریزی صحافت سے اردو صحافت کی طرف کیوں رخ کیا۔

مایوسی کے اس دور میں بھی مجھے سہیل انجم جیسے اردو صحافیوں سے نئی تحریک مل رہی ہے۔ اگر سہیل انجم اور ان جیسے دوسرے نوجوان اردو صحافی اپنے آپ کو بدگوشت چڑھے سماج سے علاحدہ نہ کر کے خود کو اسی سماج کا ایک انگ سمجھ کر بدگوشت کی جراحی کی طرف توجہ دیتے رہیں گے تو اردو صحافت مثبت تبدیلی کا میڈیم بن سکتی ہے۔

جہاں تک الیکٹرانک میڈیا کا تعلق ہے، اس سے مایوسی دن بہ دن بڑھتی جا رہی ہے۔ جن مدعوں کا ہماری زندگی سے کوئی تعلق نہیں ان پر ایسی بحث کی جاتی ہے کہ اہم ایشوز نظر انداز ہوتے رہتے ہیں اور صرف منفی پہلو اجاگر ہوتے ہیں۔ چند ایک چینلوں کو چھوڑ کر باقی تمام چینل اقلیتوں کے مسائل کا اس انداز سے محاسبہ کرتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقلیتیں ہندوستانی سماج کا حصہ نہیں ہیں بلکہ وہ ایسی مخلوق ہیں جو ذہنی طور پر پسماندہ ہیں اور اپنی سوچ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ سہیل انجم نے اپنی کتاب میں ان تمام موضوعات پر تبصرہ کیا ہے، لیکن میرا ماننا ہے کہ انھیں بنیادی طور پر صرف اردو صحافت کی طرف ہی خصوصی توجہ دینی چاہئے تھی، کیونکہ الیکٹرانک میڈیا بھی اردو سے جڑا ہے۔ یہ خیالات قلمبند کرتے وقت میں نے بے ایمانی کی ہے کہ میں نے کھل کر اردو صحافت پر بحث نہیں کی۔ گو مجھ میں جرأت ہے صحیح بات کہنے کی لیکن اس وقت میرا بھی قلم پابند ہے۔ اس قید سے آزاد ہونے کے بعد ہی میں کھل کر اپنے تجربات اور اپنی کامیابیوں و ناکامیوں کو کتابی شکل دوں گا۔

(۲)

میڈیا اپنے آئینے میں

میڈیا اور ہمارا معاشرہ

میڈیا یعنی اخبارات، ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر، ہوم ویڈیو، سٹیلائٹ اور انٹرنیٹ وغیرہ کی آج پوری دنیا میں زبردست اہمیت ہے۔ آج کی دنیا بیل کے سینگ پر نہیں ابلاغ کے انہی ذرائع پر ٹکی ہوئی ہے اور یہ ذرائع ہماری سماجی، معاشی، تجارتی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر بری طرح اثر انداز ہو رہے ہیں۔ انسانی زندگی کا کوئی بھی ایسا شعبہ اور گوشہ نہیں ہے جو ان ذرائع کی دسترس سے دور ہو۔ کسی ہندی شاعر نے کہا تھا کہ جہاں نہ پہنچے روی وہاں پہ پہنچے کوی۔ یعنی جہاں سورج کی روشنی کا گزر نہیں ہوسکتا وہاں شاعر پہنچ جاتا ہے۔ لیکن اب یہ دعویٰ بہت پیچھے چھوٹ گیا ہے۔ اب تو یہ کہا جانا چاہئے کہ جہاں سورج کی روشنی نہیں پہنچ سکتی یا جہاں تک شاعر کا خیال نہیں جا سکتا وہاں بھی میڈیا اور ذرائع ابلاغ وترسیل کے نمائندے پہنچ جاتے ہیں۔ ہم جس گزرگاہ سے گزرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتے وہاں کیمرے نصب ہو رہے ہیں اور ہم اپنے گھر آنگن میں بیٹھ کر وہاں کے مناظر سے آنکھیں چار کر رہے ہیں۔ پھر چاہے وہ عراق کا گڈھا ہو جہاں سے امریکی افواج نے صدام حسین کو گرفتار کر کے باہر نکالا یا پھر افغانستان میں تورابورا کی وہ سنگلاخ پہاڑیاں ہوں جو القاعدہ اور طالبان کی کمین گاہیں تھیں۔ کوئی بھی جگہ ان کی دسترس سے دور نہیں ہے۔

ان ذرائع کی برکتوں سے وسیع وعریض دنیا سمٹ کر ہمارے ڈرائنگ روم اور بیڈ روم میں آ گئی ہے اور گھر کی کھڑکیاں کھول کر پورے عالم کا نظارہ کرنا اب بہت چھوٹی سی بات ہو کر رہ گئی ہے۔ اب ہم ایک کمرے میں ایک میز پر بیٹھ کر اور محض ایک بٹن دبا کر آنِ واحد میں دنیا بھر کی سیر کر سکتے ہیں۔ ٹکنالوجی اور ذرائع ابلاغ وترسیل کی اس ترقی کو دیکھ کر ہی دورِ جدید کے الیکٹرانک مسیحا مارشل میکلوہان نے آج کی دنیا کو گلوبل ویلیج یا عالمی گاؤں کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس

ٹیکنالوجی نے شاہراہِ ترقی پر اتنی طویل اور اتنی اونچی جست لگائی ہے کہ انسانی جذبات و احساسات اور خیالات کو بھی اس نے بالواسطہ متاثر کرنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن یہاں ایک لمحے کے لیے ٹھہر کر ہم ایک بات اور دیکھتے چلیں کہ آج جہاں ذرائع ابلاغ ہماری زندگی کے تمام تر شعبوں اور پہلوؤں پر اثر انداز ہو رہے ہیں وہیں کوئی ایسا بھی ہے جو ذرائع ابلاغ پر اثر انداز ہو رہا ہے۔ جی ہاں اور وہ ہے آج کا بازار۔ بازار نے ان ذرائع کو اپنی مٹھی میں جکڑ لیا ہے اور یہ گرفت جتنی سخت ہوتی جا رہی ہے، یہ ذرائع اتنی ہی بلند آواز میں بازار کا پروپیگنڈہ کر رہے ہیں اور ہم یعنی انسان بھی اس منڈی کے تابع مہمل بن کر رہ گئے ہیں۔ وہ چاہے خبریں ہوں، تجزیے ہوں، ڈرامے ہوں، سیریل ہوں، کہانیاں ہوں، یا فلمیں ہوں سب پر بازار حاوی ہو گیا ہے۔

ذرائع ابلاغ اور بازار دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم بن گئے ہیں اور ایک دوسرے کو استعمال کر رہے ہیں۔ گویا یہ دونوں ایک دوسرے کے تکملہ ہیں۔ اب صورت حال یہ بن گئی ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی محال ہے۔ بازار ذرائع ابلاغ کو زندہ اور صحت مند رکھنے کے لیے ہر لمحہ تازہ خون فراہم کرتا ہے، اور ذرائع ابلاغ بازار کی ضرورت کی تکمیل کرتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ منڈی کی تشکیل بھی کرتے ہیں اور منڈی ذرائع ابلاغ کو سامان زندگی فراہم کرتی ہے۔

اسی طرح صحافت بھی خواہ وہ طباعتی ہو یا نشریاتی، بازار کی شئے بن کر رہ گئی ہے۔ انٹرٹینمنٹ اور نیوز چینل ایک ایک دُکان لے کر بیٹھ گئے ہیں جہاں سے وہ اپنے اپنے مال کا پرچار اور پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔ عام لوگوں کا سب سے زیادہ واسطہ جن چیزوں سے پڑتا ہے وہ ہیں انٹرٹینمنٹ چینل، نیوز چینل، ریڈیو اور اخبارات۔ یعنی الیکٹرانک میڈیا اور پرنٹ میڈیا دونوں۔

اگر ہم نیوز چینلوں کے پروگراموں اور اخبارات کے مواد کا تجزیہ کریں تو پائیں گے کہ دونوں جگہوں پر کچھ مثبت چیزیں ہیں اور کچھ منفی چیزیں ہیں۔ اگر صحافت کے پیشے سے وابستہ افراد ہماری سماجی اور سیاسی زندگی کے رگ و پے میں رچ بس گئے کرپشن کو اجاگر کرنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں تو بسا اوقات وہ کچھ ایسا بھی کر جاتے ہیں جو انسانی زندگی اور معاشرے پر منفی

اثرات مرتب کرتے ہیں۔ جب سے الیکٹرانک میڈیا کا دور آیا ہے اور نیوز چینل شروع ہوئے ہیں صحافی برادری زبردست بھاگ دوڑ میں مبتلا ہوگئی ہے۔ ان میں اس قدر مقابلہ اور ہوڑ ہے کہ وہ کسی بھی صورت میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے ہی میں بقا کا راز سمجھتے ہیں۔ پھر تو چاہے جائز راستہ اختیار کرنا پڑے یا ناجائز سب روا ہے۔ جب سے انوسٹی گیٹیو اسٹوریز کا دور شروع ہوا ہے یہ بھاگ دوڑ اور تیز ہوگئی ہے اور ایکسکلیوسیو خبروں کی تلاش میں جائز ناجائز سارے راستے اختیار کیے جارہے ہیں۔ اب تو اپنی زبان سے اپنی ہی تعریفوں کے پُل بھی باندھے جانے لگے ہیں۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے کا یہ عالم ہے کہ بعض چینل تحقیقاتی رپورٹوں کے نشریے کے دوران ''صرف اسی چینل پر یا ایکسکلیوسیو'' کی کلپ لگانا نہیں بھولتے۔ اس مقابلہ آرائی نے سنسنی خیزی کو بری طرح بڑھاوا دیا ہے جس کے نتیجے میں معیار پست ہوکر رہ گیا ہے۔ سنسنی پیدا کرنے کے لیے غیر اخلاقی طریقہ کار اپنانے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔ یہاں تک کہ اگر کسی عصمت دری کی رپورٹ پیش کرنی ہو اور اس واقعہ کی کوئی تصویر ان کے پاس نہ ہو تو وہ لوگ فرضی کردار پکڑ کر عصمت دری کی ایکٹنگ کرواتے ہیں اور ان کی تصویر کشی کرکے رپورٹ کے ساتھ دکھاتے ہیں۔ یہ Re-enactment رپورٹوں کو سنسنی خیز بنا کر پیش کرنے کے لیے کیا جاتا ہے تاکہ ناظرین اپنا زیادہ تر وقت اسی چینل کو دیں۔ Re-enactment کے اس عمل میں اصل واقعہ اور اس کے اہم پہلوؤں کو دکھانے کے بجائے اس کے جنسی پہلو کو زیادہ ابھارا جاتا ہے۔ یہ طریقہ کار غیر اخلاقی ہے اور صحافتی معیار کے خلاف بھی ہے۔ یہ صورت حال کسی بھی واقعہ کو نمک مرچ لگا کر اور چٹخارے دار بنا کر پیش کرنے سے کہیں آگے کی چیز ہے اور اسے ایلو جرنلزم یا زرد صحافت سے الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔

پریس کونسل آف انڈیا نے صحافیوں کے لیے خبروں اور رپورٹوں کی اشاعت کے سلسلے میں Guide Lines وضع کی ہیں۔ لیکن بعض اوقات ان کی بری طرح پامالی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر پریس کونسل کا کہنا ہے کہ ایسی خبروں یا رپورٹوں کی نشر و اشاعت سے قبل ان کی تصدیق کرلینی چاہئے جن سے متعلقہ شخص یا شخصیت پر برا اثر پڑنے کا اندیشہ ہو اور اگر اشاعت کے بعد

متعلقہ شخص جس پر برا اثر پڑا ہے، اپنا جوابی ردعمل پیش کرے تو اسے بھی شائع کیا جانا چاہئے۔ لیکن اکثر اوقات اس ضابطے پر عمل نہیں کیا جاتا جس کے سبب جھوٹی خبریں نشر ہو جاتی ہیں یا اخبارات میں شائع ہو جاتی ہیں۔ یا کسی واقعہ کا صرف ایک ہی پہلو سامنے آپاتا ہے۔ دوسرا قارئین اور ناظرین کی نظروں سے اوجھل رہ جاتا ہے۔

اسی طرح عصمت دری، اغوا اور جنسی استحصال کے تعلق سے بھی پریس کونسل کی ہدایات ہیں۔ پریس کونسل کے مطابق ''عصمت دری، خاتون کے اغوا یا کسی بچے کے جنسی استحصال سے متعلق رپورٹوں کی اشاعت کے وقت ان چیزوں سے گریز کیا جانا چاہئے جن سے خاتون کی راز داری متاثر ہوتی ہو یا کسی کے کردار پر سوالیہ نشان لگتا ہو۔ ان جرائم کی شکار خواتین اور بچوں کی تصاویر کی اشاعت سے بھی بچنا چاہئے اور ایسی تفصیلات سے گریز کرنا چاہئے جن سے متعلقہ خاتون یا بچے کی سماجی حیثیت متاثر ہو جائے''۔

میں یہاں گجرات کی بلقیس یعقوب رسول کی مثال پیش کرنا چاہتا ہوں جس کے ساتھ پانچ ماہ کے حمل کے دوران زیادتی کی گئی اور اجتماعی طور پر اس کی عزت لوٹی گئی۔ اس کے سامنے اس کے خاندان کے ۱۴ لوگوں کا قتل بھی کر دیا گیا۔ آج بلقیس یعقوب رسول کی تصویر اخباروں میں چھپ رہی ہے اور ٹی وی رپورٹوں میں دکھائی جا رہی ہے۔ پریس کونسل کا کہنا ہے کہ ایسی تصویروں کی اشاعت نہ کی جائے جن سے کسی شخص کے سماجی مقاطعہ کا اندیشہ ہو یا سماج ان چیزوں کی اشاعت کے بعد اسے غلط نظر سے دیکھنے لگے۔ لیکن بلقیس کے معاملے میں اس کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ تاہم میں یہ بات بھی کہوں گا کہ صحافیوں کی اس غیر ارادی بد دیانتی میں ایک خیر کا پہلو بھی پوشیدہ ہے۔ اگر بلقیس یعقوب رسول کا معاملہ سامنے نہیں آیا ہوتا تو اس کو انصاف ملنے کی امید بھی پیدا نہیں ہوتی۔ اگر اس کو بعض اخبارات بالخصوص روزنامہ انڈین ایکسپریس نے اچھالا نہ ہوتا تو بلقیس کا معاملہ دبا کا دبا رہ جاتا۔ معلوم ہونا چاہئے کہ بلقیس کا معاملہ وہ واحد معاملہ ہے جس کی جانچ سی بی آئی کر رہی ہے۔ ایسے جانے کتنے معاملات ہیں جو آج بھی دبے پڑے ہیں اور جن کو ابھارنے اور تلاش کر کے منظر عام پر لانے کی ضرورت ہے۔ اگر مظلوموں کو انصاف دلانے کی

کوشش میں ان کی کچھ ایسی تشہیر بھی ہو جائے جو تھوڑی دیر کے لیے بدنامی کا باعث بن جائے تو میرے نزدیک یہ جائز ہے۔

مقابلہ آرائی کے اس دور میں دانستہ یا نادانستہ طور پر صحافیوں سے یہ غیر صحافتی جرم بھی سرزد ہو رہا ہے کہ ماورائے عدالت فیصلے سنائے جا رہے ہیں۔ میڈیا جس شریف آدمی کو چاہے ویلن بنا کر پیش کر دے اور جس کی چاہے دستار اتار دے کوئی پوچھنے اور سوال کرنے والا نہیں ہے۔ اگر کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے اور اس سلسلے میں شک و شبہ کی بنیاد پر ہی کسی کی گرفتاری عمل میں آتی ہے تو گرفتار شخص میڈیا کی کرم فرمائیوں کے نتیجے میں عدالتی فیصلے سے قبل ہی مجرم قرار دیدیا جاتا ہے۔ ایسا فیصلہ سنانے میں میڈیا کے وہ نامہ نگار نسبتاً زیادہ تیزی دکھاتے ہیں جو نو وارد ہوتے ہیں جن کے پاس تجربات و مشاہدات کی کمی ہوتی ہے اور جو اپنی رپورٹوں میں اپنی ناپختگی کا قدم قدم پر ثبوت دیتے ہیں۔ اسے Trail By Media کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سوچ پاتے کہ گرفتار شخص کے چہرے کو رومال یا کسی کپڑے سے تذلیل آمیز انداز میں چھپا کر لے جاتے ہوئے دکھانے سے اس کے اہل خانہ، اعزاء، دوستوں اور رشتے داروں کے دلوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے گرفتار شخص سماج کا بدبخت اور ذلیل ترین انسان ہے اور اسے تو بس تختۂ دار پر چڑھا دینا چاہئے۔ یوں تو ایسے واقعات روز بروز پیش آتے ہیں لیکن میں جنوبی افریقہ کے جج سراج الدین ڈیسائی کا معاملہ مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہوں جو کہ ہند نژاد ہیں اور گزشتہ دنوں جنوبی افریقہ سے وہاں کی ایک سماجی کارکن کے ساتھ ممبئی میں ہونے والی ایک کانفرنس میں شرکت کی غرض سے آئے تھے۔ سراج الدین ڈیسائی جنسی جرائم کے خلاف انتہائی سخت جج کی حیثیت سے مشہور ہیں اور انھوں نے متعدد جنسی مجرموں کو سخت ترین سزائیں دی ہیں۔ لیکن جب ان کے ساتھ آنے والی خاتون نے ان پر عصمت دری کا الزام لگایا اور سراج الدین ڈیسائی گرفتار کر لیے گئے تو ان کو اس انداز میں پیش کیا گیا کہ جیسے ان سے بڑا جنس زدہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ حالانکہ متعلقہ خاتون کا کیس اتنا کمزور تھا اور جج کے خلاف بُنی گئی الزامات کی چادر میں اتنے سوراخ تھے کہ ان سے خود موصوفہ کا کردار داغدار نظر آنے لگا تھا اور بالآخر جج صاحب کو رہا کر دیا گیا۔ لیکن اس

پورے معاملے کو اس انداز سے پیش کیا گیا کہ جنسی جرائم کے خلاف زندگی بھر جنگ لڑنے والا جج آن واحد میں جنسی ویلن بن کر رہ گیا۔ شاید اسی لیے انھوں نے رہائی کے بعد اپنے پہلے ردعمل میں کہا تھا کہ میں سب سے پہلے اپنے گھر جا کر اپنے بچوں سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ اس گھناؤنے کھیل سے ان کے اہل خانہ کے دلوں پر کیا گزری ہوگی۔ یہ سلسلہ بند ہونا چاہئے اور پریس کونسل آف انڈیا کو اس بارے میں مزید ہدایات جاری کرنی چاہئیں۔

لیکن میں یہاں میڈیا کے ان لوگوں کو خراج تحسین بھی پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے پریس کونسل آف انڈیا کی واضح ہدایات کی خلاف ورزی کی، لیکن دوسری طرف انسانیت کی خدمت بھی کی۔ میرا اشارہ پھر گجرات فسادات کی طرف ہے۔ جہاں میڈیا کے جری اور انصاف پسند نمائندوں نے اپنی جان پر کھیل کر دنگائیوں، بلوائیوں اور فسادیوں کی شیطانیت کی کوریج کی۔ اگر الیکٹرانک میڈیا میں اس وقت کے اسٹار نیوز اور پرنٹ میڈیا میں انگریزی روزنامہ انڈین ایکسپریس نے ظالموں اور مظلوموں فسادیوں اور بے قصوروں اور قاتلوں اور مقتولوں کے نام ظاہر نہ کیے ہوتے تو شاید گجرات فسادات کی کوریج یکطرفہ ہو جاتی اور دنیا یہ نہیں جان پاتی کہ وہاں مودی حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کے سروں سے کیسی کیسی قیامتیں گزار دی گئیں۔ اگر انڈین ایکسپریس نے خوفزدہ ظہیرہ شیخ کا وہ جھوٹ نہ پکڑا ہوتا، جس میں اس نے جان سے مار ڈالنے کی دھمکیوں کے پیش نظر غنڈوں، ظالموں اور عصمت کے لٹیروں کو ہی مسیحا قرار دیدیا تھا، تو مدھوسری واستو جیسے بہت سے کریہہ اور داغدار چہروں پر پارسائی کے پردے پڑے رہتے۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ میڈیا میں زبردست انقلاب آ گیا ہے اور ذرائع ابلاغ میں نئے نئے ابعاد (Dimensions) جڑ گئے ہیں۔ لہٰذا پریس کونسل کو اپنی بعض پرانی ہدایات پر از سر نو غور کرنا چاہئے اور ان کو مزید لبرل بنانا چاہئے تاکہ صحافیوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ آج ہمارا معاشرہ کس قدر کرپٹ اور بدعنوان ہو گیا ہے۔ کرپشن ہمارے رگ و پے میں اس قدر سرایت کر گیا ہے کہ اب بظاہر یہ کوئی معیوب بات نہیں رہ

گئی ہے۔ متعدد سیاستدانوں کی ابن الوقتی اور موقع پرستی یا پھر بدلتے ہوئے معاشی و معاشرتی حالات کے سبب کرپشن بری طرح پھل پھول رہا ہے اور بری طرح پھیلتی اس برائی کو اجاگر کرنے کا کام اگر صحافی حضرات کرتے ہیں تو یہ انتہائی لائق تحسین ہے۔ گویا انتظامیہ کے فرائض میڈیا والے انجام دے رہے ہیں جب انتظامیہ اور کسی حد تک عدلیہ بھی کرپشن کے کیچڑ میں شرابور ہو چکی ہو تو کسی کو پانی سے بھری بالٹی لے کر اٹھنا ہی پڑے گا۔ اس سلسلے میں تین مثالوں کو کرپشن کو بے نقاب کرنے کی راہ میں سنگ میل قرار دیا جا سکتا ہے جنھوں نے ہماری سیاسی اور سماجی زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ جانے والی ذہنیت کو ہمارے سامنے بے نقاب کر دیا۔ ایک تہلکہ ڈاٹ کام کا دفاعی سودوں میں رشوت خوری کو بے نقاب کرنا، دوسرا زی نیوز کے ایک نمائندے کے ذریعے عدلیہ میں کرپشن کو اجاگر کرنا اور تیسرے کو برا پوسٹ کا پارلیمنٹ میں سوال پوچھنے کے عوض رشوت خوری کو طشت از بام کرنا۔ یہ ذرائع ابلاغ کی ترقی کا فیض ہے کہ ہم نے ایک سیاسی پارٹی کے صدر کو رشوت لیتے ہوئے اور اسی پارٹی کے دوسرے لیڈر کو رقم حاصل کرتے وقت یہ کہتے ہوئے دیکھا اور سنا کہ خدا کی قسم پیسہ خدا تو نہیں مگر خدا سے کم بھی نہیں۔ پریس کونسل آف انڈیا کا کہنا ہے کہ کسی کا انٹرویو یا بیان لیتے وقت اس کے علم میں لائے بغیر اسے ریکارڈ نہیں کیا جا سکتا۔ اگر اس ہدایت پر عمل کیا گیا ہوتا تو کیا یہ برائیاں یا اس طرح کی دیگر برائیاں منظر عام پر آ پاتیں؟ اگر بنگارو لکشمن یا دلیپ سنگھ جودیو یا پکڑے گئے ممبران پارلیمنٹ کو یہ بتا کر رشوت دی جاتی کہ دیکھو ہم اس کی ویڈیو گرافی بھی کر رہے ہیں تو کیا یہ لوگ یوں گرفت میں آ پاتے۔ اگر زی نیوز کے نمائندہ نے یہ بتایا ہوتا کہ وہ جن لوگوں کے خلاف وارنٹ نکلوانا چاہتا ہے ان میں سے ایک اس ملک کے صدر دوسرے چیف جسٹس ہیں تو کیا گجرات کی ذیلی عدالت کا جج مبینہ طور پر چالیس ہزار روپے رشوت لے کر ان کے خلاف وارنٹ جاری کر دیتا۔ اس قسم کے کرپشن کو بے نقاب کرنے کے لیے چھپا رستم کا کیمرہ لے کر نکلنا ہی پڑتا ہے۔ یہ مثالیں یہ بتاتی ہیں کہ بظاہر صاف شفاف ماحول کے نیچے کس قدر غلاظت بھری ہوئی ہے اور کرپشن کے بجباتے کیڑے کس قدر تعفن پھیلا رہے ہیں۔ ان واقعات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جن پر ملک کے دفاع کی ذمہ داری ہے وہ کس قدر خود

غرض اور ملکی سلامتی کے تئیں غیر سنجیدہ ہیں۔ جبکہ عدلیہ میں کرپشن کا مذکورہ واقعہ یہ بتاتا ہے کہ جس عمارت پر ملک میں انصاف وقانون کی بالادستی کا بار ہے اس کی نیچے کی کڑیاں کس قدر سڑ اور گل گئی ہیں اور یہ سب کچھ میڈیا والوں کی کوششوں سے منظر عام پر آیا ہے۔

میڈیا جہاں ایک طرف ہمیں خبروں سے واقف کرانے اور ہماری سیاسی اور سماجی زندگی میں رچ بس گئے کرپشن کو بے نقاب کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے وہیں یہ بعض اوقات حکومت کے ہاتھوں کا کھلونہ بھی بن جاتا ہے اور اس کا قصور وار وہ بازار بھی ہے جو ذرائع ابلاغ پر حاوی ہو گیا ہے۔ اگر چینلوں اور اخباروں کو پیسے نہیں ملیں گے تو وہ زندہ کیسے رہیں گے۔ لہٰذا زندہ رہنے کے لیے وہ چیزیں بھی دکھانی ضروری ہوتی ہیں، میڈیا کے ذمہ دار اصولی طور پر جن کے مخالف ہوتے ہیں۔ حکومتیں ذرائع ابلاغ کی ضرورتوں اور مجبوریوں کا ناجائز فائدہ اُٹھاتی ہیں اور ان کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ میڈیا میں دیکھا گیا کہ ایک طرف وہ گزشتہ حکومت کے فیل گڈ فیکٹر کی ہوا نکالنے اور اس اشتہار بازی کے متوازی تلخ حقائق کو پیش کرنے میں پیش پیش رہا ہے تو دوسری طرف حکومت کے ان اشتہاروں کو بھی خوب خوب دکھایا گیا جن میں انڈیا شائننگ، درخشاں بھارت یا بھارت اُدے کا گمراہ کن پروپیگنڈہ کیا جاتا رہا۔ انتخابی ضابطہ اخلاق کے نفاذ تک یہ سلسلہ جنگی پیمانے پر جاری رہا۔

یہ تو ہوا وہ معاملہ جو سطح پر نظر آ رہا ہے۔ سطح کے نیچے اس سے بھی بھیانک صورت حال ہے۔ حکومتیں میڈیا کے نمائندوں کو مختلف مراعات کے عوض خریدنے کی کوشش بھی کرتی ہیں اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو جاتی ہیں۔ سرکاریں میڈیا کا استعمال کر کے رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا اور ان پر اثر انداز ہونا بھی چاہتی ہیں۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے اس استعمال کو پرنٹ اینڈ ٹیلی پالیٹکس کہا جاتا ہے۔ یہ سیاست آج کل زوروں پر ہے اور ایک خاص طبقہ اس فن میں مہارت تامہّ رکھتا ہے۔ وہ اپنے اس فن سے میڈیا والوں کی بظاہر برین واشنگ کر کے ان کو آلۂ کار بنا کر اپنا اُلوّ سیدھا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خبروں کے اس ہلکے پھلکے تجزیہ کے بعد ایک نظر اشتہارات پر بھی ڈالتے چلیں۔ چونکہ یہ

اشتہارات بھی چاہے وہ پرنٹ میڈیا کے ہوں یا الیکٹرانک میڈیا کے، ہم سے اتنے ہی روبرو ہوتے ہیں جتنی کہ خبریں اور تجزیے۔ لہٰذا یہ بھی ہماری سوچ اور فکر کو متاثر کرتے ہیں اور ہم اس کا اثر قبول کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب تو تصاویر کی اشاعت میں اتنا کھلا پن آ گیا ہے کہ شرفاء نہ تو اخبارات کے رنگین صفحات کا اپنی فیملی کے ساتھ مطالعہ کر سکتے ہیں اور نہ ہی ٹی وی کے بعض بیہودہ اور فحش اشتہارات کو دیکھ سکتے ہیں۔ پہلے مانع حمل کے ایک دو اشتہارات فحش انداز میں دکھائے جاتے تھے، مگر اب تقریباً بیشتر اشتہارات اسی رنگ میں رنگتے چلے جا رہے ہیں۔ خواہ سوٹنگ شرٹنگ کے اشتہارات ہوں یا موبائل کے کیش کارڈ یا پھر ایک خاص عمر تک پہنچنے والی لڑکیوں کی ضرورت کی چیزوں کے اشتہارات ہوں۔ یہاں تک کہ کاروں کی فروخت کے اشتہارات کو بھی بے حیائی و بے شرمی کا ملمع چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ شرافت وشائستگی کس چڑیا کا نام ہے یہ اشتہار سازوں اور اشتہار بازوں کو نہیں معلوم۔ یا وہ عمداً اور ضرورتاً اس سے گریز کرتے ہیں۔

دراصل یہ بازار ہے جو بے ہودگی، فحاشی اور بے حیائی کو فروغ دے رہا ہے۔ بازار کی اس بالادستی نے صارفیت پسندی کو بھی اس قدر ہوا دی ہے کہ اب قارئین اور ناظرین کی اپنی کوئی پسند نہیں رہ گئی ہے۔ اب شئے کے بجائے شئے کے تصور اور اس کی امیج کی خرید وفروخت ہوتی ہے۔ ان میں اصل حقیقت کے بجائے خیالی حقیقت کی نشر واشاعت ہوتی ہے اور ہم رفتہ رفتہ ایک خیالی ثقافت کے دلدل میں دھنستے چلے جاتے ہیں۔ ان اشتہارات نے ہماری پسند اور ناپسند کے معیار کو ختم کر دیا ہے۔ ہمیں کیا کھانا ہے کیا پینا ہے، کب سونا ہے، کب اٹھنا ہے، کیا پڑھنا ہے، کیا دیکھنا ہے، کیسے رہنا ہے، کیسے نہیں رہنا ہے۔ یہ سب اب ہم نہیں بازار طے کر رہا ہے اور ہم اس بازار کی کٹھ پتلی بننے پر مجبور ہیں۔ ان اشتہارات نے انسانی کردار، ہاؤ بھاؤ، بول چال، اور طور طریقوں کو بھی متاثر کر دیا ہے۔ ہم روزمرہ کی زندگی میں انہی اسٹائل کو اختیار کرنے کی دانستہ ونادانستہ کوشش کرتے ہیں جن کی بالواسطہ یا بلا واسطہ نشر واشاعت ہوتی رہتی ہے۔ انسانی زندگی کا ہر شعبہ اشتہار بازی سے متاثر ہے۔ نہ صرف عوامی ذوق کو تبدیل کیا جا رہا ہے بلکہ مصنوعی ضرورتیں بھی پیدا کی جا رہی ہیں۔ پہلے آدمی ضرورت کے تحت چیزیں خریدا کرتا تھا مگر اب بازار نے نئی نئی

اور مصنوعی ضرورتیں پیدا کر دی ہیں اور یہ نئی ضرورتیں ہماری زندگی میں اس طرح داخل ہو گئی ہیں کہ ہم چاہ کر بھی نہیں بچ سکتے۔ یہ اشتہارات ہمارے سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کی صلاحیتوں کو بھی متاثر کر رہے ہیں اور ان سے نجات پانے کا بظاہر کوئی راستہ ہمارے سامنے نہیں ہے۔ گویا نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کی کیفیت ہے۔

اسی طرح انٹرٹینمنٹ چینلوں سے بھی ہمارا واسطہ پڑتا ہے اور ہمارے فاضل وقت کا ایک بڑا حصہ فلموں، ڈراموں اور سیریلوں پر صرف ہوتا ہے۔ یہ بھی بازار کی ہی عکاسی کرتے ہیں۔ فلمیں، ڈرامے اور سیریل عوامی ذوق وشوق کی تکمیل کے تحت نہیں بنائے جاتے، بلکہ بازار کی ضرورت کے تحت بنائے جاتے ہیں اور عوام کی سوچ اور ذہنیت کو ایک خاص سمت میں موڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہندوستانی سماج میں بھی جہاں روحانیت کا بڑا غلبہ رہا ہے اور تہذیب وشائستگی یہاں کی سنسکرتی کا حصہ رہی ہے، مغربی ملکوں کی مانند عورتوں کو بازاری شئے بنا کر پیش کیا جا رہا ہے۔ اب عورتوں کے لباس دن بہ دن چھوٹے ہوتے جا رہے ہیں اور یہ لباس عورتوں کے جسم کو ڈھکنے کے بجائے اس کے نشیب وفراز اور خدوخال کو اور نمایاں کرتے ہیں ان کی اور چغلی کھاتے ہیں۔ ان فلموں، ڈراموں اور سیریلوں کے ذریعہ قدروں کو پامال کیا جا رہا ہے اور گھروں میں دیکھے جانے والے سیریلوں میں شادی سے پہلے ہی ماں بننے کے واقعات خوب دکھائے جاتے ہیں۔ اعلا سوسائٹی کی خواتین غیر مردوں کے ساتھ گھومتی ہیں اور رات رات بھر باہر رہتی ہیں۔ بیٹی رات کا بیشتر حصہ جب کلب اور بار میں گزار کر گھر آتی ہے اور باپ باز پرس کرتا ہے تو باپ کو ہی اپنی بیٹی کا لیکچر سننا پڑتا ہے۔ ماں باپ جوان بیٹیوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب نوشی کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے رقص کرتے ہیں۔ اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان تمام چیزوں کو آزادیٔ نسواں کے ہتھیار کے روپ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ چھوٹے اور معصوم بچے یہی سمجھتے ہیں کہ مہذب اور تعلیم یافتہ سوسائٹی میں ایسے ہی رہا جاتا ہے اور ان کا کچا ذہن ان خرافات کا بڑی تیزی سے اثر قبول کرتا ہے۔

جہاں ایک طرف ٹی وی کلچر بالخصوص نجی ٹی وی چینل اباحیت کو فروغ دینے میں موثر رول ادا

کررہے ہیں وہیں یہ کہنا پڑے گا کہ سرکاری ذرائع ابلاغ ان برائیوں سے بہت حد تک محفوظ ہیں۔ دور درشن کے پروگراموں میں قدرے شائستگی ہوتی ہے اور بے شرمی و بے حیائی کو بڑھاوا دینے میں اس کا ہاتھ کم نظر آتا ہے۔ جہاں تک ریڈیو کی بات ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ اب بھی اپنے معیار کو کسی حد تک برقرار رکھے ہوئے ہے۔ نجی ریڈیو کی آمد نے گرچہ ریڈیائی نشریات میں کسی حد تک کھلا پن لانے کی کوشش کی ہے، تاہم آل انڈیا ریڈیو نے شرافت وشائستگی کا دامن ابھی نہیں چھوڑا ہے۔

اس طرح جب ہم ذرائع ابلاغ اور ہمارا معاشرہ کی بات کرتے ہیں تو یہ ہندو معاشرہ مسلم معاشرہ یا پھر ہندوستانی معاشرہ نہیں ہوتا، بلکہ یہ عالمی معاشرہ ہوتا ہے، گلوبل سوسائٹی ہوتی ہے۔ ذرائع ابلاغ کا دامن وسیع ہوگیا ہے اس میں تنگنائے غزل کا شکوہ نہیں بلکہ اظہار و بیان کی لامتناہی وسعت ہے۔ ان ذرائع میں انفارمیشن اور اطلاعات کے حصول کی اتنی چاہت اور تڑپ ہے کہ واشنگٹن، نیویارک، لندن اور دُبئی سے کام کرنے والے نیوز چینل ہوں یا دہلی اور ممبئی سے سرگرم میڈیا مراکز، ہر چھوٹی سی چھوٹی اطلاع بھی حاصل کرنے اور ہم تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ عالیشان عمارتوں اور دنیا جہان کی سہولتوں سے مزین ان مراکز کے نمائندے دور دراز کے قبائلی علاقوں تک بھی رسائی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چاند پر کمند ڈالنے کے عزائم بھی رکھتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو گنیش کی مورتی کے مبینہ طور پر دودھ پینے کی خبریں نہ تو پوری دنیا سے نشر اور شائع ہوتیں اور نہ ہی مریخ پر پہنچنے والی گاڑی کی پل پل کی خبریں ہمیں دی جاتیں۔ انٹرنیٹ کی بات کریں تو یہ ایک ایسی عالمی شاہراہ ہے جو پوری دنیا سے گزرتی ہے اور ہمارے گھر کے چھوٹے سے کمرے میں بھی پہنچتی ہے۔ چونکہ ہر چیز کا ایک مثبت پہلو ہوتا ہے اور ایک منفی۔ لہٰذا ذرائع ابلاغ میں بھی دونوں پہلو پوشیدہ ہیں۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ ہم کس سے متاثر ہوتے ہیں اور کس کو کس حد تک برداشت کرتے ہیں۔

نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل

مسلم مسائل کے تعلق سے نیشنل میڈیا کے رول کو سمجھنے کے لیے اس کو دو خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک عام حالات میں میڈیا کا رول اور دوسرا مخصوص حالات میں میڈیا کا رول۔ عام حالات میں عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ نیشنل میڈیا مسلم مسائل کو نظر انداز کرنے کی افسوسناک روش پر گامزن رہتا ہے۔ وہ مسلم مسائل کو سرے سے اٹھاتا ہی نہیں اور اگر بوجوہ اٹھاتا بھی ہے تو عامیانہ، سطحی اور منفی انداز میں۔ یہ پہلو افسوسناک بھی ہے اور تکلیف دہ بھی کہ وہ ایسے معاملات میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کرتا ہے۔ وہ یہ مان کر چلتا ہے کہ مسلمانوں کی سرگرمیاں، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی ملک اور قوم دشمن ہوتی ہیں اور مسلمان، ان کے تعلیمی ادارے اور عبادت گاہیں قومی سلامتی کے لیے شدید خطرہ ہیں۔ اس ملک میں جب بھی کوئی واقعہ ہوتا ہے اور اس میں مسلمان ملوث ہوتے ہیں، خواہ وہ نام کے ہی مسلمان کیوں نہ ہوں، تو اس کے ڈانڈے قوم دشمن سرگرمیوں سے ملانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ کسی بھی واقعہ کو اسی حوالے سے نمایاں کیا جاتا ہے اور اسی کے تناظر میں اس کو پرکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہی عینک لگا کر مسلمانوں کا چہرہ پڑھا جاتا ہے اور ان کے بارے میں رائے قائم کی جاتی ہے۔ اسی عینک سے مسلمان یا تو آئی ایس آئی، لشکر طیبہ، جیش محمد اور حزب المجاہدین کے ایجنٹ اور دہشت گرد نظر آتے ہیں یا پھر اسمگلر، مجرم اور قانون شکن دکھائی دیتے ہیں۔ خاص مواقع پر نیشنل میڈیا کی عصبیت اور کھل کر سامنے آجاتی ہے اور اس کے مسلم دشمن چہرے کے خدوخال اور نین نقش زیادہ واضح ہوجاتے ہیں۔ ۶ر دسمبر ۱۹۹۲ء اور ۱۱ستمبر اور ۱۳دسمبر ۲۰۰۱ء کے تناظر میں میڈیا کے اس روپ کا آسانی سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی نفسیات کا بہتر انداز میں جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

گیارہ ستمبر کے اثرات :

گیارہ ستمبر کے واقعہ نے عالمی میڈیا کے اندازِ فکر میں نمایاں مگر خطرناک حد تک تبدیلی پیدا کردی اور ہندوستانی میڈیا بھی اس سے اچھوتا نہیں رہا۔ گیارہ ستمبر کے بعد عالمی میڈیا کی مانند ہندوستانی میڈیا پر بھی ایک جنونی کیفیت طاری ہوگئی۔ افغانستان میں طالبان کے خلاف امریکی جنگ نے اس کیفیت کو خوراک فراہم کردی۔ اسلامی دہشت گردی اور جہاد کا ایسا ڈنکا پیٹا جانے لگا جیسے پوری دنیا اس کے نشانے پر ہے۔ عالمی میڈیا نے اسلامی دہشت گردی کی اصطلاح گھڑ کر مسلمانوں کو نشانہ بنانے کی کوشش کی تو ہندوستانی میڈیا اس میدان میں اس سے بھی دو قدم آگے نکل گیا۔ اس میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کی کوئی قید نہیں ہے دونوں پوری طاقت کے ساتھ اسلامی دہشت گردی کا ڈھول پیٹنے لگے۔ میڈیا نے بغیر کسی ثبوت کے یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ اسلامی فنڈا منٹلسٹ اور اسلامی دہشت گرد چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں جن سے نہ صرف امریکہ کو بلکہ مستقبل میں ہندوستان کو بھی خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ طالبان کی آڑ میں اسلامی تعلیمات کو مسخ کر کے اسے ظلمت پسندی اور قرون وسطیٰ کی بربریت اور دہشت گردوں کے حملوں کو جہاد کے نام سے یاد کیا جانے لگا۔

ہندوستانی پرنٹ میڈیا نے دنیائے اسلام پر کس طرح یلغار شروع کی اس کا اندازہ لگانے کے لیے کثیر الاشاعت انگریزی اخبار ہندوستان ٹائمز کی رپورٹنگ کا نمونہ ملاحظہ ہو۔ گیارہ ستمبر کے بعد اپنی ایک اشاعت میں اس اخبار نے لکھا:

> ''مذہبی ہٹ دھرمی اور اسلامی بنیاد پرستی سے بھی ایسا ہی خطرہ ہے جیسا دوسری جنگ عظیم سے قبل فاشسٹوں سے تھا۔ افغانستان سے ایران، عراق، سعودی عرب اور مصر تک کے ملکوں کے سماجی اور سیاسی حالات پر سرسری نظر ڈالنے سے حکومتوں کے جابرانہ نظام کا پتہ چلتا ہے

اور اسلامی کٹر پن سے یہ صورت حال اور بھی بوجھل ہوگئی ہے''۔

ایک دوسرا اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس میں طالبان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

''یہ عہد وسطیٰ کا وہ گروہ ہے جس نے بن لادن اور ان تمام پاگل ملاؤں کی بخوشی میزبانی قبول کی جن کے ہاتھ کشمیر سے پنٹاگن تک خون سے رنگے ہوئے ہیں''۔

اس ملک کا ایک خاص گروہ جسے سنگھ پریوار کہا جاتا ہے، ایک طویل عرصے سے یہ پروپیگنڈہ کرتا چلا آرہا ہے کہ اسلامی مدارس و مساجد ملک کی سلامتی کے لیے چیلنج ہیں اور ان اداروں میں دی جانے والی تعلیم دیش بھکتی کی تعلیم کے منافی ہے۔ یہ بالواسطہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کو نشانہ بنانے کی ہی کوشش ہے۔ آج کے میڈیا نے اس مفروضہ اور گمراہ کن پروپیگنڈہ کو تسلیم شدہ حقیقت مان لیا ہے اور آج کے حالات یہ ہیں کہ سب ایک سُر میں بول رہے ہیں، ایک راگ الاپ رہے ہیں اور ایک ہی ساز بجا رہے ہیں۔ آر ایس ایس کے کے سدرشن اور وشو ہندو پریشد کے اشوک سنگھل جیسے لوگوں کے اس گمراہ کن پروپیگنڈہ کو ہوا دینے کا ہی نتیجہ ہے کہ مغربی بنگال کے وزیر اعلیٰ بدھا دیب بھٹا چاریہ جیسے کمیونسٹ لیڈر بھی آر ایس ایس کی بولی بولنے لگے اور مدارس و مساجد پر شکوک وشبہات کی انگلی اٹھانے لگے ہیں۔

ملک کے معروف ناول نگار مشرف عالم ذوقی کے مطابق میڈیا کی مہربانی سے:

''آج مسلمان کا چہرہ بدل گیا ہے، اس کے چہرے پر ایک ماسک چڑھا دیا گیا ہے اور ایک نیا چہرہ بنا دیا گیا ہے''۔

یہ صورت گری کون کر رہا ہے؟ ظاہر ہے میڈیا کر رہا ہے۔ کبھی ورلڈ ٹریڈ سینٹر اور پنٹاگن پر حملوں کے حوالے سے تو کبھی جموں و کشمیر اسمبلی اور پارلیمنٹ پر حملوں کے وسیلے سے۔ کبھی ہندوستان میں ہونے والی دہشت پسندانہ کارروائیوں کے توسط سے تو کبھی توڑ پھوڑ اور تخریب کاری کے تعلق سے۔ اور یہ جرم پرنٹ میڈیا بھی کر رہا ہے اور الیکٹرانک میڈیا بھی۔ یہ میڈیا کی بے ایمانی نہیں تو کیا ہے کہ شمال مشرق میں ہونے والی دہشت گردی اور بہار، منی پور اور آسام

میں دہشت گرد گروپوں کی سرگرمیوں پر ہندو دہشت گردی کا لیبل نہیں لگایا جاتا، لیکن جہاں کسی واقعہ میں کوئی مسلمان ملوث ہوا، فوراً اسلامی دہشت گردی کا راگ الاپا جانے لگتا ہے۔

مدارس و مساجد کے تعلق سے قومی میڈیا کا رویہ بہت ہی خطرناک اور تشویش انگیز ہے۔ ہند، نیپال اور ہند بنگلہ دیش سرحد پر واقع مدارس و مساجد کو ملکی سلامتی کے لیے خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور میڈیا اس کو بری طرح اچھال کر ان کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انگریزی اخبار ''پائنیر'' نے ۵/جنوری ۲۰۰۲ء کی اشاعت میں اس سلسلے میں ایک رپورٹ شائع کی ہے جس میں سرحدی اضلاع میں مسلمانوں، مسجدوں و مدرسوں کی تعداد میں اضافہ پر تشویش ظاہر کی گئی ہے۔ رپورٹ میں اس صورت حال کو آبادی کا حملہ قرار دیا گیا ہے۔ رپورٹ کے مطابق بہار میں ۷۳۵ کلومیٹر طویل ہند نیپال سرحد پر آئی ایس آئی کی سرگرمیاں عروج پر ہیں اور ہر قسم کی غیر قانونی تجارت پھل پھول رہی ہے۔ اس رپورٹ میں اعداد و شمار کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہند بنگلہ دیش اور ہند نیپال سرحد پر مدارس و مساجد کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی ملک کے لیے بھی خطرناک ہے اور ہندوؤں کے لیے بھی۔ ایسی رپورٹنگ صرف ایک اخبار میں نہیں بلکہ کم و بیش تمام اخبارات میں ہو رہی ہے۔ کلکتہ میں امریکی سینٹر پر حملے کے بعد ایک اخبار نے ایسے مدرسوں کی تفصیل پیش کی تھی جن میں بقول اس کے دہشت گرد پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس فہرست میں چند ایسے اداروں کا نام بھی تھا جہاں مدارس کے ساتھ ساتھ اسکول اور کالج بھی چل رہے ہیں۔

مسلمانوں کے تئیں میڈیا کی ذہنیت:

دراصل قومی اخبارات مسلمانوں کے معاملات سے بہت زیادہ واقفیت نہیں رکھتے، وہ سنی سنائی باتوں کو بغیر چھان بین اور بغیر کسی ثبوت کے جوں کا توں پیش کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک اخبار نے ہند نیپال سرحد پر مدرسوں کا جائزہ لیتے ہوئے بالکل سرحد سے متصل جھنڈا نگر کے مدرسے کو بھی جو کہ نیپال میں واقع ہے اس فہرست میں شامل کیا اور دہشت گردی پھیلانے

والوں میں اس مدرسہ کے بانی مولانا عبدالرؤف رحمانی جھنڈا نگری کا بھی نام پیش کیا اور واقعہ یہ ہے کہ مولانا جھنڈا نگری رپورٹ کی اشاعت سے کئی سال قبل انتقال کر چکے ہیں۔ ایسی غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ کی ایک وجہ یہ ہے کہ میڈیا والوں کو مسلم مسائل اور ان کے معاملات کے بارے میں صرف سطحی معلومات ہوتی ہیں۔ وہ نہ تو ان معاملات کو گہرائی میں جا کر جاننے اور پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ہی انھیں اس کی ضرورت ہوتی ہے اور دوسری وجہ ان کی مسلم دشمن ذہنیت ہے جو ان سے ایسی باتیں لکھواتی ہے۔

میڈیا کی اس ذہنیت کو مزید سمجھنا ہو تو اور پیچھے چلئے۔ فسادات میں میڈیا دو قسم کے رول ادا کرتا ہے۔ ایک فساد سے قبل فسادی فضا سازگار کرنا اور دوسرا فساد شروع ہونے کے بعد جانبدارانہ رپورٹنگ سے اسے اور بھی ہوا دینا۔ کسی بھی شہر میں جب فرقہ وارانہ کشیدگی پیدا ہوتی ہے تو قومی پریس اس میں نمک مرچ لگا کر پیش کرتا ہے اور اس کی رپورٹنگ سے بعض اوقات حالات اور بھی دھماکہ خیز ہو جاتے ہیں۔ اس سلسلے میں دو مثالیں پیش کرنا چاہوں گا۔

بابری مسجد انہدام کے بعد انسٹیٹیوٹ آن کشمیر نامی انسانی حقوق کی تنظیم کی قیادت میں بعض گروپوں نے ۶ سے ۱۳ جولائی ۱۹۹۳ء میں دہلی کے کانسٹی ٹیوشن کلب میں ''سٹی زنس ٹریبونل'' نامی ایک عوامی عدالت لگائی تھی۔ جس میں ۶۳/ افراد نے گواہیاں دی تھیں اور بابری مسجد انہدام، اس کے پس منظر اور اس کے بعد بھڑکے فسادات پر اپنی بیباک رائیں پیش کی تھیں اور اپنے تجربات سنائے تھے۔ گواہی دینے والوں میں بعض وہ صحافی بھی تھے جو ۶ دسمبر ۹۲ کو اجودھیا میں کارسیوکوں کی وحشت و بربریت کا نشانہ بنے تھے۔ بعد میں ۳۲۷ صفحات پر مشتمل اس کی رپورٹ کو کتابی شکل میں شائع کیا گیا۔ ہندی کے معروف صحافی اور نیوز چینل ''آج تک'' کے اس وقت کے نیوز ریڈر اور ایڈیٹر آنجہانی ایس پی سنگھ نے بھی منڈل کمیشن کے نفاذ سے لے کر بابری مسجد انہدام اور اس کے بعد ہونے والے فسادات پر کھل کر روشنی ڈالی تھی۔ انھوں نے بہت ہی واشگاف انداز میں کہا تھا کہ بابری مسجد کے انہدام اور فرقہ پرستی کے فروغ میں قومی اخبارات بھی برابر کے شریک ہیں۔ انھوں نے مثال دے کر اخبارات کی جھوٹی، بے بنیاد اور

گمراہ کن رپورٹنگ کا کچا چٹھا پیش کیا تھا۔ ایس پی سنگھ نے اپنے تحریری بیان میں ایک ہندی اخبار کی رپورٹنگ کا حوالہ دیتے ہوئے جس کے بعد علی گڑھ ریلوے اسٹیشن پر مسلمانوں پر حملہ ہوا تھا اور شہر میں فساد کی سنگینی اور بڑھ گئی تھی، کہا تھا کہ:

''اس اخبار نے یہ جھوٹی خبر شائع کی کہ مسلم یونیورسٹی کے میڈیکل کالج میں جو ہندو مریض بھرتی ہو رہے ہیں انھیں مسلمان ڈاکٹر زہر دے کر مار رہے ہیں۔ اس خبر کے نتیجے میں زبردست فساد چھڑ گیا۔ تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ یہ خبر جھوٹی اور بے بنیاد تھی، لیکن مذکورہ اخبار نے کسی گوشے میں بھی اس کی تصحیح شائع نہیں کی''۔

انھوں نے مزید کہا کہ:

''ایسے فرقہ پرست اخبارات کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوتی ان کو سزا دینے کے لیے ایک بااختیار ادارہ قائم کیا جانا چاہئے جو پریس کونسل کی مانند غیر موثر نہ ہو''۔

ہندی صحافیہ منی مالا نے بھی جو اس وقت آخبار ٹائمز آف انڈیا میں فیلو جرنلسٹ تھیں، ایک پیپر پڑھا تھا جس میں انگریزی اور ہندی اخبارات کی جھوٹی رپورٹنگ کا پوسٹ مارٹم کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ کس طرح ان اخبارات نے فساد بھڑکانے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ انھوں نے بنارس فساد کی مثال پیش کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ۱۹۷۲ء میں بنارس کے ایک ہندی اخبار نے مسلسل تین دن تک یہ جھوٹی خبر نمایاں سرخیوں کے ساتھ شائع کی کہ مسلم یونیورسٹی کے طلباء بنارس میں داخل ہو گئے ہیں اور وہ بنارس میں فساد کرانا چاہتے ہیں، جبکہ ایسی کوئی بات نہیں تھی اور کہیں بھی کشیدگی نہیں تھی۔ لیکن اس جھوٹی رپورٹنگ کا یہ اثر ہوا کہ بنارس میں چوتھے روز فساد پھوٹ پڑا۔

تیرہ روز تک چلنے والے اس ٹربیونل میں قومی اخبارات یا نیشنل میڈیا کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا اور انھیں بھی فرقہ پرستی پھیلانے میں برابر کا شریک گردانا گیا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ قومی پریس نے اس انتہائی اہم کوشش کا تقریباً بائیکاٹ کیا۔ شروع کے دو دنوں میں اخبارات نے دلچسپی

دکھائی لیکن جب انھوں نے اپنے اوپر زد پڑتی دیکھی تو اپنے نامہ نگاروں کو دوسرے اسائنمنٹ دیدیئے۔ یہاں تک کہ ٹربیونل کے ذریعہ جاری کی جانے والی پریس ریلیز میں بھی زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی گئی۔

بابری مسجد انہدام سے قبل ملک میں فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑکانے میں قومی پریس کا جورول رہا ہے اس کا جائزہ لینے کے لیے ان ایام میں اخبارات کی رپورٹنگ پر ایک نظر ڈالی جاسکتی ہے۔ لال کرشن آڈوانی کی رتھ یاترا اور سادھوسنتوں کی یاتراؤں، شلا پوجن، رام مندر تعمیر کے لیے ملک کے کونے کونے سے اینٹوں کو اجودھیا پہنچانے اور ان جیسی دیگر سرگرمیوں کو قومی پریس نے بھی تقریباً اپنا دھارمک معاملہ بنالیا تھا۔ ان واقعات کی زیادہ سے زیادہ کوریج اور انھیں گلوریفائی کرنا نامہ نگاروں کا فرض منصبی بن گیا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھی کم از کم اپنی رپورٹنگ سے ہی اس کارخیر میں حصہ لینا چاہتے ہیں۔ بابری مسجد کو ڈھانچہ لکھنے اور کہنے سے لے کر بابری مسجد/رام جنم بھومی تنازعہ کو صرف رام مندر تنازعہ کہنے تک کا سلسلہ تو آج بھی جاری ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ بابری مسجد انہدام کی ایک ایک لمحے کی تصویر کشی کی گئی اور اس ثقافتی دہشت گردی کو سرکاری وغیر سرکاری ٹی وی چینلوں پر اس طرح دکھایا گیا جیسے کوئی بہت ہی تاریخی واقعہ رونما ہو رہا ہو۔ اس رپورٹنگ نے مسلمانوں کے دلوں کو اس طرح چھلنی کیا اور فرقہ پرستوں کے حوصلے اس قدر بلند کیے کہ انہدام کے فوراً بعد مسلم کش فسادات بھڑک اٹھے۔ فسادات کی کوریج میں بھی یہی انداز کارفرما رہا۔

جو لوگ اخبارات بالخصوص ہندی اخبارات کا پابندی کے ساتھ مطالعہ کرتے ہیں وہ فسادات کے دنوں میں یہ بات نوٹ کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ جیسے بیشتر اخبار اخبار نہیں آر ایس ایس کے پمفلٹ ہوں۔ نمایاں خبریں سنگھ پریوار سے وابستہ ہوتی ہیں اور اخبارات کے اداریئے کے ایس سدرشن اور بال ٹھاکرے جیسے لوگوں کے تحریر کردہ معلوم ہوتے ہیں۔ جب مارچ ۲۰۰۱ء میں قرآن مجید کے اوراق نذرِ آتش کرنے کے خلاف احتجاج کے دوران کانپور میں فساد ہوا تو ان اخبارات کی رپورٹنگ سے ایک لمحے کو ایسا محسوس ہوا جیسے سیمی کے کارکنوں

نے پورے شہر کو یرغمال بنالیا ہے۔ اخبار دینک جاگرن جو کہ اپنی مسلم دشمن ذہنیت کے لیے جانا پہچانا جاتا ہے، ۲۰ مارچ ۲۰۰۱ء کی اشاعت میں اپنے اداریئے میں لکھتا ہے:

''یہ بھی پہلی بار ہوا ہے کہ پولیس کے خلاف اے کے ۴۷ رائفل کا استعمال مسجدوں سے کیا گیا۔ اگر مسجدوں کا استعمال تشدد کے لیے کیا جائے تو ایسی مذہبی عبادت گاہوں کو برداشت نہیں کیا جانا چاہئے۔ جہاں گولہ بارود کے ذخیرے اکٹھا کیے جائیں اور جہاں سے پولیس پر گولیاں برسائی جائیں''۔

تقریباً ایسی ہی رپورٹنگ ایک سیکولر سمجھے جانے والے اخبار راشٹریہ سہارا کی بھی تھی۔ ان اخبارات میں سیمی کی مبینہ غنڈہ گردی کا خوب ڈھول پیٹا گیا لیکن اتر پردیش کے ڈائرکٹر جنرل آف پولیس کے اس بیان کو ان اخبارات نے نمایاں کرنے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کانپور فساد میں سیمی کا ہاتھ ثابت نہیں ہوسکا۔ اسی طرح فیض آباد میں پولیس مظالم کے خلاف جب مسلمانوں نے اپنے کاروبار بند رکھے تو دینک جاگرن نے لکھا کہ آج اقلیتوں نے اپنا کاروبار بند رکھا تو ایسا لگا جیسے اتی کرمن یعنی انکروچمنٹ ہٹ گیا ہے۔

معروف صحافی نیلوفر سہروردی نے اخبار ہندوستان ٹائمز میں ''مسلمان اور جانبدار بھارتی میڈیا'' کے عنوان سے ایک مضمون میں اس جانب اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کا موازنہ امریکہ میں سیاہ فاموں سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ گرفتار شدہ مسلمانوں اور سیاہ فاموں کے نام اور تصاویر اخبارات تک پہنچانے میں دیر نہیں لگتی لیکن مبینہ مجرم ہندو یا سفید فام ہوں تو عام طور پر ان کے نام بھی ظاہر نہیں کیے جاتے۔ وہ آگے لکھتی ہیں کہ نیشنل میڈیا نے دہشت گردی سے متعلق اپنے تجزیوں کو اسلام اور مسلمانوں تک محدود کر رکھا ہے۔ وہ دہشت گردی کا بڑھ چڑھ کر شور مچانے کے باوجود شاذ و نادر ہی ہندوؤں کو دہشت گرد قرار دینے کے بارے میں سوچتا ہے۔

تیستا سیتل واڈ بمبئی کی معروف سماجی کارکن ہیں وہ بے باک جریدہ کمبیٹ کمیونلزم کی

ایڈیٹر بھی ہیں اور انھوں نے نیشنل میڈیا کی ذہنیت کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ میڈیا کی رپورٹوں میں ایسی امتیازی بھول چوک کی جھلکیاں نظر آنے لگی ہیں جن کا مقصد آر ایس ایس، شوسینا، وی ایچ پی، بجرنگ دل اور بی جے پی کو ان کاموں سے لاتعلق ثابت کیا جانا ہے جن کو ان تنظیموں کے کارکنوں نے شروع کیا اور جن کے لیے عدلیہ انھیں ذمہ دار ٹھہرا چکی ہے لیکن میڈیا ان لوگوں کو صاف بچالے جاتا ہے۔مثلاً میڈیا کا ان لال کرشن آڈوانی کو بے داغ بتانا ہے جنھوں نے سومناتھ سے اجودھیا تک رتھ یاترا کی تھی جنھوں نے خونریزی کی ترغیب دی اور جو میرٹھ، ملیانہ، بھاگلپور، کانپور، احمد آباد اور بمبئی فسادات کا باعث بنے۔

ایسا نہیں ہے کہ صرف روزنامہ اخبارات ہی اس جرم میں ملوث ہیں، بلکہ انڈیا ٹوڈے جیسا باوقار جریدہ بھی زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچنے کے لیے بعض اوقات ایسے ہی سطحی اور گھٹیا ہتھکنڈے اختیار کرتا ہے۔نومبر ۱۹۹۲ء کے شمارہ میں یعنی بابری مسجد انہدام سے عین قبل سرورق پر ایک کنول کا پھول بنایا گیا اور اس میں آڈوانی کو بھگوان کے روپ میں بٹھایا گیا۔ان کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور ٹائٹل پر لکھا ہوا تھا ''کمل کھل رہا ہے''۔اخبار ٹائمز آف انڈیا بھی اپنی غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کے لیے مشہور ہے مگر سیتل واڈ نے اس کی بھی قلعی کھولی ہے۔وہ اپنے ایک کالم میں لکھتی ہیں:

> ''۱۹۶۱ء کے جبل پور فساد کے دوران ٹائمز آف انڈیا نے انتہائی جانبدارانہ رپورٹنگ کی تھی اور لکھا تھا کہ شہر کی مسجد میں پاکستانی شہری چھپے ہوئے ہیں۔اس کے بعد فری پریس جرنل کے سرکردہ صحافی آنجہانی ایس بی کولیے نے جبل پور کا دورہ کیا اور ایک سینئر پولیس افسر سے ناقابل تردید حقائق حاصل کر کے ٹائمز آف انڈیا کی رپورٹنگ کی پول کھول دی''۔

وہ بھی ایس پی سنگھ کی طرح سوال کرتی ہیں کہ کیا ایسے اخباروں کو کوئی سزا دی جاتی ہے؟

جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ دراصل قومی اخبارات ایسے معاملات میں سنی سنائی باتیں بلاتحقیق کے چھاپ دیتے ہیں اور جب بعد میں جانچ سے ان کی رپورٹ غلط ثابت ہوتی ہے تو وہ

تردید کرنے کی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ بمبئی فساد کی جانچ کرنے والے جسٹس سری کرشنا کمیشن میں بھی ایسی ہی ایک گواہی دی گئی تھی۔ بمبئی فساد کا دوبارہ آغاز متھاڈی ورکرس کے قتل اور رادھا بائی چال کے واقعہ سے وابستہ ہے۔ کمیشن میں گواہی دیتے ہوئے معروف سیاستداں اور مہاراشٹر کے سابق وزیر اعلیٰ شرد پوار نے کہا تھا کہ ان واقعات کو سامنا جیسے اخبارات نے بڑھا چڑھا کر پیش کیا اور ہندوؤں کو سڑکوں پر آنے کے لیے اکسایا جس کے نتیجے میں جنوری ۹۳ء میں بدترین فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا۔ غالباً ایسے ہی اخبارات کے پروپیگنڈے سے راج دیپ سردیسائی بھی متاثر ہوئے ہوں گے۔ راج دیپ سردیسائی اس وقت اخبار ٹائمز آف انڈیا میں ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے ''جب بمبئی جل اٹھا'' کے عنوان سے ایک مضمون قلمبند کیا اور لکھا کہ متھاڈی ورکرس کے قتل کے ذمہ دار مسلمان تھے۔ رادھا بائی چال کے سانحہ کے ذمہ دار بھی مسلمان تھے۔ ۵؍جنوری سے ۸؍جنوری ۹۳ء کے درمیان جن لوگوں نے ہنگاموں کی ابتداء کی تھی جس کے بعد فسادات نے زور پکڑا تھا، وہ بھی مسلمان تھے۔ لیکن جب سری کرشنا کمیشن میں گواہی دینے سردیسائی پہنچے تو اس وقت تک انھوں نے ان واقعات کی چھان بین کر لی تھی، انھوں نے اپنی گواہی میں اعتراف کیا کہ مسلمانوں نے فسادات کے دوران جو رول ادا کیا تھا اس کی توثیق کرنے کے لیے انھوں نے مسلم علاقوں کا دورہ کیا اور اس دورے کے بعد ۱۷ جنوری اور ۲۴ جنوری ۹۳ء کو اس موضوع پر ٹائمز آف انڈیا میں دو مضامین لکھے۔ انھوں نے بتایا کہ باوجودیکہ یہ خیال تھا کہ مسلمانوں نے فسادات میں رول ادا کیا ہے وہ کسی ایسی خاص مسلم تنظیم سے واقف نہیں ہو سکے جو اس میں ملوث رہی ہو اور اسی طرح فساد میں نمایاں رول ادا کیا ہو جیسے کہ شیو سینا نے ادا کیا تھا۔ انھوں نے مسلم علاقوں کے دورے کے دوران جو تفتیش کی اس سے یہ انکشاف ہوا کہ دوسرے علاقوں سے پیشہ ور قاتل ان آبادیوں میں آ گئے تھے اور انھوں نے فسادات کو ہوا دی تھی۔

جب بھی کہیں کشیدگی ہوتی ہے یا فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑتا ہے تو میڈیا کے لاعلم مگر بہ زعم خود ہر معاملے کی باریکی سے واقف صحافی حضرات غیر ضروری طور پر مسلمانوں کی نفسیات کا جائزہ

لینا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا وہ واقعہ جب دہلی کے سیلم پور علاقہ میں ارشاد نامی ایک نوجوان سرراہ اور دن دہاڑے پولیس کی پٹائی سے ہلاک ہوگیا تھا اور سیلم پور، جعفر آباد اور ویلکم میں کشیدگی پھیل گئی تھی تو اس وقت اخبار ہندوستان ٹائمز نے اپنی رپورٹوں میں اس واقعہ کے حوالے سے مسلم آبادیوں کے بارے میں یہ رائے قائم کی کہ مسلم علاقوں میں ایسے مواقع پر حالات اتنے نازک ہو جاتے ہیں کہ ایک پتھر بھی بدترین تشدد کی ابتداء کے لیے کافی ہوتا ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ قومی پریس کو مسلم مسائل سے دلچسپی نہیں ہوتی، ہوتی ہے مگر اس طرح کہ وہ ان کو اچھال کر مسلمانوں کو بدنام کرنا چاہتا ہے۔ چند سال قبل جنوبی افریقہ کے رہنما نیلسن منڈیلا اور اداکارہ شبانہ اعظمی کے درمیان ایک بوسہ کے سلسلے میں مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کی گئی تھی۔ اخبار پائنیر نے اس واقعہ کے ایک ہفتہ بعد لیٹرس ٹو دی ایڈیٹر کالم میں علی گڑھ کے ایک مسلم قاری کا خط چھاپ کر اس واقعہ کو ہوا دینی شروع کی۔ چند اور مراسلے آئے اور پھر اسٹاف کے ایک صحافی نے اس پر مسلمانوں کے خلاف ایک زہریلا مضمون لکھا، پھر اداریہ تحریر کیا گیا اور اس طرح غیر ضروری طور پر اس واقعہ کو بنیاد بنا کر ملک بھر میں آگ لگا دی گئی۔ اسی طرح جب حیدر آباد کی کمسن لڑکی امینہ کی شادی ایک سعودی شیخ سے ہوئی تو نیشنل میڈیا نے پوری ملّت کو کٹہرے میں کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی۔ مسلم پرسنل لاء، خواتین کے حقوق، طلاق اور دیگر مسلم معاملات میں بھی ملت اسلامیہ کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہندی ادب پر اثرات:

نیشنل میڈیا کے اس متعصّبانہ اندازِ فکر کے اثرات ہندی ادب پر بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پٹنہ کے ہفتہ وار جریدہ ''نقاد'' کی ایک اشاعت میں پروفیسر نامور سنگھ نے ''فرقہ پرستی کی وجہ'' کے عنوان سے لکھا ہے کہ آلوک رائے کی تصنیف ہندی نیشنلزم کا مطالعہ ضروری ہے۔ وہ علاقے جہاں ۱۹۱۸ء میں کسان آندولن ہوا ۱۹۲۵ء میں پہلی ٹریڈ یونین بنی، ۱۹۴۲ء میں بھارت چھوڑ و آندولن ہو انھیں علاقوں میں ہندو فرقہ پرستی اتنی مضبوط کیوں ہوگئی ہے۔ ایسا کیوں ہوا اور اس میں ہندی کا

کتنا ہاتھ ہے؟ یہ سوال چونکہ نامور سنگھ جیسی شخصیت نے کیا ہے اس لیے ہندی ادیبوں کو اس کا جواب تلاش کرنا چاہئے۔

فسادات کے تعلق سے قومی پریس نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ فسادات کی ابتداء مسلمان کرتے ہیں کیوں؟ اس لئے کہ وہ جنونی، جاہل اور قانون شکن ہوتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمان ہی فسادات کے سب سے زیادہ شکار ہوتے ہیں۔ وہی مارے پیٹے جاتے ہیں، وہی جیلوں میں ڈالے جاتے ہیں اور انہی کی سب سے زیادہ املاک تباہ ہوتی ہیں۔

پرنٹ میڈیا کی طرح الیکٹرانک میڈیا بھی مسلم معاملات میں ون وے ٹریفک چلاتا ہے۔ اس کا بھی رویہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور غیر حقیقت پسندانہ ہوتا ہے۔ بالخصوص ہندی چینل ''آج تک'' تو اس معاملے میں سب پر بازی لے گیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا عوام تک جلد از جلد پہنچنے کی ہوس میں حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے۔ کسی بھی واقعہ کے بعد الیکٹرانک میڈیا کے نوعمر لڑکے اور لڑکیاں متعلقہ لوگوں کے پاس مائک لے کر پہنچ جاتے ہیں اور منھ میں الفاظ اور زبان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب بھی مسلم بیزاری یا مسلمانوں کے تعلق سے غیر منصفانہ رویے کی بات ہم کرتے ہیں تو ہمارے سامنے یہ حقیقت بھی ہوتی ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں کے نام تک صحیح نہیں لے پاتے چہ جائیکہ سچائیوں سے واقف ہوں۔ جب بھی کسی واقعہ پر کوئی ردعمل معلوم کرنا ہوتا ہے تو ان کی پہنچ باخبر لوگوں تک نہیں ہو پاتی یا وہ قصداً ایسے لوگوں تک پہنچنا نہیں چاہتے۔

دہشت گردی، مدارس اور میڈیا

آج اگر ہم دہشت پسندانہ واقعات کے تعلق سے میڈیا کی رپورٹنگ کا عمومی جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ دہشت گردی اور مدارس میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں اور مدارس و مکاتب دہشت گردوں کی پناہ گاہیں بھی ہیں اور کمین گاہیں بھی ہیں۔ دنیا میں جہاں جہاں مدرسے پھیلے ہوئے ہیں وہاں وہاں دہشت گرد پیدا ہو رہے ہیں اور معصوموں، بے قصوروں اور عام لوگوں کے درمیان جا کر تشدد آمیز وارداتیں انجام دینے والے خطرناک اور خونخوار عناصر مدارس کے کمروں اور حجروں سے ہی برآمد ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں مدرسوں کے خلاف ایسا منظّم پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ مدارس کی شکل وصورت اور ان کی شبیہ ہی بگڑ کر بلکہ مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ مدارس کے بارے میں دہشت گردی سے متعلق اس قدر جھوٹ بولا گیا ہے اور بولا جا رہا ہے کہ اب یہ جھوٹ بھی بسا اوقات سچ لگنے لگتا ہے۔ جب بھی کہیں کوئی واردات ہوتی ہے تو لوگوں کے ذہنوں میں مدارس کا نقشہ گردش کرنے لگتا ہے اور باریش نوجوان نگاہوں میں گھوم جاتے ہیں۔

ممکن ہے کہ پاکستان یا بعض دیگر ملکوں میں تشدد آمیز واقعات میں ملوث کچھ عناصر ایسے مل جائیں جن کا بیک گراؤنڈ مدارس کا رہا ہو مگر ان کی آڑ میں پوری دنیا کے مدارس و مکاتب کو نشانہ بنانے کا جو خطرناک کھیل اس وقت چل رہا ہے وہ اگر اسی طرح چلتا رہا تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ کہہ کر ان مدارس کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کرنے کی مہم چل پڑے کہ جب تک یہ ختم نہیں ہوں گے دہشت گردی ختم نہیں ہوگی۔

آج جب بھی کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے اور الیکٹرانک میڈیا کو فوری طور پر اس کی تصویر نہیں

مل پاتی تو وہ اپنی رپورٹنگ میں ایسے مناظر دکھاتا ہے جہاں داڑھی اور ٹوپی والے طلبا نظر آتے ہیں اور گویا یہ تاثر دینے کی کوشش کرتا ہے کہ ہو نہ ہو انہی جیسے لوگوں میں سے کوئی ہوگا جو اس واردات کا ذمہ دار ہوگا۔ اخبارات میں جب دہشت گردی سے متعلق کوئی مضمون شائع ہوتا ہے تو اس کو مستند بنانے کے لئے مدرسوں اور مسجدوں کی تصویریں بھی شائع کی جاتی ہیں۔ گویا غیر اعلانیہ طور پر ان کو دہشت گردی کے منبع اور مخرج کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ ملک کے تمام نیوز چینل اور تمام اخبارات ایسے نہیں ہیں ان میں بعض ایسے بھی ہیں جو اس پروپیگنڈہ کے شکار نہیں ہیں لیکن ان کی تعداد اگر گنی جائے تو ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی فاضل پڑ جائیں گی۔ بعض مستثنیات کو چھوڑ کر آج کا میڈیا ایسا ہی پروپیگنڈہ کرتا ہے کہ جس کی جتنی لمبی داڑھی ہے وہ اتنا ہی بڑا دہشت گرد ہے۔ اسامہ بن لادن اور ان جیسے دیگر لوگوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے مدرسوں کا منہ نہیں دیکھا، لیکن چونکہ بن لادن کے چہرے پر طویل داڑھی ہے اور AK47 سے نشانہ لگاتے ہوئے اس کی ایک تصویر میڈیا کے پاس ہے لہٰذا سارے داڑھی والے بن لادن کے بھائی ہیں اور پوری دنیا کے امن وامان کے لئے سنگین خطرہ ہیں۔ ہم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ ممکن ہے کہ سرحد پار بعض مدارس میں مسلح جدوجہد کی تعلیم دی جاتی ہو اور وہاں سے نکل کر بعض لوگ ان مسلح تنظیموں میں جاتے ہوں جن کو دہشت گرد تنظیم کہا جاتا ہے لیکن ان کی آڑ میں ہندوستان اور دیگر ملکوں کے مدرسوں کو نشانہ بنانے کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔ دراصل مدرسوں کے خلاف پروپیگنڈہ کی جڑ یہودی میڈیا میں پیوست ہے۔ وہیں سے اس کا آغاز ہوا اور اب انہی کی اصطلاحیں پوری دنیا میں استعمال ہو رہی ہیں۔ اسلام اور کفر کی جنگ نئی نہیں ہے، اس جنگ کو اب دوسری شکل وصورت میں ڈھال دیا گیا ہے۔

دراصل مغرب نے مسلمانوں کے خلاف اپنی جنگ کو تیز کرنے کے لیے ایک اصطلاح گھڑی ہے، جس کا نام ہے ''اسلامی دہشت گردی'' اور مغربی میڈیا نے اس کا پروپیگنڈہ اس قدر زور وشور سے کیا ہے کہ آج پوری دنیا کا میڈیا اس اصطلاح کو بے جھجک و بے دھڑک استعمال کرتا ہے۔ اس اصطلاح کو ایک منصوبہ بندی کے تحت مکاتب و مدارس اور مساجد سے جوڑ دیا گیا ہے اور انتہائی

ڈھٹائی، بے حیائی اور بے شرمی کے ساتھ اس کا پرچار کیا جا رہا ہے کہ مدارس و مساجد بنیاد پرستی کے اڈے اور اسلامی تعلیم گاہیں اور دہشت گردی کی کارگاہیں بن گئی ہیں اور ان کارگاہوں میں جہادی اور اسلامی دہشت گرد ڈھالے جا رہے ہیں جو ان فیکٹریوں سے نکل کر پوری دنیا میں دہشت و ہیبت اور تشدد و خونریزی کا بازار گرم کیے ہوئے ہیں۔ ان مدارس و مکاتب سے امن عالم کو زبردست خطرات لاحق ہو گئے ہیں اور جب تک ان کو بیخ و بن سے نیست و نابود نہیں کیا جائے گا، دنیا امن و امان کے سائے میں نہیں آ سکے گی۔ مسلم دشمنی کے اس سفر میں ہندوستانی میڈیا بھی مغربی میڈیا کے دوش بدوش ہے اور اس نے بھی بالخصوص گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد مدارس و مکاتب کے خلاف اپنی آواز تیز کر دی ہے۔

میڈیا نے طالبان کی آڑ میں مدارس و مکاتب پر ہلّہ بول دیا ہے۔ اس نے تین م یعنی ''مسلمان، مدارس اور مساجد'' کا ایک مثلث قائم کر دیا ہے جو اس کے مفروضے کے مطابق قومی سلامتی کے لیے زبردست خطرہ ہے۔ لہٰذا اس مثلث کو توڑنے کی سخت ضرورت ہے۔ ہندوستانی میڈیا جہاں بہت حد تک مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے سے متاثر ہوا ہے وہیں اس نے سنگھ پریوار کے پرچار کا بھی اثر قبول کیا ہے اور اب اس کی رپورٹنگ نے مسلمانوں کی شکل و صورت بدل دی ہے۔ اب ہر مسلمان کے چہرے، بالخصوص مسجد و مدرسہ سے تعلق رکھنے والے مسلمان کے چہرے پر ایک ماسک چڑھا دیا گیا ہے اور اس کا ایک نیا چہرہ بنا دیا گیا ہے اور وہ چہرہ ہے ایک دہشت گرد کا چہرہ، ایک ایسا چہرہ جس سے اب ڈرانے کا کام لیا جاتا ہے۔ آج میڈیا نے مسلمان کی تعریف بدل دی ہے۔ مسلمان یعنی مدرسے سے نکلا ہوا ایک خطرناک شکاری جو چہرے پر داڑھی، سر پر کفن، جیب میں پستول اور لباس کے اندر بارود اور بم رکھتا ہے۔ مسلمان یعنی لشکر طیبہ، جیش محمد، حزب المجاہدین، حرکت الانصار، القاعدہ اور سیمی کا ممبر، جسے پیار ہے تو موت سے، دلچسپی ہے تو تباہی و بربادی سے اور عشق ہے تو قتل و خوں ریزی سے۔ ایک صدی سے بھی زائد عرصے سے شائع ہونے والے ایک بڑے انگریزی روزنامہ دی ٹریبون کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔ اخبار کا نمائندہ ۸/فروری ۲۰۰۲ کی اشاعت میں لکھتا ہے:

''سہارنپور اور مظفرنگر روڈ پر ایک چھوٹا سا قصبہ ہے دیوبند۔ یہ قصبہ مسلم فلاسفی اور تھیالوجی کے حوالے سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ یہاں کے مدارس سے فارغ التحصیل اسٹوڈنٹس کو طالبان کہا جاتا ہے۔ افغانستان میں برسر اقتدار طالبان گروپ میں جسے اب کھدیڑ دیا گیا ہے، ایسے کئی چہرے تھے جنھوں نے ان مدارس میں تعلیم پائی تھی''۔

مدارس و مکاتب کو دہشت گردوں کی فیکٹریاں قرار دینے میں نہ تو الیکٹرانک میڈیا پیچھے ہے نہ پرنٹ میڈیا۔ ویب سائٹوں پر بھی یہ پرچار خاموشی سے مگر منصوبہ بندی کے تحت کیا جارہا ہے۔ جب بھی کہیں کوئی واقعہ ہوتا ہے اور پولیس کسی باریش مسلمان کو گرفتار کرتی ہے تو الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں کی آواز بہت بلند ہو جاتی ہے اور بغیر چھان پھٹک اور بغیر ثبوت کے صرف پولیس کے بیانات کو سامنے رکھ کر گرفتار شخص کو انتہائی خطرناک دہشت گرد بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات تو فرضی مڈبھیڑوں کو بھی میڈیا اس انداز میں پیش کرتا ہے گویا اگر یہ مڈبھیڑ نہ ہوئی ہوتی تو ملک میں کہرام مچ جاتا۔ گزشتہ دنوں ناگپور میں آر ایس ایس کے صدر دفتر پر جو مڈبھیڑ دکھائی گئی اور جس میں بقول پولیس کے کئی دہشت گرد مارے گئے، میڈیا نے ایسا ہی رویہ اختیار کیا تھا۔ حالانکہ بعد میں اس مبینہ دہشت گردانہ حملے کی صداقت ہی مشکوک ہوگئی اور اس واقعہ کی سی بی آئی جانچ کا مطالبہ کیا جانے لگا۔

میں مزید چند حوالے دے کر اپنی بات کو آگے بڑھانا چاہتا ہوں۔ ایس گورومورتی چنئی میں رہتے ہیں۔ انڈین ایکسپریس گروپ کے آڈیٹر ہیں اور آر ایس ایس کی تنظیم سودیشی جاگرن منچ کے کنوینر ہیں۔ انہوں نے ۲۶، ۲۷ اور ۲۹ /اپریل ۲۰۰۲ کو دی نیو انڈین ایکسپریس میں مدارس کے خلاف تین قسطوں میں مضامین لکھے۔ جن میں مدارس کو دہشت گردوں کی فیکٹریاں قرار دیا گیا۔ انہوں نے ان مضامین میں انٹلی جنس ایجنسیوں کی انتہائی خفیہ اور کانفیڈنیشیل رپورٹوں کے حوالے سے مدارس کا جائزہ لیا ہے۔ گورومورتی نے ایسے کئی نام گنائے ہیں جن کو پاکستانی بتایا گیا ہے اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے مختلف شہروں میں مدارس کے ذمہ داروں

سے رابطے قائم کر کے یہاں متعدد دہشت گرد بنائے ہیں۔ انہوں نے ان رپورٹوں کے حوالے سے دارالعلوم دیو بند اور ندوۃ العلماء لکھنؤ سمیت متعدد مدارس کے نام گنائے ہیں جہاں بقول ان کے لشکر طیبہ، حرکت الانصار اور دیگر دہشت گرد تنظیموں کے ایجنٹوں نے رابطے قائم کیے اور ان مدارس کے لوگوں نے ان کے قیام و طعام کا بندوبست کیا۔ یہ اپنے مضمون میں کہیں کہیں خفیہ رپورٹوں کا حوالہ دیتے ہیں مگر زیادہ تفصیلات از خود پیش کرتے ہیں اور نتائج بھی خود ہی اخذ کرتے ہیں۔

مدارس کے بارے میں گورومورتی کی معلومات کتنی سطحی ہیں اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بقول ان کے ہندوستان میں اسلامی مدارس چار یا پانچ تنظیموں کے زیر اہتمام چل رہے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان مدارس کے بارے میں ہندوؤں کو جاننا بہت ضروری ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ یہ مدرسے ہیں دارالعلوم دیو بند (قیام ۱۸۸۶) مدرسۃ العلوم علی گڑھ (قیام ۱۸۷۳) ندوۃ العلماء لکھنؤ (قیام ۱۸۹۴) جامعہ ہدایہ جے پور (قیام ۱۹۴۸) اور ایک مدرسہ کا نام وہ اہلحدیث بتاتے ہیں۔ قابل ذکر ہے کہ انہوں نے جس مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا ذکر کیا ہے وہ ۱۹۲۰ میں مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کرتا ہے اور جس وقت مذکورہ مدرسوں کا قیام عمل میں آیا تھا اس وقت دہشت گردی کا نام بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ وہ آگے لکھتے ہیں:

> ''پوری دنیا مدارس کے فروغ سے تشویش میں مبتلا ہے۔ یہ مدرسے جہاں بھی ہوں، مغرب میں ہوں یا مشرق وسطیٰ میں، عراق میں ہوں یا ایران میں، پاکستان میں ہوں یا افغانستان میں، ملیشیا میں ہوں یا انڈونیشیا میں، ہندوستان میں ہوں یا بنگلہ دیش میں، تمام ملکوں کے مدارس ہیبت کے مراکز اور دہشت گردوں کی فیکٹریوں کے طور پر جانے جاتے ہیں''۔

بقول ان کے آج دنیا میں مدارس پر بحث ہو رہی ہے، ان کی جانچ اور چھان بین کی جا رہی ہے اور ان کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

سودیشی جاگرن منچ کے کنوینر خفیہ رپوٹوں کے حوالے سے بتاتے ہیں:

> ''دہلی میں متعدد مدارس دہشت گردانہ واقعات میں ملوث پائے گئے

ہیں۔ان میں سے چند یہ ہیں۔آزاد مارکیٹ کا مدرسہ، مدرسہ علوم اسلامیہ چتلی قبر، مدرسہ باب العلوم جعفر آباد، مدرسہ جامعہ اسلامیہ سنابل جسولہ اور مدرسہ ریاض العلوم اردو بازار جامع مسجد۔ ریاض العلوم میں دہشت گردی کے چار واقعات پائے گئے اور باب العلوم میں تین واقعات"۔

ان کے علاوہ یہ اتر پردیش، ممبئی، کلکتہ، گجرات اور دیگر ریاستوں اور شہروں کے مدارس کے بارے میں بھی ایسی ہی باتیں کرتے ہیں۔قابل ذکر بات یہ ہے کہ یہ مضامین جو کہ ۲۰۰۲ میں شائع ہوئے تھے آج بھی انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔

اسی طرح چنڈی گڑھ سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت ہندی اخبار"پنجاب کیسری" کی ۱۱ستمبر ۲۰۰۲ کی اشاعت میں مدارس پر ایک مضمون چھپا جس کا عنوان ہے"ہندوستان میں غیر قانونی مدرسوں کا پھیلتا جال"۔مضمون نگار ایم ایس نیگی نے بھی خفیہ رپورٹوں کے حوالے سے کچھ باتیں کی ہیں اور پھر اپنے دل کی بھڑاس نکالی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> "یہ المیہ ہے کہ ہندوستان میں مسلم سماج کے نونہالوں کے لیے تعلیم کے اکلوتے ادارے مدرسے آج کٹر واد اور آتنک واد کے مترادف بنتے جا رہے ہیں۔ایک خفیہ رپورٹ کے مطابق جموں وکشمیر کے سرحدی علاقوں، پاکستان سے متصل راجستھان گجرات سرحد اور ہند نیپال سرحد پر کھمبوں کی مانند سیکڑوں مدرسے و مسجدیں قائم ہو گئی ہیں۔ بیکانیر، سورت گڑھ اور سری گنگا نگر سرحد پر گزشتہ دو تین مہینوں میں تقریباً پچاس غیر قانونی مدرسے اور مسجدیں بن گئی ہیں۔اسی طرح ہند نیپال سرحد پر اور بنگلہ دیش کے قریب ۲۵۰ مدرسے کھل گئے ہیں۔یہی صورت حال مسلم اکثریتی ریاستوں کی بھی ہے جہاں تیزی کے ساتھ آئی ایس آئی اور جدہ میں واقع اسلامک ڈیولپمنٹ بینک سے کثیر مقدار میں پیسہ مل رہا ہے۔"

وہ مزید لکھتے ہیں:

''کہنے کے لیے مسلم ملکوں سے غیر قانونی طور پر آنے والا بہت زیادہ پیسہ مدرسوں میں بچوں کی تعلیم پر خرچ کرنے کے لیے آتا ہے، لیکن دراصل ان کا استعمال علاحدگی پسندانہ سرگرمیوں کے لیے کیا جاتا ہے''۔

انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان مدارس سے سرحدی علاقوں میں آبادی کا تناسب بگڑ گیا ہے۔ بقول ان کے مدرسوں کو خراب کرنے میں آئی ایس آئی کا ہاتھ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

''پاکستان، افغانستان اور مشرق وسطٰی کے کچھ مما لک میں مدرسے جہادی دہشت گرد پیدا کرنے کے کارخانے بن گئے ہیں۔ کراچی سے لاہور اور پشاور تک، افغانستان میں خوست سے قندھار تک، اور یمن سے سوڈان اور صومالیہ تک مدرسوں سے تیار ہو کر دہشت گرد پوری دنیا میں پھیل چکے ہیں۔ اس طرز پر آئی ایس آئی ہندوستان میں مدرسوں کو دہشت گردی کے کارخانوں کے روپ میں بدلنے میں مصروف ہے''۔

ایم ایس نیگی نے کیرالہ، مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، مغربی بنگال، آسام، گجرات، راجستھان، اتر پردیش، دہلی، کرناٹک، آندھرا پردیش اور جموں وکشمیر میں اسلامی مدارس کی تعداد ۳۰ ہزار ۴۷ ۹ بتائی ہے اور بقول ان کے ان مدارس میں ۱۸ لاکھ ۳۵ ہزار ۵۸۹ طلبا ہیں جو ان کے خیال میں دہشت گرد بن رہے ہیں۔

ہندی روز نامہ دینک جاگرن کی ۲۴ر فروری ۲۰۰۳ کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ''مدرسہ تعلیم کے نقصانات''۔ اس میں مضمون نگار ہردیہ نارائن دیکشت نے بھی مدرسوں کو دہشت گردی کی فیکٹری قرار دیا ہے اور کہا ہے:

''ہندوستان اور نیپال کی سرحد پر مدرسوں، مسجدوں اور مدرسہ نما اڈوں کی بڑھتی تعداد قومی سلامتی کے لیے خطرہ بن گئی ہے جس سے انٹلی جنس ایجنسیاں تشویش میں مبتلا ہیں۔ مدرسہ تعلیم کے مقاصد بہت واضح ہیں۔ یہ بچوں کو مذہبی نقطہ نظر سے کٹر، بنیاد پرست اور لڑا کو دل و دماغ

دیتی ہیں۔ اسلام اور مدرسہ تعلیم میں قوم، قومیت اور دیش بھکتی کے لیے کوئی سبق نہیں ہے۔ یہ مدرسے قومیت مخالف نئی پلٹنیں تیار کرنے والے اسکول ہیں۔ آئی ایس آئی، سیمی اور القاعدہ جیسی خطرناک تنظیموں اور مدرسہ تعلیم کے مقاصد الگ نہیں ہیں۔ یہ سب اسلامی دنیا کی تعمیر و تشکیل میں مصروف ہیں اور ہندوستان ان کا پہلا نشانہ ہے۔ ہندوستان میں نئے اورنگزیب، غوری اور غزنوی پیدا کرنا ہی مدرسہ تعلیم کا مقصد ہے''۔

جب اتنے شدومد کے ساتھ پروپیگنڈہ کیا جائے گا تو اس کے اثرات بھی مرتب ہوں گے۔ جہاں عام لوگ اس سے متاثر ہوں گے وہیں حکومتیں بھی اس کا اثر قبول کریں گی۔ ان پروپیگنڈوں کے نتیجے ہی میں اتر پردیش کے ڈائرکٹر اقلیتی بہبود نے ۲۰ جنوری ۲۰۰۳ کو ایک خطرناک سرکلر جاری کیا تھا۔ اس سرکلر میں مرکزی حکومت کی اسکیم برائے جدید کاری مدارس و مکاتب کے سلسلے میں امداد حاصل کرنے کے لیے اصول متعین کیے گئے ہیں۔ اس سرکلر میں تمام اقلیتی بہبود افسران کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ مدارس و مکاتب سے اس اسکیم سے متعلق موصولہ درخواست فارم اپنی جانچ کے بعد لکھنؤ روانہ کریں اور اس جانچ میں وہ یہ سرٹیفکیٹ بھی لگائیں کہ تصدیق کی جاتی ہے کہ مدرسہ/مکتب کی میرے ذریعے جانچ کی گئی اور یہ کسی بھی طرح سے ملک مخالف اور دہشت گردانہ سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہے۔ اس کے لیے مقامی ایس پی یا ایس ایس پی سے اسی قسم کا سرٹیفکیٹ حاصل کر کے جانچ رپورٹ کے ساتھ منسلک کیا جائے۔ ایسا ہی ایک اور گشتی مراسلہ ۱۹/جولائی ۲۰۰۲ کو جاری کیا گیا تھا۔

دوسرا پہلو:

یہ میڈیا کا ایک پہلو ہے اور جیسے کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں میڈیا کے بھی دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو جہاں تاریک، مایوس کن اور خطرناک ہے وہیں دوسرا پہلو قدرے روشن، تابناک اور حوصلہ افزا ہے۔ گرچہ میڈیا میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور ان کی جانب سے الزامات کے

جواب مدلل اور مسکت انداز میں نہیں آپاتے ہیں مگر ایسے سیکولر، انصاف پسند اور حق گو غیر مسلم صحافی اور قلمکار بھی ہیں جو شر پسندوں کے بے بنیاد اور شر انگیز الزامات کے مدلل اور شدید انداز میں جواب دیتے ہیں۔

پر بھاش جوشی ہندی صحافت کا بہت بڑا نام ہے۔گزشتہ دنوں این ڈی ٹی وی پر ایک مباحثے کے دوران انہوں نے بتایا کہ ۶ ردسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد منہدم کی گئی اس وقت وہ ہندی روز نامہ جن ستہ کے مدیر تھے اور اس دن ان کے دفتر میں ایک بھی ایسا مسلمان نہیں تھا جو بابری مسجد کے انہدام پر اپنے قلبی رنج وغم کا اظہار کرنے کے لیے موجود ہو۔ان کے مطابق چونکہ میڈیا میں مسلمان بہت کم ہیں اس لیے ان کی جانب سے ایسے مواقع پر کوئی ردعمل سامنے نہیں آتا۔لیکن حوصلہ افزا بات یہ ہے کہ آج ایسے غیر مسلم صحافیوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو قلبی رنج وغم کا اظہار اور الزامات کے جواب میں مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے۔

بی۔رمن ایک ریٹائرڈ سرکاری افسر ہیں۔انہوں نے مدارس میں دہشت گرد پیدا کرنے اور دہشت گردی میں مسلمانوں کے ملوث ہونے کے الزام کا ایسا بھر پور، مدلل اور ثبوتوں کے ساتھ جواب دیا ہے کہ مسلم دشمنوں کے دانت کھٹے ہو گئے ہیں۔انہوں نے ۴ راپریل ۲۰۰۳ کو ریڈف اسپیشل پر ایک مضمون لکھا ہے جس کا عنوان ہے ''القاعدہ ہندوستان میں''۔میں اس کا ایک اقتباس پیش کرنا چاہتا ہوں۔وہ لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں ۱۴ کروڑ مسلمان ہیں مگر ان کی بہت معمولی تعداد دہشت گردی میں ملوث ہے۔اور وہ بھی مختلف اسباب اور مختلف شکایات کی بنا پر دہشت گرد بنے ہیں۔ ورنہ مسلمانوں کی اکثریت دیش بھکت اور ملکی قوانین کی سختی سے پابندی کرنے والی ہے۔مسلمانوں نے اپنے غصے کو کبھی بھی حکومت یا ہندوؤں کے خلاف ابلنے کا موقع نہیں دیا۔اگر جموں وکشمیر کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو ۱۹۸۰ میں دنیا کے الگ الگ ملکوں سے چھ ہزار مسلمان سوویت روس کے خلاف جنگ لڑنے کے لیے افغانستان

گئے تھے اور ان میں ایک بھی ہندوستانی مسلمان نہیں تھا۔ سیکڑوں مسلمان پاکستان کے مدارس میں جہاد کی ٹریننگ لے رہے ہیں اور ان میں ایک بھی ہندوستانی مسلمان نہیں ہے ۔بن لادن کے آئی آئی ایف میں ۱۳ممبر تنظیمیں ہیں جن میں پانچ تنظیمیں پاکستان کی ہیں مگر ایک بھی ہندوستانی تنظیم اس کی ممبر نہیں ہے۔ یہاں تک کہ کشمیر کی بھی کوئی تنظیم اس گروپ میں شامل نہیں ہے ۔افغانستان پر امریکی حملے کے دوران بہت سے مسلمان جنگ لڑنے افغانستان گئے تھے مگر ان میں ایک بھی ہندوستانی مسلمان نہیں تھا۔ کیوبا کے گوانتا ناموبے کے امریکی قید خانے ،ڈیا گوگا رشیا اور افغانستان کے بگرام میں واقع قیدیوں کے مراکز میں سیکڑوں مسلمان بند ہیں جن کی جانچ چل رہی ہے مگر ان میں ایک بھی ہندوستانی مسلمان نہیں ہے۔''

بی رمن ہندوستانی مسلمانوں کے دہشت گرد نہ بننے کا کریڈٹ یہاں کے نظام تعلیم کو دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ غیر ملکی مسلمان بھی جب یہاں تعلیم حاصل کرنے آتے ہیں تو وہ ایک تعمیری ذہن لے کر اپنے ملک واپس جاتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے والا ایک بھی غیر ملکی مسلمان دہشت گرد نہیں بنا ہے ۔صرف ایک واقعہ ایسا ہے جب ۱۹۹۲ء میں ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے والا ایک فلسطینی نوجوان دہشت گرد بنا،اس کے علاوہ کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

مگر مدرسوں کو بدنام کرنے کے لیے جھوٹا پروپیگنڈہ کیسے کیا جاتا ہے اس کی ایک اور مثال یہ ہے کہ انڈیپنڈنٹ میڈیا سینٹر کے مسٹر روہت نے ۱۰/مارچ ۲۰۰۳ کو ''سیکولرزم کیا ہے'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا جس میں بقول ان کے ''مغربی بنگال کے ایک مدرسہ میں ۲۰ ہندو خواتین کی عصمت دری کی گئی، بنگال کی کمیونسٹ حکومت ہندوؤں کے تحفظ میں کیا کر رہی ہے''۔ یہ مضمون جس دن انٹرنیٹ پر آیا اسی دن اس حوالے سے درجنوں خطوط مسلمانوں کے خلاف انٹرنیٹ پر

آ گئے۔

ایس۔ گورومورتی کے جس مضمون کے اقتباسات اوپر پیش کیے گئے ہیں اس کا زبردست پوسٹ مارٹم مینا کنڈا سوامی نے کیا ہے اور ان کے ایک ایک الزام کی دھجی بکھیر کر رکھ دی ہے۔ مینا کنڈا سوامی دلت میڈیا نیٹ ورک سے شائع ہونے والے دو ماہی رسالہ ''دلت'' کی ایڈیٹر ہیں۔ انھوں نے ۵؍مئی ۲۰۰۲ء کو انٹرنیٹ پر لکھے گئے اپنے طویل مضمون میں گورومورتی کو آڑے ہاتھوں لیا ہے اور لکھا ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ گجرات میں مسلم کش فسادات برپا تھے، مسلمانوں کے خلاف ایسے اشتعال انگیز مضمون کی اشاعت کی اجازت کیوں دی گئی۔ انھوں نے اس پر بھی سوال اٹھایا ہے کہ انٹلی جنس ایجنسیوں کی انتہائی خفیہ رپورٹوں تک ان کی رسائی کیسے ہوئی، کیا وہ سی بی آئی کے آدمی ہیں۔ بقول ان کے مسلمانوں کے خلاف بھگوا سازش میں انٹلی جنس ایجنسیوں کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

مینا کنڈا سوامی نے لکھا ہے:

> ''سنگھ پریوار کے لوگ خفیہ رپورٹوں کے صرف انہی حصوں کو استعمال کرتے ہیں جو ان کے پروپیگنڈہ کو سوٹ کرتے ہوں۔ جو باتیں مسلمانوں کے حق میں ہوتی ہیں ان کو بڑی عیاری اور مکاری کے ساتھ نظر انداز کر دیا جاتا ہے''۔

اس سلسلے میں انھوں نے کشمیر کے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے۔ راجندر کی رپورٹ کے ایک اقتباس کا حوالہ دیا ہے جو کشمیر کے مدارس کی چھان بین کے بعد تیار کی گئی تھی۔ اس میں کے۔ راجندر نے لکھا ہے کہ ہم نے ایک بھی ایسا دہشت گرد نہیں پکڑا ہے جو مدرسہ بیک گراؤنڈ کا ہو۔ ۲۵؍اپریل ۲۰۰۱ء کو انڈین ایکسپریس میں شائع اس رپورٹ میں کہا گیا ہے:

> ''کشمیر میں مدرسوں کے چلنے پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ یہ پاکستان کے ان مدارس کی مانند نہیں ہیں جو جہادی فیکٹری بن گئے ہیں۔ جموں و کشمیر پولیس، فوج اور بی ایس ایف نے جانچ کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے

وہ یہ ہے کہ ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا جس سے دہشت گردی کے پھیلاؤ میں مدرسوں کی شمولیت کا کوئی اشارہ ملتا ہو۔ انکوائری رپورٹ میں کہا گیا کہ وادی میں موجود ان مدارس نے خود کو دہشت گردی سے دور رکھا ہے اور ان میں صرف مذہبی تعلیم پر توجہ دی جاتی ہے''۔

بینا کنڈ اسوامی کے مطابق ایسی رپورٹوں کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے اور صرف ان چیزوں کو لیا جاتا ہے جو مدرسوں کی امیج کو مسخ کر سکیں۔ پھر ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے والے سیاستداں ان کو لپک لیتے ہیں اور پھر میڈیا میں آنے والا جھوٹ رفتہ رفتہ سچ کا لبادہ پہن لیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے:

''مدرسوں میں معصوم بچوں کے کچے ذہنوں کو دہشت گردی کی تعلیم دینے کا الزام لگانے والے عناصر آر ایس ایس کے اداروں پر نظر کیوں نہیں ڈالتے۔ وہاں جنگجوئیت کی جو مشق کرائی جاتی ہے اس کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ لاٹھی چلانے، مارچ کرنے، جسمانی ورزش اور دیش بھکتی کی آڑ میں اقلیتوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کو کیوں نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ کم از کم مدرسوں میں تو ہتھیار چلانے کی ٹریننگ نہیں دی جاتی۔ مسجدوں کو ہتھیاروں کا اسٹور ہاؤس کیوں کہا جاتا ہے کیا ان کے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے''۔

اسی طرح روزنامہ راشٹریہ سہارا کے ہندی اور اردو کے ایڈیشنوں میں رویندر پنڈیا کا ایک مضمون چھپا ہے جس میں انھوں نے مدرسوں کے خلاف مغربی میڈیا کی سازش کی قلعی کھولی ہے۔ اس مضمون کا عنوان ہے ''مدرسے اور مغربی میڈیا کی شرارت وسازش''۔ اس میں انھوں نے لکھا ہے:

''مغربی میڈیا کے پروپیگنڈے کے نتیجے میں بیشتر غیر مسلموں کی یہ عام رائے بن گئی ہے کہ مدرسوں کا دہشت گردی سے گہرا تعلق ہے۔ جبکہ

حقیقت یہ ہے کہ یہ مدرسے مذہبی تعلیم دیتے ہیں اگر کہیں ہتھیاروں کی تعلیم دی جاتی ہے تو وہ ادارے سب کچھ ہو سکتے ہیں مدرسے نہیں ہو سکتے۔ مدرسوں میں تو سبھی مسلمان جاتے ہیں تو کیا سبھی مسلمان دہشت گرد کہے جائیں گے اور جب ایسا نہیں ہے تو مسلسل پروپیگنڈے کے ذریعے لوگوں کی ایسی ذہنیت کیوں بنائی جارہی ہے...... یہ ممکن ہے کہ مدرسہ چلانے والے کچھ لوگ دہشت گردوں سے ملے ہوں ایسے لوگوں کے خلاف کارروائی ہونی چاہیے مگر عام طور پر تمام مدارس کو بدنام کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ تمام مدارس کو بند کرنے کا مطالبہ کرنا اور ان کو ملک کے لیے خطرہ بتانا غلط اور نامناسب ہے''۔

روبندر پنڈیا سوال کرتے ہیں کہ دہشت گرد تو ریل گاڑی، ہوٹل، سرکاری دفتر، فوج، پولیس، ہوائی جہاز اور تقریباً ہر ممکنہ جگہ پر پکڑے گئے ہیں تو صرف مدرسوں کو ہی کیوں قصوروار بتایا جاتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا میڈیا بھی مغربی میڈیا کے پرچار میں بغیر سوچے سمجھے شریک ہو گیا ہے۔ انھوں نے متنبہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ مدرسوں کو ہندوستانی تہذیب کی روایات کے مطابق مسلم سماج کے مذہبی دستور کی حیثیت میں قبول کیے جانے کی ضرورت ہے۔ ساتھ ہی مغربی میڈیا کب اور کہاں کس مقصد سے کیا پھیلاتا ہے اس کے پس پردہ شرارتوں کو بھی سمجھتے رہنے کی ضرورت ہے۔

میڈیا کے اس دوسرے پہلو کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ اگر کسی قابل اعتراض مضمون یا رپورٹ پر سنجیدہ اور مدلل انداز میں ردعمل ظاہر کیا جائے اور اس کا جواب دیا جائے تو میڈیا اس کو بھی شائع کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دو کوششیں ناکام ہو جائیں مگر مسلسل کوشش سے کامیابی مل جاتی ہے۔

جب سے اس قسم کا پروپیگنڈہ تیز ہوا ہے مدارس و مساجد پر پولیس اور خفیہ ایجنسیوں کی نظریں گڑ گئی ہیں اور وہ ان کی جاسوسی کرنے لگی ہیں۔ پرانی دہلی میں واقع ایک مسجد کے متولی نے

اس سلسلے میں بتایا کہ کس طرح انھوں نے ایسے ہی ایک جاسوس سے نجات حاصل کی تھی جو عشاء کی نماز کے بعد گیارہ بجے تک نفلیں پڑھا کرتا تھا اور کس طرح رات میں مشکوک لوگ رات گزارنے کی درخواست لے کر مسجد میں آتے تھے۔ مرکز میں این ڈی اے حکومت کے دوران ایسے واقعات زیادہ ہوتے تھے البتہ جب سے یو پی اے حکومت قائم ہوئی ہے، اس قسم کی سرگرمیاں کم ہوگئی ہیں اور اب مدارس والے بھی باہری بچوں کو بہت زیادہ جانچ اور چھان بین کے بعد ہی داخل کرتے ہیں۔ مساجد میں تو انجان لوگوں کو رات میں قیام کرنے کی بالکل اجازت نہیں دی جاتی کہ پتہ نہیں کون کس بھیس میں کیا نکل آئے۔ لیکن اس کے باوجود یہ پروپیگنڈہ بدستور جاری ہے کہ مدرسے اور مسجدیں دہشت گردوں کے مراکز ہیں۔ تاہم اطمینان بخش بات یہ ہے کہ ملک میں ایسے بیشتر حق گو اور سیکولر لوگ موجود ہیں جو اس پروپیگنڈہ کا دنداں شکن جواب دیتے ہیں اور یہ لوگ جب تک موجود ہیں میڈیا پر مجموعی طور پر یہ یکطرفہ الزام نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ آنکھ بند کر کے مدرسوں اور مسجدوں کے خلاف پرچار کر رہا ہے اور وہ مدرسوں و مسجدوں کا دشمن ہے۔

میڈیا اور عالم اسلام

''میڈیا اور ہمارا معاشرہ'' کے عنوان کے تحت ایک مضمون میں اس کا جائزہ لیا گیا ہے کہ میڈیا کس طرح ہمارے سماج کو متاثر کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ اب ہماری اپنی پسند و ناپسند نہیں رہ گئی ہے، بلکہ اب اس کا فیصلہ میڈیا کرتا ہے۔ یہ صورت حال صرف ہندوستان میں ہی نہیں ہے بلکہ عالم اسلام بھی اس سے دو چار ہے۔ یہاں تک کہ سعودی عرب جیسے اسلامی ملک میں بھی الیکٹرانک و پرنٹ میڈیا بری طرح چھایا ہوا ہے اور وہاں بھی لوگوں کی پسند و ناپسند کا فیصلہ میڈیا ہی کرتا ہے۔ جن لوگوں نے سعودی عرب میں کچھ سال گذارے ہیں یا جو اب بھی وہاں رہ رہے ہیں ان کے تجربات یہ گواہی دیتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا نے سعودی معاشرہ میں بے حیائی و بے شرمی کو بری طرح رواج دیا ہے اور اس نے مغرب کی نقالی کو ایک فیشن میں تبدیل کر دیا ہے۔ وہاں لوگ لاکھوں ڈالر خرچ کر کے ان برائیوں کو خریدتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ بھی فیشن ایبل اور فیشن پرست ہیں وہ پسماندہ اور دقیانوسی نہیں بلکہ ماڈرن اور ترقی یافتہ ہیں۔

عالم اسلام کی ایک مقتدر شخصیت مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ نے کئی سال قبل اپنی ایک شہرہ آفاق تصنیف ''حجاز مقدس اور جزیرۃ العرب امیدوں اور اندیشوں کے درمیان'' میں لکھا تھا:

''آج کا مسلم نوجوان ایک تلخ تجربہ اور خطرناک کشمکش سے لڑ رہا ہے وہ وزارتِ نشریات صحافت اور ٹیلی ویژن سے انتشار انگیز ترغیبات و رہنمائی سے دو چار ہوتا ہے اور ایسے نشریاتی پروگرام سنتا ہے جو اسلامی تربیت کے بچے کھچے اثرات کو بھی مٹا دینے پر تلے ہوئے ہیں ...... اخبارات و رسائل صبح صبح اسے متعفن و مسموم غذا فراہم کرتے ہیں اور کچھ اور پڑھنے سے پہلے جذبات کو برانگیختہ کرنے والا سامان مہیا کر دیتے ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلے جن چیزوں پر اس کی

نگاہ پڑتی ہے وہ شہوانی تصویریں، ہیجان پرور عنوانات، شک وشبہ پیدا کرنے اور ایمان ویقین کو کمزور کردینے والے مقالات ہوتے ہیں''۔

مولانا علی میاں ندویؒ نے یہ تجزیہ کئی سال قبل کیا تھا اگر آج وہ زندہ ہوتے اور موجودہ میڈیا کی صورت حال کا جائزہ لیتے تو کیا کہتے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح شورش کاشمیری اپنی تصنیف ''شب جائے کہ من بودم'' میں لکھتے ہیں:

''جدہ میں اب صرف دو چیزیں عرب ہیں ایک زبان دوسرے اذان۔ باقی ہر چیز پر غیر عرب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ ان کی ذہنی رگوں سے جس طرح لہو نچڑ رہا ہے اور ان کے دماغ کے سوتے جس طرح خشک ہورہے ہیں وہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی عقلیں گنگ ہوکر رہ گئی ہیں ان کے الفاظ عرب ہیں ان کے افکار عرب نہیں۔ وہ اپنی روایتوں کو بھی یوروپ کے سہارے زندہ کررہے ہیں اور شمشیر وسناں سے طاؤس ورباب میں داخل ہورہے ہیں......اب ان میں عمر بن خطاب تو کیا حجاج بن یوسف بھی پیدا نہیں ہوتا جو پکی فصلیں کاٹنے پر قادر ہو......اذان ہوتی ہے لیکن رسم اذان ہے روح بلالی نہیں، ان کی خواب گاہوں میں ٹیلی ویژن اور ریڈیو آ گئے ہیں ان کی گھٹی میں عرب ملکوں کی شہرہ آفاق گانے والیوں کے سُر اور دھنیں پڑی ہیں۔ ان کے خون میں کبھی طیش تھا اب عیش سما گیا ہے۔ جس کا آغاز ہاجرہ (ام اسماعیل) سے ہوا تھا اس قوم کا خاتمہ ام کلثوم (مصری مغنیہ) پر ہوگیا''۔

ان دونوں اقتباسات کی روشنی میں اگر عالم اسلام کی صبح وشام کا جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ان کا ایک ایک لفظ سچا ہے اور واقعی میڈیا نے عربوں سے ان کی دینی حمیت چھین لی ہے۔ (یہ صرف عربوں کا معاملہ نہیں ہے بلکہ پوری دنیا کے مسلمانوں کا ہے) ڈش اینٹینا اور غیر ملکی ٹی وی چینلوں نے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کے مزاج کو تبدیل کردیا ہے اور دس سال سے پچیس سال تک کے لوگوں کی اسّی فیصد تعداد ایسی ہے جو ٹی وی کے پروگراموں کے اثرات قبول کررہی ہے۔ ان پروگراموں میں کارٹون پروگرام سے لیکر فلمیں اور سیریل تک شامل ہیں۔ سعودی معاشرے کا جائزہ لینے والوں کا یہاں تک کہنا ہے کہ ان پروگراموں کے سبب ہی سعودی

عرب، مصر اور کویت میں جنسی خواہشات کی ناجائز تکمیل کے واقعات، عصمت دری، قتل اور تشدد اور دیگر جرائم پنپ رہے ہیں اور کیسٹوں کے ذریعہ فحش پروگراموں کو قبول عام حاصل ہو گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق سعودی عرب میں ہر ماہ امریکہ اور جاپان میں بنے ہوئے ستر ہزار سے اسّی ہزار تک ویڈیو اور ایک لاکھ آڈیو فروخت ہوتے ہیں۔ ایک دوسری رپورٹ کے مطابق مصری روز نامہ الاسلام نے ۱۹۸۴ میں عرب اور فرانس میں ٹی وی اور ویڈیو کیسٹ کی موجودگی کا موازنہ کیا تھا اور نتائج انتہائی چونکا دینے والے تھے۔ اس موازنہ کے مطابق ''فرانس میں فی ایک ہزار افراد پر دس وی سی آر سیٹ ہیں جبکہ کویت میں ہر ایک ہزار افراد پر چار سو پچاسی وی سی آر سیٹ ہیں''۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کویت اور سعودی عرب میں اب یہ تناسب سو فیصد کا ہو گیا ہے۔ اگر ٹی وی سے عالمی حالات و واقعات سے باخبر ہونے اور ان کی روشنی میں اپنے اندر اصلاحات کا کام کیا جاتا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے بلکہ یہ اچھی بات ہے لیکن اگر اس سے اچھائیوں کو چھوڑنے اور برائیوں کو اختیار کرنے کا رواج بڑھ رہا ہے تو پھر کیا کہا جا سکتا ہے۔

مغربی میڈیا نے سعودی عرب میں کس قدر فحاشی اور سماجی و جنسی انارکی پیدا کی ہے اس کا تجزیہ تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس معاشرے پر نگاہ رکھتے ہوں لیکن اس سلسلے میں اخبارات و رسائل میں کبھی کبھی اصلاحات افزا چیزیں شائع ہو جاتی ہیں۔ ریاض سے شائع ہونے والا رسالہ الدعوا کا دعوہ ہے کہ میڈیا نے سعودی خواتین میں فیشن کو بری طرح رواج دیا ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ خواتین جینس اور اسکرٹ پہنتی ہیں اور اوپر سے باریک کپڑے کا برقعہ ڈال لیتی ہیں۔ اس نے ریاض کی خواتین کا ایک سروے کرایا تھا اور ڈش اینٹینا کی آمد سے سعودی معاشرے پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا تھا۔ ۱۹۹۷ میں کرائے گئے اس سروے کے نتائج نہ صرف چونکا دینے والے تھے بلکہ تشویش میں مبتلا کر دینے والے تھے۔

سروے کے نتائج کے مطابق:

☆ ۴۴ فیصد سعودی خواتین نے فیشن ایبل لباس پہننا شروع کر دیا ہے۔

☆ ۳۸ فیصد خواتین ایسے لباس پہن کر بازار جاتی ہیں۔

☆ ۸۱ فیصد خواتین کے والدین اور شوہر یہ لباس پسند نہیں کرتے اس کے باوجود وہ انہیں پہنتی ہیں۔

☆ ۳۵ فیصد خواتین کے والدین اور شوہر ان لباسوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

☆ ۶۰ فیصد عورتیں ان لباسوں کو فیشن سمجھ کر پہنتی ہیں۔

☆ پچاس سال سے زائد عمر والی متعدد خواتین بھی یہ لباس پہنتی ہیں۔

☆ ساٹھ سال کی بعض خواتین نے بتایا کہ وہ ایک سال سے ایسا لباس پہن رہی ہیں (خیال رہے کہ یہ سروے ۱۹۹۷ کا ہے)

☆ ۸۵ فیصد خواتین کے مطابق اپنے رشتہ داروں کو دیکھ کر ٹی وی پر دیکھ کر شوروم میں رکھے ایسے لباسوں کو دیکھ کر انہیں یہ لباس پہننے کا شوق پیدا ہوا ہے۔

☆ ۶۱ فیصد نے کہا کہ ہمیں ان لباسوں سے بالکل ندامت نہیں ہوتی۔

☆ البتہ ۳۹ فیصد نے ندامت کی بات کہی۔

☆ ۶۵ فیصد کے مطابق ان کے شوہروں اور والدین نے انہیں روکا نہیں۔

☆ ۶ سال سے بیس سال تک کی لڑکیاں تنگ جینس اور بغیر بازو کی قمیص پہنتی ہیں اور اوپر سے باریک برقعہ ڈال لیتی ہیں۔

☆ ۴۵ فیصد خواتین مغربی رقص اور گانے پسند کرتی ہیں۔

☆ ۶۵ فیصد مغربی کھانے اور ۹۵ فیصد مغربی مشروبات پسند کرتی ہیں۔

☆ اخبار کے مطابق فیشن پرست لباس کی تعریف یہ ہے کہ جو مغربی طرز کا چست لباس ہو اور جو جسم کو ڈھانکنے کے بجائے اسے نمایاں کر کے دکھاتا ہو۔

یہ ڈش انٹینا کی کرامات اور مغربی میڈیا کی برکتیں ہیں کہ خواتین فیشن کے سیلاب میں بہی جارہی ہیں۔ ڈش انٹینا کیا کیا گل کھلاتا ہے اس کی وضاحت تو وہی لوگ کر سکتے ہیں جو سعودی عرب یا دوسرے اسلامی ملکوں میں رہ رہے ہیں۔ تاہم ایک شاعر ڈاکٹر حنیف ترین نے جو کہ بیس پچیس

سال سے سعودی عرب میں مقیم ہیں اس انداز میں ڈش انٹینا کی تباہیوں کا نقشہ کھینچا ہے :

یہ ڈش انٹینا پردے پر سجا کر روز لاتا ہے
بلیو فلمیں
علی الاعلان دنیا کو دکھاتا ہے
(مرے اندر کے انساں کو جلاتا ہے چڑاتا ہے)
نیا کلچر عطا کرنے کی کوشش میں
سریلے گیت گاتا ہے
تباہی جو تھی ہم سے دور
اسے نزدیک لاتا ہے
یہ ڈش انٹینا راتوں میں جگاتا ہے
یقیناً چھین کر اک دن یہ تہذیب وتمدن کو
ہلاکت خیزیوں کی اک نئی بنیاد رکھے گا
زمانے بھر کو پھر حیواں بنا دے گا۔

بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ وہ وقت آ گیا ہے اور ڈش انٹینا نے انسانوں کو حیوان بنا دیا ہے۔ اور بقول شورش کاشمیری ''میں نہیں کہہ سکتا کہ عرب کا نیا خون کب اسلام کا ساتھ دے گا اور اسلام کب تک انہیں ساتھ لے کر چلے گا۔ وہ قیامت ضرور آنی چاہئے اور آ کر رہے گی جس کی خبر قرآن نے دی ہے''۔

کویت کے ہفت روزہ جریدہ ''**المجتمع**'' نے عرب ممالک میں امریکی فلموں کی درآمد کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ڈش انٹینا کے اس دور میں جبکہ براہ راست ۳۵ چینلوں سے (اب تو ان کی تعداد اور بڑھ گئی ہے) عرب کے باشندے اپنی مرضی کا پروگرام دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود امریکی فلمیں گراں قدر رائلٹی دیکر سرکاری سطح پر منگوائی جاتی ہیں۔ رسالے نے جو تفصیلات

دی ہیں وہ یوں ہیں:

مصر میں ۸۵ فیصد امریکی فلمیں دکھائی جاتی ہیں اردن میں ۶۵،عرب امارات میں ۷۷،ٹونس میں ۷۸،الجزائر میں ۷۹،مراکش میں ۸۲ اور کویت میں ۷۷ فیصد۔ ہر مہینے ممنوعہ ویڈیوز کے چار سو کیسٹ عرب ملکوں میں خفیہ طریقے سے درآمد کئے جاتے ہیں۔ بچوں کے ۸۹ فیصد پروگرام امریکہ اور جاپان سے بنوا کر منگوائے جاتے ہیں۔ جن میں فلمیں، سیریل، کارٹون اور دیگر پروگرام شامل ہیں ۔''مغربی میڈیا اور اس کے اثرات'' میں نذر الحفیظ لکھتے ہیں کہ بارہ اسلامی ممالک ۵۰ فیصد ٹی وی اور ویڈیو پروگرام مغربی ملکوں سے درآمد کرتے ہیں دس ممالک ایسے ہیں جو ۶۵ فیصد ٹی وی ویڈیو پروگرام مغربی ملکوں سے درآمد کرتے ہیں چار ممالک ۸۰ فیصد اور نو ممالک ۷۲ فیصد پروگرام مذکورہ ملکوں سے درآمد کرتے ہیں۔ مسلم ملکوں میں سرکاری میڈیا جو پروگرام دکھاتا ہے وہ مغربی ملکوں میں تیار کئے جاتے ہیں اور وہ ڈیڑھ لاکھ سے لے کر دو لاکھ گھنٹے تک کے ہوتے ہیں ان کی رائلٹی لاکھوں اور کروڑوں ڈالر میں ادا کی جاتی ہے۔

اسی طرح قاہرہ کے روزنامہ ''الاہرام'' نے مصر میں ریڈیو ٹی وی اور سینما کے پروگراموں کی تفصیل شائع کی ہے۔ خیال رہے کہ یہ اشاعت دسمبر ۱۹۹۵ کی ہے۔ اس کے مطابق قاہرہ ٹیلی ویژن کے پروگرام کی تفصیل یوں ہے:

پہلا چینل: ۱۹ گھنٹے، دوسرا چینل: ۱۹ گھنٹے، تیسرا چینل: ۱۲ گھنٹے، چوتھا چینل: نو گھنٹے، پانچواں چینل: ۱۵ گھنٹے، چھٹا چینل: ۱۰ گھنٹے، ساتواں چینل: ۴ گھنٹے، نیل ٹی وی: ۸ گھنٹے، ڈش انٹینا کے ذریعہ دیگر چینل اور مغربی پروگرام: ۲۴ گھنٹے، ایم بی سی مڈل ایسٹ براڈ کاسٹنگ سنٹر لندن: ۱۲ گھنٹے۔

قاہرہ ریڈیو پروگراموں کی تفصیل: ریڈیو قرآن: ۱۹ گھنٹے، جنرل پروگرام: ۲۲ گھنٹے، صوت العرب: ۲۰ گھنٹے، الشرق الاوسط: ۱۶ گھنٹے۔ (یہ تمام یومیہ تفصیلات ہیں۔)

قاہرہ میں ۲۲ سینما گھر، پانچ ڈرامہ ہال، پچیس نائٹ کلب، اور آٹھ نہری کلب ہیں جو دریائے نیل کی سطح پر رواں کشتیوں پر غیر ملکی سیاحوں کے لئے ہیں۔ قاہرہ کے سینما گھروں میں یومیہ

۱۲۵ امریکی، آٹھ فرانسیسی اور چھ ہندوستانی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ مجموعی طور پر صبح ساڑھے آٹھ سے رات ساڑھے بارہ بجے تک ۳۹ غیر ملکی فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔ مصری ٹی وی کے تمام چینلوں سے یومیہ چھ امریکی، ایک فرنچ، دو ہندوستانی، چھ عربی سیریز اور دو عرب ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں۔ ریڈیو قاہرہ سے بھی فلموں کے مکالمے، سیریل اور ڈرامے پیش کئے جاتے ہیں۔ (استفادہ۔ گلوبلائزیشن اور عالم اسلام: عبدالرزاق عبدالغفار سلفی)

عالم اسلام کا الیکٹرانک میڈیا

ملکوں کے نام:	ریڈیو سنٹر
آذربائیجان:	ریڈیو ٹیلی ویژن کمپنی آذربائیجان، باکو(۱۹۲۶ء)، آذربائیجانی، انگریزی اور ترکی میں نشریات۔
اُردن:	اردن ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشن (عمان ریڈیو)۔
اری ٹیریا:	ایک ریڈیو اسٹیشن اسمارا میں۔
ازبکستان:	ازبک ریڈیو (تاشقند) قیام ۱۹۴۷ء۔
افغانستان:	دی وائس آف شریعہ۔ صوبہ کابل کا بلخ ریڈیو مزار شریف میں اور تخار کا ملوکان میں۔
البانیہ:	۱۹۹۱ء میں حکومتی کنٹرول سے نکل گیا۔ ریڈیو ترانہ، علاقائی اسٹیشن Shkodar اور Kukes` Gjirokaster Korces کونٹیک ریڈیو (Contact Radio) ترانہ اکتوبر ۱۹۹۷ء۔

الجزائر:	عربی نیٹ ورک ، فرانسیسی نیٹ ورک، کیبل نیٹ ورک او رریڈیو الجزائر۔
انڈونیشیا:	قومی ریڈیو اسٹیشن کا نام ریڈیو پبلک انڈونیشیا ہے۔ یہ ۲۴ گھنٹے پروگرام نشر کرتا ہے۔
ایران:	وائس آف اسلامک ریپبلک آف ایران (اس کے تین قومی چینل ہیں)۔
بحرین:	بحرین ریڈیو اینڈ ٹی وی کارپوریشن، ریڈیو بحرین (۱۹۷۷ء) منامہ۔
برکینافاسو:	براڈکاسٹنگ ریگولر اتھارٹی، ریڈیو برکینافاسو(۱۹۵۹ء) ریڈیو بوبوڈیلولاسو فرانسیسی اور لوکل پروگرام ریڈیو ہاریزن الف ایل فرانسیسی اوگادوگو۔
برونائی دارالسلام ریڈیو:	ریڈیو ٹیلی ویژن برونائی (۱۹۵۷ء) پانچ ریڈیو اسٹیشن چار ملائی میں پانچواں انگریزی میں پروگرام نشر ہوتا ہے۔
بنگلہ دیش:	ڈھاکہ چٹا گانگ، کھلناراج شاہی، رنگپور، سلہٹ، رنگامتی، ''کومیلا'' ٹھاکرگاؤں پروگرام سات زبانوں میں نشر ہوتے ہیں۔
بوسنیااور ہرزےگووینا:	کروٹ ریڈیو ہرزیگ بوسنیا ریڈیو کامیلیو (Kameleo) تزلا ۱۹۹۲ءآزاد ریڈیو بوسنیا ہرزیگووینا(۱۹۶۹ء)۔
بینن:	سرکاری ریڈیو بینن (کوٹونو) ریڈیو اسٹار (نجی)۔
پاکستان:	۲۴ ریڈیو اسٹیشن، سب سے بڑا اسلام آباد ۱۰۰۰ کلوواٹ کا۔

تاجکستان: سرکاری اسٹیٹ ٹی وی ریڈیو براڈکاسٹنگ کمپنی آف تاجکستان، تاجک ریڈیو۔

ترکمانستان ریڈیو ترکمانستان (سرکاری) اشک آباد، ترکمان ریڈیو اشک آباد۔

ترکی: ترکی ریڈیو، ٹیلی ویژن کارپوریشن، وائس آف ترکی ۵۰ لوکل ریڈیو اسٹیشن۔

تیونس: ریڈیو ٹی وی تیونس۔

ٹوگو: ریڈیو ٹوگو، (۱۹۵۳ء) 'لومے' انٹرنیشنل، ریڈیو ٹوگوقومی لومے (۱۹۷۴ء) پرائیویٹ ریڈیو۔

جبوتی: ریڈیو ٹی وی جبوتی۔

چاڈ: ریڈیو نیشنل چاڈ۔

سری نام: یہاں ریڈیو کے بہت سے ادارے ہیں جن میں ایپی براڈکاسٹنگ کارپوریشن ریڈیو یارامایبوکارابراڈکاسٹنگ کمپنی، ریڈیواپین ٹائی (Apin Tie) قابل ذکر ہیں۔

سعودی عرب: سعودی عریبین براڈکاسٹنگ سروس ریاض، سعودی آرامکو ایف ایم ریڈیو ۲۴ میڈیم وشارٹ ویو ریڈیو اسٹیشن۔

سوڈان: (سرکاری) سوڈان نیشنل براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، اپوزیشن وائس آف لبرٹی (۱۹۹۸ء)۔

سیرالیون: سیرالیون براڈکاسٹنگ سروس (۱۹۳۴ء)۔

سینی گال: ریڈیو ڈاکار ۱۹۷۲ء برانچیس سیٹ لوئی ، زگینکار (Ziguinchor) ٹمباکونڈااورکاورک ایف ایم ۹۴۔

شام: ریڈیو شام دمشق، پروگرام عربی، فرانسیسی، انگریزی، روسی، جرمن، ہسپانوی، پرتگالی، عبرانی، پولش، ٹرکش وغیرہ۔

صومالیہ: ریڈیو قرآن موگا دیشو (۱۹۹۶ء) ریڈیو فری صومالیہ (۱۹۹۳ء) ریڈیو موگا دیشو وائس آف پیس (۱۹۹۳ء)

عراق: ریڈیو بغداد ریڈیو عراق انٹرنیشنل بغداد۔

عمان: ریڈیو سلطنت عمان، ریڈیو صلالہ۔

فلسطین اتھارٹی: فلسطینی براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، صوت فلسطین (۱۹۹۴ء) عربی ریڈیو اسٹیشن اریحا اور رملہ۔

قطر: قطر (QBS) سرکاری، قیام ۱۹۶۸ء دوحہ۔

کرغستان: نیشنل ٹیلی ویژن ریڈیو براڈ کاسٹنگ کمپنی، کرغیز ریڈیو (۱۹۳۱ء) ڈام ریڈیو (Dom) ریڈیو پرامٹد، شلیک، سوودروز یستوفو (Sodruzhestovo) ۱۹۹۶ء نیز کئی اور پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن بھی ہیں۔

قازقستان: کزاخ اسٹیٹ ٹیلی ویژن اور ریڈیو براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (۱۹۲۳ء) الماتی، نجی ریڈیو اسٹیشنوں نے (۱۹۹۰ء) کی دہائی میں کام کرنا شروع کیا۔

کومورو: ریڈیو فرانس انٹرنیشنل سے کومورو کے لئے نشریات کا سلسلہ ۱۹۹۴ء میں شروع ہوا۔ ۱۹۹۸ء میں متعدد پرائیویٹ ریڈیو اسٹیشن قائم کئے گئے۔

کویت: ریڈیو آف اسٹیٹ آف کویت (۱۹۵۱ء) نشریات روزانہ ستّر گھنٹوں کے لئے ہیں عربی فارسی اردو اور انگریزی۔

کیمرون: ریڈیو بوئیا(Boea) ریڈیو ڈولا، ریڈیو گیروا(garoua)۔

گنی: ریڈیو ٹیلی ویژن گنی، ریڈیو نشریات فرانسیسی، انگریزی، کریول، عربی اور پرتگالی میں دیہی علاقوں میں ریڈیو اسٹیشن قائم کئے جا رہے ہیں۔

گنی بساؤ: ریڈیو ڈی فیوزاؤ نیشنل داری پبلیکا دا گنی بساؤ (سرکاری) ریڈیو بامبولوم (۱۹۹۶ء) اور ریڈیو پجگویٹی (Pidkiguiti) ۱۹۹۵ء۔ علاقائی ریڈیو اسٹیشن بفاتا، کاتیو میں ہیں۔

گیبون: ریڈیو ڈی فیوژنٹیلی ویژنگیبو نیز لیبرے ویل قیام ۱۹۵۹ء ریاستی کنٹرول میں ریڈیو فریکونس (۱۹۹۶ء) ریڈیو مندارین (۱۹۹۵ء) ریڈیو نائٹ (۱۹۹۶ء)۔

گیمبیا: گیمبیا ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن سروسز (۱۹۶۲ء) انگریزی، منڈنکا وولوفا، فولا، سریرا اور سیراہولی زبانوں میں نشریات ہوتی ہیں۔ ریڈیو ایف ایم (۱۹۹۰ء) اور ریڈیو سیڈ (SYD) بھی ہیں۔

لبنان: ریڈیو لبنان سرکاری ریڈیو ہے۔ یہ بیروت میں ۱۹۳۷ء میں قائم ہوا۔ عربی، پرتگالی، آرمینیائی، ہسپانوی، انگریزی، اور فرانسیسی میں نشریات ہوتی ہیں۔

لیبیا: گریٹ سو شلسٹ پیپلز لیبین عرب جماہیر یہ براڈ کاسٹنگ کارپوریشن (۱۹۵۷ء) طرابلس عربی اور انگریزی پروگرام بن غازی (۱۹۷۱ء) وائس آف افریقہ طرابلس اسکا پرانا نام وائس آف دی گریٹ عرب ہوم لینڈ تھا۔ ۱۹۹۸ء میں تبدیل کیا گیا۔

ماریطانیہ: ریڈیو ڈی ماریطانیہ نواکشوٹ (۱۹۵۸ء) ۵ ٹرانسمیٹر ہیں۔ نشریات عربی، فرانسیسی، وولوف اور ٹوکولیر۔

مالدیپ: وائس آف مالدیپ مالے (۱۹۶۲ء)۔

مالی: ریڈیو ڈی فیوژن ٹی وی مالین (۱۹۵۷ء) نشریات فرانسیسی بمبارا، موروش وولوف، انگریزی زبانوں میں۔ ریڈیو بمباکو۔

متحدہ عرب امارات: ابوظہبی ریڈیو، کیپٹل ریڈیو، دوبئی ریڈیو اینڈ کلر ٹی وی۔ راس الخیمہ براڈکاسٹنگ، ام القوین براڈکاسٹنگ، یواے ای ریڈیو اینڈ ٹی وی۔

مراکش: ریڈیو ڈی فیوژن موراکن۔ نشریات فرانسیسی، عربی، ہسپانوی ریڈیو میڈیٹرینی انٹرنیشنل۔

مصر: ایجپشین ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن یونین (ERTU) ۱۹۲۸ء۔ نشریات انگریزی، عربی، فرانسیسی، سواحلی، ترکی، عبرانی، انڈونیشی، اردو، جرمن، تھائی، ہندی، فارسی، زولو، اطالوی، افاروغیرہ۔

ملائیشیا: ریڈیو ملایا (یکم اپریل ۱۹۴۶ء) نام کی تبدیلی ریڈیو ملائیشیا ۱۶ ستمبر ۱۹۶۳ء ۲۱ ریڈیو اسٹیشن (اہم) کولا باہرو، کولاترنگانو، کوانٹن جوہور باہرو ملاکا ایوہ پولان پینانگ، الور، بیٹار، کوالالامپور۔

موزمبیق: ریڈیو موزمبیق میوتو (۱۹۷۵ء) نشریات پرتگیزی، انگریزی اور مقامی زبانوں میں، ریڈیو ٹیرا اوردی اور ریڈیو میرامار (Miramar)

۔

نائیجیریا: فیڈرل ریڈیو کارپوریشن آف نائیجیریا (۱۹۷۸ء) وائس آف نائیجیریا (۱۹۹۰ء) ریڈیو قدرت (Kudrat) حزب مخالف کا ترجمان۔

نیجر: ریڈیو ڈی فیوژن ڈونیــــــجــــــر نیامے۔ لاؤنس ڈوساحل نیامے (۱۹۵۸ء) ریڈیو تینرے (Tenere) نیالے۔

یمن:	یمن ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشن صنعا۔
یوگنڈا:	۳۔۹۱ کیپٹل ایف ایم کمپالا (۱۹۹۳ء) سنٹرل براڈ کاسٹنگ سروس (۱۹۹۶ء) ریڈیو یوگنڈا کمپالا (۱۹۹۴ء) سینو ریڈیو (Sanyu) (۱۹۹۳ء)

ملکوں کے نام	ٹی وی چینلز
آذربائیجان:	آذر بائیجان نیشنل ٹی وی باکو (۱۹۹۶ء) بی ایم ٹی۔ا، ٹی وی باکو (۱۹۹۳ء)
اردن:	قیام ۱۹۶۸ء عمان (۹۰ گھنٹے کے پروگرام ہفتہ میں)
اری ٹیریا:	ایک ٹی وی اسٹیشن اسمارا میں قیام (جنوری ۱۹۹۳ء میں)
ازبکستان:	ازبک ٹیلی ویژن تاشقند، کمالک ٹی وی (Kamalak) تاشقند قیام ۱۹۹۲ء۔
افغانستان:	طالبان کے اقتدار سنبھالنے کے بعد کابل ٹی وی بند کردیا گیا تھا۔
البانیہ:	البا ٹی وی ترانہ اگست ۱۹۹۷ء سے نشریات معطل ہیں۔
الجزائر:	الجزائر شہر، بطنہ (Batna) سیدی بوالعیاس، کنسٹائن، سوق احراس (Ahras) اور تلمسان میں ٹی وی اسٹیشن ہیں۔
انڈونیشیا:	ٹیلی ویژن ری پبلک انڈونیشیا سرکاری ٹی وی اسٹیشن ہے۔ ہر صوبہ میں اس کے دو دو چینل ہیں۔ نجی ٹی وی (اہم) راجا ولی اسٹرا ٹیلی ویژن انڈونیشیا۔
ایران:	مرکزی ویژن آف دی اسلامک ری پبلک آف ایران تہران ۲۸ لوکل ٹیلی ویژن اسٹیشن بھی ہیں۔
بحرین:	ٹی وی اسٹیشن نامہ، رنگین نشریات کا آغاز (۱۹۷۳ء)

برکینا فاسو: برکینا فاسو ٹی وی اوگا دوگو (۱۹۶۳ء)

برونائی دارالسلام: ٹی وی کا قیام ۱۹۵۷ء میں عمل آیا۔

بنگلہ دیش: قیام (۱۹۶۴ء) ریلے اسٹیشن چٹا گانگ، کھلنا ،میمن سنگھ، نٹور (Natore) نواکھلی رنگپور، ست خیرا سلہٹ، کاکسز بازار، ارضی مواصلاتی اسٹیشن ۲ ڈھاکہ اور چٹا گانگ۔

بوسنیا اور ہرزیگووینا: آزاد ٹی وی تزلا (۱۹۹۱ء) این ٹی وی زیٹل زینکا (Zenica) ۱۹۹۱ء ریڈیو ٹی وی بوسنیا ہرزیگووینا۔

بینن: بینن ٹی وی کوٹونو۔

پاکستان: ٹی وی سیٹ ۲۹۱۱۱۲۷ (۱۹۹۹ء) وی سی آر ۱۳۳۹۶۵۔ ٹی وی اسٹیشن کراچی، لاہور، اسلام آباد، کوئٹہ اور پشاور۔

تاجکستان: اسٹیٹ ٹی وی براڈ کاسٹنگ کمپنی آف تاجکستان ٹی وی دوشنبے۔

تیونس: ریڈیو ٹی وی تیونس، ٹی وی اسٹیشن کا قیام جنوری ۱۹۶۶ء ہاوریا (Haouaria) میں ریلے اسٹیشن ۱۹۹۷ء دوسرا ٹی وی چینل ۱۹۸۳ء۔

ٹوگو: ٹوگولیز ٹی وی (۱۹۷۳ء) لومے۔

جبوتی: ریڈیو ٹی وی جبوتی۔

چاڈ: چاڈ ٹی وی انجمینا۔

سری لنکا: سری نام ٹی وی سچنگ قیام (۱۹۶۵ء) اور پارامار یبو اور انجمینی ٹیلی ویژن ورزارگنگ۔

سعودی عرب: سعودی عرب گورنمنٹ ٹی وی سروس (۱۹۵۶ء) دہران ٹی وی۔

سوڈان: سوڈان ٹی وی ارضی اسٹیشن ۱۴۔

سیرالیون: سیرالیون ٹی وی کا اجراء (۱۹۶۳ء) فری ٹاؤن سے۔
سینی گال سینی گال ٹی وی۔
شام: ٹی وی شام ودمشق قیام (۱۹۶۰ء)
صومالیہ: موگا دیشو ٹی وی (۱۹۸۳ء)
عراق: بغداد ٹی وی (۱۹۵۶ء)، ٹی وی اسٹیشن کرکوک (۱۹۶۷ء) موصل (۱۹۶۸ء) بصرہ (۱۹۶۸ء) مسان (Missan) (۱۹۷۴ء) کردش (۱۹۷۴ء)، ۱۸ صوبائی ٹی وی اسٹیشن ان کے علاوہ ہیں۔
عمان: عمان ٹی وی۔
فلسطین اتھارٹی فلسطین (۱۹۹۴ء) رملہ اور غزہ سے پروگرام کی اشاعت۔
قطر: الجزیرہ سیٹلائٹ اسٹیشن دوحہ (۱۹۹۶ء) قطر ٹیلی ویژن سروس (۱۹۷۰ء)
کرغزستان: کرغیز ٹی وی (شکیک)
قازقستان: کزاخ ٹی وی (خبر الماتی) (۱۹۵۹ء) کزاخ کمرشیل ٹی وی ٹیلی ویژن الماتی (آزاد) این ٹی کے الماتی (۱۹۹۶ء) نجی۔
کویت: کویت ٹیلی ویژن (۱۹۶۱ء) رنگین ٹی وی کا آغاز (۱۹۷۳ء) پانچ چینل۔
کیمرون (۱۹۹۰ء) سے فرانس ٹی وی سے کیمرون کے لئے پروگرام نشر ہو رہے ہیں۔
گنی: ریڈیوڈی فیوژن ٹیلی ویژن گنی۔
گنی بساؤ: ۱۹۸۹ء میں ٹی وی اسٹیشن کے قیام کا تجربہ کیا گیا۔
گیبون: گیبونیز ٹی وی قیام ۱۹۵۹ء ریاستی کنٹرول میں۔

گیمبیا: گیمبیا ریڈیو اینڈ ٹیلی ویژن سروسز ۱۹۹۶ء سے نشریات کا آغاز۔

لبنان: پیپلز ریولیوشن براڈ کاسٹنگ کارپوریشن، ٹیلی لبنان، فیوچر ٹیلی ویژن، مر (Murr) ٹیلی ویژن، ٹی وی کے نشریاتی ادارے ہیں۔

ماریطانیہ: ٹیلی ویژن ڈی ماریطانیہ نواکشوٹ۔

مالدیپ: ٹیلی ویژن مالدیپ مالے (۱۹۷۸ء) دو چینل ٹی وی ایم پلس (۱۹۹۸ء)

مالی: مالی ٹی وی۔

متحدہ عرب امارات: یو اے ای ٹی وی ابوظہبی (۱۹۶۸ء) یو اے ای ٹی وی شارجہ (۱۹۸۹ء)۔

مراکش: ریڈیو ڈی فیوژن ٹیلی ویژن مراکش رباط، ۱۹۶۲ء دو ایم انٹرنیشنل۔

مصر: ایجپشین ریڈیو اور ٹی وی۔

ملائیشیا: قیام ۲۸ دسمبر ۱۹۶۳ء ٹی وی ملائیشیا، رنگین نشریات کا آغاز ۲۸ دسمبر ۱۹۷۸ء۔

موزمبیق: ریڈیو ٹیلی ویژن کلنٹ میوتو، ٹیلی ویژن داموزمبیق (۱۹۸۱ء)۔

نائیجیریا: نائیجیرین ٹی وی اتھارٹی (۱۹۷۶ء)۔

نیجر: نیجر ٹی وی۔

یمن: یمن ریڈیو اور ٹی وی کارپوریشن صنعا۔

یوگنڈا: سینو ٹیلی ویژن آزاد (۱۹۹۴ء) یوگنڈا ٹی وی کیمالا (۱۹۹۲ء) نشریات کا انگریزی، سواحلی یوگنڈا میں۔

(بحوالہ.......اسلامستان۔۔زاحد حسین انجم)

میڈیا کا منفی رویہ

صحافت پہلے صرف اخبارات و رسائل تک محدود تھی اور اس میدان میں انہی کی بلاشرکت غیرے اجارہ داری تھی۔ مگر آج ایک دوسرا شہسوار بھی میدان میں کود پڑا ہے جو پہلے کے مقابلے میں زیادہ تیز، زیادہ ذہین، زیادہ چمک دمک رکھنے والا، زیادہ دوررس، زیادہ زوداثر، زیادہ چالاک اور مطلوبہ مقام پر بہت جلد رسائی حاصل کر لینے کی قدرت رکھنے والا مرد میدان ہے۔ اخبارات و رسائل کی صحافت کو پرنٹ میڈیا تو ثانی الذکر کو الیکٹرانک میڈیا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ آج الیکٹرانک میڈیا کا دور ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پرنٹ میڈیا غیر اہم ہو گیا ہے اس کی آج بھی اپنی اتنی ہی اہمیت اور معنویت ہے جتنی کہ پہلے تھی اور باخبر طبقہ کا خیال ہے کہ اس کی اہمیت آئندہ بھی کم نہیں ہو گی۔

اخبارات و رسائل کے بعد جب ریڈیو کی ایجاد ہوئی اور اس پر خبریں نشر کی جانے لگیں تو صحافت کو ایک نئی جہت ملی۔ اس کے بعد ٹیلی ویژن اور نیوز چینلوں کا زمانہ آیا۔ اور اب تو ان کی بھرمار ہو گئی ہے۔ ان چینلوں کے وجود سے صحافت میں مزید کئی جہتیں جڑ گئیں۔ چھوٹا سا لفظ ''میڈیا'' اپنے دامن میں اطلاعات و نشریات اور ترسیل و ابلاغ کی اتنی وسعت رکھتا ہے کہ دنیا اسی کے اردگرد سمٹ کر رہ گئی ہے۔ جب سے نیوز چینلوں کا زمانہ آیا ہے یہ لفظ کثیر جہت بن گیا ہے۔ گویا اب صحافت کا دائرہ صرف اخبارات و رسائل تک محدود نہیں رہ گیا بلکہ ریڈیو، ٹی وی اور نیوز چینلوں تک اور اس سے بھی آگے انٹرنیٹ تک پھیل گیا ہے۔

نیوز چینلوں کی آمد نے جہاں صحافت کے دامن کو بہت وسیع کر دیا ہے اور بہت سی مستحسن چیزیں آ گئی ہیں وہیں اس شعبے میں بہت سی خامیاں اور برائیاں بھی در آئی ہیں اور

یہ برائیاں ان چینلوں کے ساتھ ہی آئی ہیں جو آج سماج کو زیادہ متاثر کر رہے ہیں۔ زمانے کی ترقیات کا ساتھ دینے کی خواہش اور مقابلے سے باہر نہ نکلنے کے خوف نے اس پیشے میں ایسے ناپسندیدہ ابعاد بھی جوڑے ہیں جن کا خیر مقدم نہیں کیا جا سکتا۔ آج صحافت ایک تجارت بن گئی ہے اور جب کوئی چیز تجارت بن جاتی ہے تو اس میں قدروں اور اصولوں کا احترام اٹھ جاتا ہے محض منافع پر نظر رکھی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج صحافت میں منفی چیزیں مثبت چیزوں پر بظاہر حاوی ہو گئی ہیں۔ ٹیلی ویژن چینلوں کے گلیمر اور نیوز چینلوں کی چکا چوند نے صحافت کی اس برائی کو زیادہ پروان چڑھایا ہے۔ اسے منفی صحافت یا یلو جرنلزم کا نام دیا جا سکتا ہے۔ آج صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ یلو جرنلزم کرنے والے ہی مستند صحافی کہلاتے ہیں اور کاروبار میں وہی لوگ رسائی رکھتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا کی بھی یہی صورت حال ہے اور الیکٹرانک میڈیا کی بھی۔

صحافت کا منفی رجحان:

جس طرح صحافت کو ادبی صحافت، سائنسی صحافت، طبی صحافت اور کھیل صحافت وغیرہ کے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے اسی طرح صحافت کو مثبت اور منفی صحافت کے خانوں میں بھی بانٹا جا سکتا ہے۔ حالانکہ ابھی تک ایسا کوئی طے شدہ پیمانہ مقرر نہیں ہوا ہے جس سے صحافت کے مثبت اور منفی پہلوؤں کو جانچا اور پرکھا جا سکے اور نہ ہی ایسا کوئی ترازو بنی ہے جس پر تول کر یہ کہا جا سکے کہ فلاں چینل یا اخبار کی صحافت مثبت ہے اور فلاں کی منفی۔ اس لئے کہ اگر صحافت کا کوئی ایک مخصوص رنگ قارئین کے ایک طبقہ کے نزدیک مثبت ہے تو دوسرے کے نزدیک وہ منفی ہو سکتا ہے یا کوئی مدیر اگر دوسرے چینل یا اخبار کی صحافت کو منفی تصور کرتا ہے تو وہی صحافت اس اخبار کے مدیر کے لئے مثبت ہو سکتی ہے۔

آیئے جائزہ لیتے ہیں کہ منفی صحافت کیا ہے اور کس طرح اسے پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ منفی صحافت کی تعریف کیا ہے؟ سب سے پہلے اس سلسلہ میں ہماری نظر زرد

صحافت پر جاتی ہے۔ ایڈون ریڈفورڈ نے اپنی کتاب Unusual Words میں لکھا ہے کہ زرد صحافت کا نام ان اخبارات کو دیا گیا جو سنسنی خیزی کو بھڑکاتے اور شہ دیتے ہیں۔ سب سے پہلے اس نام کا استعمال ۱۸۹۸ء میں ان اخبارات کے لئے کیا گیا، بالخصوص امریکہ میں، جنھوں نے پیلے شہریوں کے خطرے سے متعلق مضامین شائع کئے۔ چین اور جاپان میں آبادی میں اضافے کے بعد وہاں آبادی کو کم کرنے کے مقصد سے اپنے شہریوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ بزور طاقت گوروں کی سرزمین پر چڑھائی کردیں۔ یعنی امریکہ میں داخل ہو جائیں۔ ان لوگوں کی آمد کو خطرہ اور ہوّا بنا کر کی جانے والی رپورٹنگ کو یلو جرنلزم کہا گیا۔ چونکہ چین اور جاپان کے شہریوں کو یلو نیشنل بھی کہا جاتا ہے، اس لئے اس رپورٹنگ کو یلو جرنلزم کا نام دیا گیا۔ بعد میں اس اصطلاح میں وسعت پیدا ہوگئی اور حقائق سے روگردانی کرنے یا کسی کی برائی، بیجا نکتہ چینی اور کردار کشی کرنے والی صحافت کو یلو جرنلزم، پیت پتر کارتا یا زرد صحافت کہا گیا۔ منفی صحافت کی یہ پہلی تعریف ہوسکتی ہے، یعنی سنسنی خیزی کو پروان چڑھانا اور حقائق کے برخلاف صحافت کرنا۔ بعد میں زرد صحافت کا دامن بہت وسیع ہوگیا۔ نجی، گروہی یا فرقہ وارانہ مفادات کو عزیز رکھ کر کی جانے والی رپورٹنگ، اخبار نویسی، اداریہ نویسی، اور مضمون نگاری بھی منفی صحافت کے زمرے میں آگئی۔ جب ایک صحافی مفادات کے تابع ہو جاتا ہے تو وہ سچائی کا دامن چھوڑ دیتا ہے۔ اصولوں اور قدروں کو پامال کر دیتا ہے۔ اس کے نزدیک صحافتی اقدار کے بجائے اس کے مفادات ہی اہم ہوتے ہیں، خواہ وہ نجی ہوں، گروہی ہوں یا فرقہ وارانہ ہوں، اور جب اصولوں اور قدروں پر مفادات کا رنگ غالب آجاتا ہے تو صحافی اخبار نویس نہ رہ کر پروپیگنڈہ باز بن جاتا ہے اور چلتا پھرتا اشتہار ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں وہ سچائیوں سے منھ موڑ لیتا ہے اور قارئین کے لئے گمراہ کن رپورٹنگ کرتا ہے، ان کے سامنے وہی چیزیں پیش کرتا ہے جو اس کے نجی، گروہی اور فرقہ وارانہ مفادات کو راس آتی ہیں۔ تحقیقاتی صحافت کے نام پر جسے ہندی میں کھوجی پتر کارتا اور انگریزی میں Investigative Journalism کہتے

ہیں، حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے یا پھر انھیں بالکل ہی نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔

منفی صحافت کا عالمی پہلو:

یہ صحافت کسی ایک ہی ملک میں نہیں ہو رہی ہے، بلکہ یہ کھیل عالمی سطح پر کھیلا جا رہا ہے۔ اور اسے بعض ملکوں میں سرکاری سرپرستی بھی حاصل ہے۔ منفی صحافت کی سب سے بڑی اور بدترین مثال ماضی قریب میں امریکہ افغانستان اور عراق جنگ کے دوران دیکھنے کو ملی۔ پوری دنیا نے اس جنگ کو اپنے بیڈروم اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر دیکھا، پرکھا، برتا اور پڑھا۔ افغانستان اور عراق کے خلاف امریکہ کی جنگ صرف آسمانوں اور میدانوں میں نہیں لڑی گئی بلکہ میڈیا میں بھی لڑی گئی تھی۔ وہ پہلی چوبیس گھنٹے کی لائیو ٹی وی جنگ تھی جو جتنی زمین پر لڑی گئی اس سے کہیں زیادہ اسے ٹی وی چینلوں نے بنا کر پیش کیا۔ اس جنگ میں میڈیا کو زرخرید غلام بنالیا گیا۔ ان سے وہی دکھوایا اور لکھوایا گیا جو امریکہ کو پسند تھا اور طالبانی اور عراقی قیادت کے خلاف اسی طرح منظّم انداز میں پروپیگنڈہ مہم چلائی گئی جیسی کہ امریکا اور برطانیہ چاہتے تھے۔ جنگ کے دوران صحافت کو سنسر کر دیا گیا۔ اتحادی فوجوں کے ساتھ دنیا بھر کے صحافیوں کی بھی ایک فوج چلتی رہی۔ ان صحافیوں کو امبیڈڈ جرنلسٹ کہا گیا۔ چونکہ ان صحافیوں کے تمام اخراجات امریکہ نے برداشت کئے۔ اس لئے ان کے لئے ایک ضابطہ اخلاق بنایا گیا اور ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ وہی چیزیں دکھائیں جن کی اجازت امریکہ سے ملی ہو۔ جب تک امریکہ کسی کوریج کو منظوری نہیں دے دیتا اس وقت تک امبیڈڈ جرنلسٹوں کی فوج کچھ نہیں کرتی تھی۔ اس کے لئے ان صحافیوں کو نشانہ بھی بنایا گیا جو آزادانہ کوریج کے حق میں تھے۔ جنگ کے دوران یہاں تک کیا گیا کہ فوجیوں کے سرینڈر سے پہلے الیکٹرانک میڈیا کو تیار کیا جاتا تھا اور جب وہ اپنے کیمرے وغیرہ درست کر لیتے تب عراقی فوجیوں سے ہتھیار ڈالنے کو کہا جاتا۔ اس جنگ میں بہت کچھ اس قدر یک طرفہ دکھایا گیا کہ شاید اس کی مثال نہ ملے۔ یہ منفی صحافت کی بدترین مثال تھی۔ اس جنگ میں درجنوں صحافی کام آئے اور لاتعداد زخمی ہوئے اور یہ انعام ان صحافیوں کے لئے مخصوص تھا جو امریکہ کے

ہاتھوں اپنے ضمیر کو گروی رکھ کر منفی صحافت کے لئے آمادہ نہیں تھے یا جنھوں نے امریکہ کے ہاتھ پر بیعت نہیں کی تھی۔

ملکی اندازِ فکر

تجارتی مفادات کے حصول کے لئے قارئین کے جذبات سے کھیلنا اور اشتعال انگیزی کرنا بھی منفی صحافت کے زمرے میں آتا ہے۔ جس وقت ہفت روزہ بلٹز انگریزی، اردو اور ہندی میں شائع ہوتا تھا، اس وقت انگریزی اور ہندی کا الگ رنگ روپ ہوتا تھا اور اردو بلٹز کا الگ۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ہندی بلٹز ہندوؤں کے لئے اور اردو بلٹز مسلمانوں کے لئے شائع کیا جا رہا ہے۔ بعض اوقات ایک ہی واقعہ کی پیشکشی کا انداز دونوں زبانوں میں الگ الگ ہوتا تھا۔ اب اس روایت کو دہلی اور دیگر شہروں سے ہندی اور اردو میں شائع ہونے والا ایک بڑا اخبار آگے بڑھا رہا ہے۔ میں صرف دو مثالیں دینا چاہوں گا۔ اسٹوڈنٹس اسلامک مومنٹ آف انڈیا یعنی سیمی (SIMI) پر پابندی لگنے سے عین قبل کانپور میں ایک فساد ہو گیا تھا، جس میں بقول پولیس و ایڈمنسٹریشن کے سیمی کے کارکن ملوث تھے۔ یہ فساد دہلی میں قرآن شریف کے نذر آتش کرنے کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرے کے دوران بھڑکا تھا۔ دہلی سے شائع ہونے والے اسی اخبار کے ہندی روزنامہ کی رپورٹنگ سے ایسا لگ رہا تھا جیسے سیمی کے کارکنوں نے پورے کانپور شہر کو یرغمال بنالیا ہے، جبکہ اسی گھرانے سے شائع ہونے والے اردو روزنامہ میں ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک دوسری مثال ملاحظہ فرمایئے جب امریکہ نے عراق پر حملہ کیا تو اس اخبار کی شہ سرخی تھی، ''سرزمین کربلا پر ایک بار پھر حق و باطل کی جنگ''۔ حالانکہ اس جنگ کو حق و باطل کی جنگ تو کہہ سکتے ہیں لیکن اخبار کی زبان اور اس کا لب ولہجہ قارئین کی یادداشت کو جس تاریخی واقعہ کی طرف لے جانے کی کوشش کر رہا ہے اسے مسلم قارئین کے جذبات سے کھیلنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ جذباتیت بھی منفی صحافت کی ایک بدترین شکل ہے اور یہ جرم صرف ایک اخبار نہیں کر رہا ہے بلکہ بیشتر اردو اخبارات خاص طور پر ہفت روزہ اخبارات کر رہے ہیں۔ حالانکہ

۶ ردسمبر ۱۹۹۲ء کے بعد سے مسلمانوں کی اس جذباتیت میں بہت حد تک کمی آئی ہے، لیکن اب بھی بہت سے مسلم قارئین اس قسم کی منفی صحافت کے سحر سے باہر نہیں نکل سکے ہیں۔

منفی صحافت کا خوب مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب فرقہ وارانہ فساد ہو جائے اور شہر میں کرفیو لگ جائے۔ اس وقت بیشتر صحافی صرف اپنے فرقہ کے نمائندے بن جاتے ہیں۔ نتیجے کے طور پر ان کی تمام تر ہمدردیاں مظلوموں اور فساد زدگان کے ساتھ نہیں بلکہ اپنے فرقہ کے ساتھ ہو جاتی ہیں۔ گجرات فسادات میں میڈیا کی رپورٹنگ کو اگر ایک طرف رکھ دیا جائے تو بیشتر فسادات میں صحافیوں کا یہی رول نظر آتا ہے۔ ان کے نزدیک عموماً دوسرا فرقہ فسادی ہوتا ہے، ظالم و جابر ہوتا ہے، بلوائی ہوتا ہے اور فساد کا اصل ذمہ دار ہوتا ہے۔ جبکہ ان کے فرقہ کے لوگ مظلوم و مجبور اور مقہور ہوتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں تو شاید بیجا نہ ہوگا کہ اس میں ہندو مسلم دونوں صحافی شامل ہیں اور انگریزی، ہندی اور اردو تینوں بڑی زبانوں کے صحافیوں کا یہی حال ہے۔ تاہم ہندی اور انگریزی اخبارات کی رپورٹنگ سے فسادات زیادہ بھڑکتے ہیں بمقابلہ اردو اخبارات کی رپورٹنگ کے۔ ممکن ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات زیادہ پڑھے جاتے ہیں اور اردو کے کم۔ اور اول الذکر دونوں زبانوں کے اخبارات کے بیشتر قاری غیر مسلم ہوتے ہیں اور آخر الذکر کے بیشتر مسلم۔

انگریزی اور ہندی پریس کی منفی صحافت یا ان کی فرقہ واریت پر ودیا بھوشن راوت نے اپنی کتاب Press and Prejudice میں کھل کر روشنی ڈالی ہے۔ منفی صحافت یا منفی سوچ کا ہی نتیجہ ہے کہ فسادات کے دوران بغیر تحقیق کے افواہوں کو بھی خبر کے لباس میں پیش کیا جاتا ہے اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فسادات کی سنگینی دو چند ہو جاتی ہے۔ یہ منفی سوچ ہندی اور انگریزی پریس کے رپورٹروں سے غلط بیانی کرواتی ہے اور وہ دوسرے فرقہ خصوصاً مسلمانوں کو فساد کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔ ایسے اخبارات اور ایسے صحافیوں کی قلعی سینئر پولس افسر، بی ایس ایف کے سابق آئی جی اور لکھنؤ زون کے موجودہ آئی جی پولس وبھوتی نارائن رائے نے اپنی کتاب Combatting Communal Conflicts میں کھولی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جب بھی فرقہ وارانہ فسادات پر غور کیا جاتا ہے تو ہندوستان کا اکثریتی فرقہ حقائق کو نظر انداز کر بیٹھتا ہے اور پہلے سے طے شدہ دو باتوں پر ہی اصرار کرتا ہے۔ ایک یہ کہ فسادات مسلمان ہی شروع کرتے ہیں اور دوسرے یہ کہ فسادات میں زیادہ تر ہندو مارے جاتے ہیں''۔

وہ آگے یہ بھی لکھتے ہیں:

''یہ یقین کہ فسادات میں زیادہ تر ہندو مارے جاتے ہیں، اکثریتی فرقہ کے دل و دماغ میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ ایک اوسط ہندو اس سچائی کو تسلیم نہیں کرے گا کہ ان فسادات میں زیادہ جارح فریق ہندو ہوتے ہیں''۔

بقول ان کے:

''ہر ہندو بچے کو گھر میں یہ سکھایا جاتا ہے کہ مسلمان پیدائشی ظالم ہوتا ہے اور کسی کی جان لینے سے بھی نہیں چوکتا، جبکہ ہندو نرم دل ہوتے ہیں اور کسی چیونٹی کو بھی نقصان پہنچانا ان کے لئے دشوار ہے''۔

میں یہ مانتا ہوں کہ اس رجحان کے پیچھے انگریزی اور ہندی اخبارات کی منفی اور جانبدارانہ رپورٹنگ کا بھی بڑا دخل ہے۔

اسی طرح ودیا بھوشن راوت اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

''ہندی میڈیا ہندو سیاسی پارٹی کی مانند ہے۔ وہ سیکولر اور فرقہ پرست دونوں ہے۔ ہندی صحافی چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے بارے میں اونچی ذات کا ہندو لکھے، وہ مسلمانوں کو اپنے بارے میں لکھنے کی اجازت نہیں دیتے۔ وہ ہندو ثقافت کی آڑ میں اپنی کٹر مذہبیت کا دفاع کریں گے جبکہ مسلمانوں کی مذہبیت کی مذمت کریں گے۔ وہ چاہیں گے کہ مسلمان ہندوؤں کی خواہش کے مطابق اپنے اندر اصلاح کریں

اور پھر زور دے کر کہیں گے کہ مسلمانوں کی ذہنیت اصلاح پسند نہیں ہے۔ایک طرف ہندی اور انگریزی پریس پاکستان کو سبق سکھانا چاہے گا اور دوسری طرف وہ آئی ایس آئی اور اس کی سرگرمیوں کے بارے میں غیر ذمہ دارانہ نیوز آئٹم چھاپ کر اندرونِ ملک مسلمانوں کی زندگی کو جہنم بنانے کی کوشش کرے گا''۔

ودیا بھوشن راوت کا یہ تجزیہ بتاتا ہے کہ انگریزی اور ہندی پریس کی شریانوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اس میں منفی صحافت کے زہر کی خاصی آمیزش ہو چکی ہے۔

تجارت اور جذباتیت:

تجارتی مفادات کے حصول کے لئے قارئین کے جذبات سے کھیلنا اور اشتعال انگیزی کرنا بھی منفی صحافت کے رجحان کا پتہ دیتا ہے۔ یہ مفاد پرستی ہی ہے کہ ایک ہی صنعتی گھرانے سے نکلنے والے ہندی، انگریزی اور اردو کے اخبارات الگ الگ نظرئے پر چلتے ہیں اور جس زبان کو جو نظریہ سوٹ کرتا ہے وہ اختیار کیا جاتا ہے۔ جذباتیت کے سہارے منفی صحافت کو فروغ دینے کا جرم اردو کے اخبارات بھی دھڑلے سے کرتے ہیں۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ایام میں تلوار، خنجر، خون، پھانسی اور لاشوں کو دکھا کر اپنی سرکولیشن بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں اور مذہبی بنیاد پر بھی گھس پیٹھ کرنا چاہتے ہیں۔

منفی صحافت کی ایک بدترین روایت وہ بھی ہے جسے انگریزی اور ہندی اخبارات کے ضمیموں میں پروان چڑھایا جا رہا ہے۔ ان میں جنس یعنی سیکس کو غیر معمولی اہمیت دی جاتی ہے۔ ایسی عریاں اور نیم عریاں تصاویر شائع کی جاتی ہیں جو جنسی تلذذ کا سامان پیدا کرتی ہیں اور جن کو دیکھ کر قارئین جنسی بخار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ہیجان انگیز تصاویر اور شرمناک مواد ان ضمیموں کی جان ہیں۔ ان اخبارات میں طب وصحت کے کالم بھی ہوتے ہیں مگر ان کو جنس زدہ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ آرائش وزیبائش کے کالموں کا بھی یہی حال ہے۔

صحافت جب مشن تھی تو ایسی مخرب اخلاق چیزیں اخبار کی زینت نہیں بن پاتی تھیں اور نہ ہی قارئین کے جذبات سے کھلواڑ کیا جاتا تھا۔لیکن جب صحافت تجارت بن گئی تو ہر وہ چیز روا اور جائز ہو گئی جو تجارتی مفادات کی کسوٹی پر کھری اترتی ہو۔آج اخبارات کے مدیر وہ چیزیں قارئین کے سامنے نہیں پیش کرتے جو پیش کرنا چاہئے بلکہ وہ چیزیں طشت میں سجا کر پیش کرتے ہیں جو قارئین کی پسند کے عین مطابق ہوں اور جن سے تجارتی مفادات حاصل ہوں۔یعنی قاری کیا دیکھنا اور کیا پڑھنا چاہتا ہے اس کی اہمیت بڑھ گئی ہے نہ کہ اس کی کہ ہمیں قاری کے سامنے کیا پیش کرنا چاہئے۔

صحافت کے اس منفی رویے سے سماج میں زبردست انتشار پیدا ہوتا ہے گروہی انتشار، طبقاتی انتشار، فرقہ وارانہ انتشار، جنسی و جذباتی انتشار وغیرہ وغیرہ۔جذباتی صحافت سے سماج میں صحت مند سوچ کے چشمے پھوٹنے بند ہو جاتے ہیں اور جذباتیت لوگوں کو تنگ نظر بنا دیتی ہے۔ سیکسی مٹیریل سے جنسی انارکی پیدا ہوتی ہے اور بے شمار مسائل جنم لیتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا کی منفی سوچ:

اب تھوڑی سی گفتگو الیکٹرانک میڈیا کی۔صحافت کا منفی رجحان اور جذباتیت کی فروخت صرف پرنٹ میڈیا میں نہیں ہے۔الیکٹرانک میڈیا میں اگر کہیں تو پرنٹ میڈیا سے زیادہ ہے۔میں صرف ایک واقعہ پر روشنی ڈالنا چاہتا ہوں۔وہ ہے عارف، گڑیا اور توفیق کا واقعہ۔حالانکہ یہ میڈیا ہی کی رپورٹنگ کا نتیجہ تھا کہ عارف کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ بھگوڑا فوجی نہیں ہے جیسا کہ ہندوستانی فوج نے اعلان کر رکھا تھا بلکہ وہ پاکستان کی جیل میں قید ہے اور پاکستان کے ہاتھ میں ایک جنگی قیدی ہے۔لیکن اس کی اور گڑیا اور توفیق کی ازدواجی زندگی کو جس طرح نمک مرچ لگا کر اور جذباتیت کے مسالے میں فرائی کر کے پیش کیا گیا وہ میڈیا کی کارستانی ہے اور اس کو کسی بھی قیمت پر بہ نظر تحسین نہیں دیکھا جا سکتا ہے۔(گڑیا کا گزشتہ دنوں انتقال ہو چکا ہے)۔

نہ صرف ہمارے یہاں بلکہ دنیا کے ہر سماج میں کچھ قدریں ہوتی ہیں، کچھ روایتیں ہوتی

ہیں، اور کچھ اصول وضوابط ہوتے ہیں۔ شادی اور طلاق کو سماجی مرتبہ حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی ایک مذہبی حیثیت بھی ہے اور مذہبی شخصیات ہی اس کام کو انجام دیتی ہیں۔ لیکن عارف، توفیق اور گڑیا کے معاملے میں الیکٹرانک میڈیا کے مابین جاری پاگل پن کی حد تک مقابلہ نے جو رول ادا کیا اس سے بہت سے سوال اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرنے کا Prerogative مذہبی شخصیات کو حاصل ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا نے قاضی اور پنچایت کے حقوق سلب کر لئے اور محض Exclusive Story کی تلاش میں نہ صرف یہ کہ اپنی حد سے تجاوز کیا بلکہ ایک نیوز چینل نے مذکورہ لوگوں کو ایک طرح سے یرغمال بنالیا اور ذرائع کے مطابق ان کو 24 گھنٹے تک یرغمال بنائے رکھا گیا۔ کوئی دوسرا نیوز چینل ان لوگوں سے رابطہ قائم نہ کر سکے اس کی پوری کوشش کی گئی۔ حالانکہ عام طور پر نیوز چینلوں میں یہ غیر اعلانیہ معاہدہ ہے کہ جب ایک چینل مطلوبہ شخص سے انٹرویو کر لے تو وہ اس کو ''آزاد'' کر دے تاکہ دوسرے چینل والے اس سے بات کر سکیں، لیکن معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک چینل کے نمائندے نے پولس کو فون کر کے شکایت کی کہ فلاں مقام پر فلاں فلاں لوگوں کو یرغمال بنالیا گیا ہے اور جب پولس فورس وہاں پہنچی تو اسے معلوم ہوا کہ یہ شکایت پیشہ ورانہ چشمک کا نتیجہ ہے۔

اس ٹیلی ویژن شو میں صرف عارف، توفیق اور گڑیا کو ہی نہیں بٹھایا گیا تھا بلکہ ان کے گھر اور گاؤں والوں کو اور یہاں تک کہ چند مذہبی شخصیات کو بھی مدعو کیا گیا اور اس پورے ڈرامے میں گڑیا کے منھ میں الفاظ ڈالنے کی کوشش کی جاتی رہی، لیکن کسی نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ گڑیا کن کیفیات سے مغلوب ہے اور اس کے ننھے سے دل میں جذبات وخیالات کا جو طوفان ہے وہ کس قدر اس کے پورے وجود کو تہہ وبالا کر رہا ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ جو کام مذہبی شخصیات کو انجام دینا تھا وہ نیوز چینل نے انجام دیا۔ اس معاملے میں مذکورہ چینل مدعی بھی بنا اور مدعیٰ علیہ بھی، وکیل بھی بنا اور جج بھی۔ اس نے طلاق بھی کروائی اور نکاح بھی پڑھوایا۔ اس کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ جن مذہبی شخصیات کو اس نے بلایا ہے ان کا نقطۂ نظر کیا ہے، اسے اپنے نقطۂ نظر کی

فکر تھی اور اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں اس ڈرامے کی اسکرپٹ لکھی گئی اور پیش کیا گیا۔ اسے ایک ایسی کہانی بنا کر دکھایا گیا کہ بالی ووڈ کی سنسنی خیز فلمیں اس کے آگے ہیچ ہو گئیں۔

اس لائیو شو نے بہت سے سوالات پیدا کئے۔ الیکٹرانک میڈیا کے بعض سرکردہ افراد کے خیال میں مذکورہ چینل نے الیکٹرانک میڈیا کی اخلاقیات ازسرِ نو لکھنے کی کوشش کی۔ اس نے ایسی شروعات کی جو الیکٹرانک میڈیا میں در آئی بہت سی نحس روایات سے عبارت ہے۔

پوشیدہ تعصب کی کارفرمائی:

اگر میں یہ کہوں تو شاید بے جا نہیں ہوگا کہ اس واقعہ کو اس انداز میں پیش کرنے کے پس پردہ منفی رجحانات حاوی رہے ہیں۔ چونکہ معاملہ مسلم فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اس لئے اس کو زیادہ ہائی لائٹ کیا گیا۔ یہاں یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا اور بالخصوص مذکورہ چینل نے عارف، گڑیا اور توفیق کے معاملے کو حل کرنے کی جو خود ساختہ کوشش کی اس کے لاشعور میں بیٹھا تعصب زیادہ ذمہ دار ہے۔ چونکہ اس معاملے میں طلاق اور نکاح جیسے حساس پہلو پوشیدہ تھے اور طلاق کے معاملات کو یوں بھی اچھالا جاتا ہے، لہٰذا اس کو بھی ایک آسان شکار سمجھا گیا۔ (دوسرے چینل والوں کو ایسا موقع ملتا تو شاید وہ بھی یہی کرتے) اگر ایسا نہیں تھا تو ایک نیوز چینل کے نمائندے نے جس پر متعصب ہونے کا لیبل چسپاں ہے، توفیق کے گاؤں کی عورتو ں سے یہ کہلوانے کی کوشش کیوں کی کہ ''اسلام انسانیت اور انصاف کے آڑے آ رہا ہے''؟ لیکن اس نمائندے کو ان دیہاتی مگر سمجھ دار خواتین نے وہی جواب دیا جو ''یرغمال'' بنانے والے چینل کے نمائندے کو پنچایت میں بلائے گئے ایک عمر دراز شخص نے جواب دیا۔ جب آخر میں پٹودی کے سرپنچ سے نیوز چینل والوں نے سوال کیا کہ ان کی پنچایت اس کیس میں کیا کرے گی تو سرپنچ نے جواب دیا کہ '' آپ ہم سے کیا چاہتے ہیں؟ آپ نے سب کچھ کر ڈالا۔ آپ کے لئے تو یہ گڑیا ایک گڑیا کی طرح ہی ہے''۔ مذکورہ بالا شبہ اس لئے بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کے ایک ہفتے بعد اسی نوعیت کا ایک واقعہ ہوا۔ لکھنؤ کے پاس کے ایک گاؤں کی ایک

غیر مسلم عورت کا شوہر شادی کے بعد دہلی آیا اور لوٹ کر واپس ہی نہیں گیا۔ دو سال کے بعد اس عورت نے ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی اور اس دوران اس کے تین بچے ہوئے۔ آٹھ دس سال کے بعد جب وہ شخص جو کہ ایک کیس میں جیل میں بند تھا، واپس اپنے گھر آیا تو وہ عورت پہلے شوہر کے پاس واپس چلی گئی۔ لیکن یہ خبر ایک انگریزی اخبار میں سنگل کالم کی خبر بن کر رہ گئی۔ الیکٹرانک میڈیا والوں نے پنچایت کرنا تو دور، اس خبر کو دکھانا بھی ضروری نہیں سمجھا۔

مذکورہ دونوں واقعات کی روشنی میں الیکٹرانک میڈیا کی نفسیات کو آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ غالباً میڈیا سے وابستہ صحافیوں کی منفی سوچ ہی ان سے ایسے ''کارنامے'' کرواتی ہے۔ جن صحافیوں کا ذہن صاف ہے اور جو Prejudice سے متاثر نہیں ہیں وہ عام طور پر ان کارناموں سے بچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ اس پیشے میں اس قدر مقابلہ ہے اور خبر نگاری اور رپورٹنگ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی اس قدر ہوڑ ہے کہ چاہے ان چاہے صاف ستھرے ذہن والے صحافی بھی لغزش کھا جاتے ہیں اور ان کا دامن بھی اس آلائش میں ملوث ہو جاتا ہے۔ ودیا بھوشن راوت نے جو تجزیہ ہندی اور انگریزی اخبارات کے تعلق سے کیا ہے اس کا اطلاق الیکٹرانک میڈیا پر بھی ہوتا ہے۔ وی این رائے نے اپنی کتاب میں جو تجزیہ کیا ہے دراصل وہ ایک بنیادی نکتہ ہے۔ اگر بچپن سے ہی یک طرفہ ذہن سازی نہ کی جائے تو اس قسم کی باتیں شاید پیدا نہ ہوں۔

میڈیا اور خوف کی نفسیات

میڈیا کی نفسیات کا مطالعہ کرنے والوں کا کہنا ہے کہ خوف بھی میڈیا کی نفسیات کا ایک جز ہے اور ہمعصر میڈیا جان بوجھ کر لوگوں کو خوف و دہشت میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کسی ایسی خبر کو جس میں خوف و دہشت کا مترادف بننے کی صلاحیت ہو عملاً بار بار دکھاتا ہے۔ اگر خطرہ بہت سنگین نہیں ہے تو بھی خبر پیش کرنے کا انداز ایسا ہوتا ہے کہ اس کی سنگینی دو چند ہو جاتی ہے۔ گیارہ ستمبر کو امریکہ پر ہوئے حملے سے لے کر اب تک کے تمام دہشت پسندانہ واقعات میں میڈیا کا یہی رویہ رہا ہے۔ گویا میڈیا کی رپورٹنگ اور خوف و دہشت دونوں ایک دوسرے کے معاون بن گئے ہیں۔

نائن الیون کے بعد ہندوستانی میڈیا مغربی میڈیا کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش میں اس سے بھی آگے نکل گیا ہے اور مغربی میڈیا میں اگر کسی دہشت گردانہ واقعہ کی کوئی خبر آتی ہے تو ہندوستانی میڈیا نہ صرف اس خبر کو دکھاتا اور وحشت ناک انداز میں دکھاتا ہے بلکہ اس کے سیاق وسباق پر بھی رپورٹنگ کرتا ہے۔ نائن الیون کے بعد عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ جب بھی یوم آزادی یا یوم جمہوریہ آتا ہے تو نیوز چینل تقریباً دہشت کا ایک ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ ان کے رپورٹر اور نمائندے جگہ جگہ تعینات ہو جاتے ہیں اور وہ لائیو رپورٹنگ میں یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ جیسے پورا ملک دہشت گردوں کے نشانے پر ہے۔ کوئی ایئر پورٹ سے خبر دے رہا ہے تو کوئی لال قلعہ سے، کوئی ریلوے اسٹیشن سے تو کوئی انڈیا گیٹ سے۔ اور ہر رپورٹر تقریباً ایک ہی رپورٹ دیتا ہے کہ دہلی کو چھاؤنی میں بدل دیا گیا ہے، چپے چپے پر پولیس فورس تعینات ہے اور کسی بھی دہشت گردانہ کارروائی کو ناکام بنانے کے پورے انتظامات ہیں۔ انتظامات تو حکومت اور پولیس

کو کرنے ہی ہوتے ہیں لیکن ان کو بیان کرنے میں ایسے الفاظ چن چن کر استعمال کیے جاتے ہیں جن سے خبر کی سنگینی میں اضافہ ہو جائے۔

ایک گمراہ کن رپورٹنگ

ایسی خبروں کی رپورٹنگ میں ہسٹیریائی انداز آجاتا ہے اور عوام اس قدر خوف و دہشت کے شکار ہو جاتے ہیں کہ دہشت گردوں کا نصف مقصد پورا ہو جاتا ہے۔ دہشت گرد جہاں تشدد برپا کرنا چاہتے ہیں وہیں ان کی ایک کوشش عوام کے ذہن و دماغ پر اپنی ہیبت بٹھانے کی بھی ہوتی ہے اور جب نیوز چینل عوام کو ہراساں کرتے ہیں تو گویا وہ دہشت گردوں کی مدد کرتے ہیں۔۱۵؍اگست ۲۰۰۶ء کے موقع پر ایک نیوز چینل نے یہ خبر دے کر پورے ملک میں سنسنی پھیلا دی کہ پندرہ اگست کو وزیر اعظم من موہن سنگھ کی سیکورٹی میں حزب المجاہدین کے دہشت گرد گھس آئے تھے۔انڈیا ٹی وی نے دو روز تک اس خبر کو نمایاں انداز میں دکھایا اور رپورٹنگ کے دوران پندرہ اگست کو لال قلعہ کی فصیل سے خطاب کرنے کے لئے جاتے ہوئے وزیر اعظم کے فوٹیج دکھائے گئے اور ان کو اس طرح ایک گول دائرے میں دکھایا گیا جیسے کوئی انھیں نشانہ بنا رہا ہو۔اس خبر سے یہ تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی کہ وزیر اعظم زبردست خطرات میں گھرے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بتایا گیا کہ سی آر پی ایف نے ان دہشت گردوں کو اپنی فورس میں بھرتی کیا ہے۔ان تین دہشت گردوں کے نام بھی بتائے گئے۔تینوں مسلمان تھے۔حالانکہ سی آر پی ایف نے اس خبر کی تردید کی اور کہا کہ یہ بالکل بے بنیاد ہے۔دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تین سال پرانا واقعہ ہے اور سی آر پی ایف کو معلوم تھا کہ ان تینوں دہشت گردوں نے ملازمت حاصل کرنے کے لئے جعلی دستاویزات پیش کی تھیں اور یہ دعویٰ کیا تھا کہ انھوں نے دہشت گردی ترک کر دی ہے۔لیکن چینل نے سی آر پی ایف کے ذمہ داروں کے بیانات کو اس انداز سے نہیں دکھایا جس انداز میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ وزیر اعظم دہشت گردوں کے نشانے پر ہیں۔یہ خبر جب شروع ہوئی اور لال قلعہ کی تصاویر بھی ساتھ میں دکھائی جانے لگیں تو یوں محسوس ہوا کہ دہشت گرد سیکورٹی کے بھیس میں لال

قلعہ کے وسیع میدان اور اس کی فصیل تک پہنچ گئے ہیں اور وزیر اعظم کے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ اس طرح دو روز تک یہ چینل اپنی رپورٹنگ سے لوگوں کو گمراہ بھی کرتا رہا اور خوفزدہ بھی کرتا رہا۔

مسلم مخالف ماحول سازی

ممبئی کی لوکل ٹرینوں میں سلسلے وار بم دھماکوں کی رپورٹنگ سے بھی پورے ملک کو دہشت میں مبتلا کر دیا گیا اور یہ سلسلہ کئی دنوں تک جاری رہا۔ ان رپورٹوں کے دوران میڈیا نے ایک مخصوص فرقہ کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرنے کی بھی کوشش کی اور خود بھی جذبات کی رو میں بہہ گیا۔

اسی طرح ایمسٹرڈم سے ممبئی کے لیے پرواز کے دوران جب بارہ ہندوستانیوں کو شبہ کی بنیاد پر دھر لیا گیا تو اس وقت بھی میڈیا کا یہی رویہ رہا۔ ہندوستانی میڈیا نے اس معاملے میں مغربی میڈیا کو بھی پس پشت ڈال دیا اور الیکٹرانک اور پرنٹ دونوں میڈیا نے فضا میں خوف و دہشت یا ٹیرر اِن دی ایئر کہا۔ لندن سے امریکہ کے درمیان پرواز کے دوران دس طیاروں کو فضا ہی میں دھماکہ کر کے اڑا دینے کی سازش جب بے نقاب ہوئی تو اس کی رپورٹنگ میں بھی یہی انداز جھلکتا رہا۔ اس میں بھی ٹیرر اِن دی اسکائی کی سرخیاں لگائی گئیں۔ روزنامہ اخبارات نے اپنے اداریوں میں ''اسلامی جہادیوں'' کے خطرے سے دنیا بھر کو آگاہ کرنے کی کوشش کی تو نیوز چینلوں نے یہ بتانے کی کوشش کی کہ پہلے تو صرف زمین ہی غیر محفوظ تھی اب آسمان بھی غیر محفوظ ہو گیا ہے اور دہشت گردوں نے اس پر بھی اپنا قبضہ جما لیا ہے۔

میڈیا پر گہری نظر رکھنے والے سدھیش پچوری کے خیال میں میڈیا خوف و دہشت پیدا کر کے کئی مقاصد حاصل کرتا ہے۔ ایک طرف وہ خوف کی نفسیات کو فروخت کرتا ہے، اپنا ٹی آر پی بڑھاتا ہے اور دوسری طرف وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت کی دیوار کھڑی کرنے کی بھی کوشش کرتا ہے۔ نیوز چینلوں نے واضح طور پر یہ بھی بتایا کہ شبہے کی بنیاد پر جن کو دھر لیا گیا اور

جہاز سے اتارلیا گیا وہ مسلمان تھے۔ حالانکہ وہ بنیادی طور پر تجارت کرنے گئے تھے اور ان کا دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔لیکن بقول سدھیش پچوری:

''وہ سب مسلمان تھے، اس میں کوئی شک نہیں، لیکن جب تجزیہ نگار مسلمانوں کو اسلامی دہشت گردی کا مترادف بناڈالتے ہیں تو تخلیق کردہ خوف زیادہ بھیانک بن جاتا ہے۔ غیر مسلموں کی نگاہ میں مسلمانوں کی پوری قوم ایک خاص کردار میں نظر آنے لگتی ہے۔سچائی مگر ایسی نہیں ہے۔ میڈیا خبر کو جامع بنانے کی جگہ پھیلا کر بڑے ایکسپریشنسٹ ڈھنگ سے پیش کرتا ہے۔ خبریں عنوانات کی مدد سے تیکھی کی جاتی ہیں۔اس طرح خوف نفرت تک کا سفر کر لیتا ہے۔ مذہبی جنون رفتہ رفتہ سلگنے لگتا ہے اور ہر ایسا واقعہ غیر مسلموں کو ڈراتے ڈراتے مسلمانوں کو بھی ڈرانے لگتا ہے اور بے قصور عام مسلمان زیادہ پریشان اور اکیلا پن محسوس کرتا ہے۔اس طرح میڈیا کے ذریعہ تخلیق کردہ دہشت گری دراصل دہشت گردی کے اصل واقعات سے کہیں زیادہ جذبات کو برانگیختہ کردیتی ہے۔ وہ نسوں پر بولنے لگتی ہے اور وحشت بڑھتی جاتی ہے۔حقیقت یہ ہے کہ دہشت گرد بھی یہی چاہتے ہیں''۔

سدھیش پچوری کے مطابق میڈیا واقعہ کو دکھا کر اس کو کیش کراتا ہے اور کیش کرانے کی یہ کوشش نفرت اور گھرنا کے جذبات کو اور بڑھاتی ہے۔اس سے آگے عدم اعتماد پیدا ہوتا ہے اور ہر آدمی یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ دہشت گردوں کے نشانے پر ہے۔

پروفائیلنگ کی شروعات

جب لندن میں طیاروں کو اڑانے کی سازش بے نقاب ہوئی تو اس کے بعد اسرائیل کی خفیہ ایجنسی کے حوالے سے دہشت گردوں کے پروفائیل کے بارے میں بتایا جانے لگا۔ روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے دہشت گرد کے رویے اور اس کی باڈی لینگویج کے بارے میں الگ الگ انداز کی تصویر پیش کی اور یہ بتایا کہ اگر کوئی شخص اپنے چہرے پر فلاں فلاں تاثرات کے ساتھ نظر آئے تو وہ دہشت گرد ہوسکتا ہے۔آنکھیں پھیلی ہوں تو وہ خوفزدہ ہے، ناک پھولی ہو تو وہ غصے میں

ہے، آنکھیں زیادہ ہوشیار نظر آئیں تو وہ کچھ چھپا رہا ہے، ہونٹوں کو سختی سے بند کئے ہو تو وہ قطعیت کے ساتھ کچھ کرنے جا رہا ہے اور بھوں جھکی ہوئی ہوں تو وہ دکھی ہے۔ یہ تاثراتی چہرے ائیر پورٹوں کے ذمہ داروں کے حوالے کر دئے گئے اور لوگوں سے اپیل کی گئی کہ ایسا کوئی شخص نظر آئے تو اس کے بارے میں بتائیں یا اس کو پکڑیں۔ گویا اس طرح ہر شخص کو مشکوک بنا دیا گیا۔ اب اگر کوئی شخص بیوی سے لڑ کر آیا ہو اور اس کی ناک پھولی ہو تو وہ بھی مشکوک ہو گیا اور اسے بھی پکڑا جا سکتا ہے۔ ایک دوسرے واقعہ میں دو مسافروں کو صرف اس لئے جہاز سے اتار کر گرفتار کر لیا گیا کہ ایک تو وہ عربی میں گفتگو کر رہے تھے اور دوسرے ان کے ہاؤ بھاؤ سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بہت عجلت میں ہیں۔ ایک خاتون مسافر نے ان دونوں کی شکایت کی اور کہا کہ وہ اسے مشکوک نظر آرہے ہیں ان کے ساتھ وہ سفر نہیں کر سکتی۔ بس اسی بات پر ان دونوں کو جہاز سے اتار کر گرفتار کر لیا گیا۔ شکوک وشبہات کو آفاقی بنانے میں میڈیا کا بڑا رول ہے۔

تبلیغی جماعت بھی نشانے پر

لندن دھماکہ سازش بے نقاب ہونے کے بعد ہندوستان ٹائمز ہی نے ۱۸/اور ۲۰/اگست کو وجے دت اور پال لیوس کے ناموں سے دو رپورٹیں شائع کیں۔ پہلی مختصر اور دوسری قدرے طویل رپورٹ تھی اور دونوں میں یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ تبلیغی جماعت بھی ایک دہشت گرد جماعت ہے۔ رپورٹوں کے مطابق لندن دھماکہ سازش میں گرفتار ۲۳ مشتبہ نوجوانوں میں سے کم از کم سات کا اس جماعت سے تعلق ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ تعلق صرف اتنا ہے کہ انھوں نے لندن میں بعض مسجدوں میں تبلیغی جماعت کے پروگراموں میں حصہ لیا تھا۔ لیکن رپورٹوں کے ساتھ تصاویر وغیرہ دے کر تبلیغی جماعت سے وابستہ لوگوں میں بھی خوف ودہشت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ پال لیوس کی رپورٹ جس صفحہ پر شائع کی گئی اسی پر لشکر طیبہ سے متعلق بھی ایک رپورٹ چھاپی گئی اور اس میں لشکر کے بانی حافظ سعید کی تصویر اور پہلی رپورٹ میں تبلیغ میں جاتے ہوئے باریش مسلمانوں کی تصویر چھاپ کر دونوں میں نادیدہ رشتہ قائم کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔

دہشت گردوں کے بارے میں حکومت اور میڈیا کے ضرورت سے زیادہ ردعمل کا پوسٹ مارٹم پرفل بدوائی نے کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جان بوجھ کر ضرورت سے زیادہ ردعمل ظاہر کیا جاتا ہے جس کے بھیانک نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔انھوں نے قومی سلامتی کے مشیر ایم کے نارائنن کے اس بیان پر کہ القاعدہ جموں وکشمیر میں سرگرم ہے، اظہار خیال کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھا ہے:

''باضابطہ وضاحتوں یا وہائٹ پیپر کے ذریعہ ٹھوس ثبوت پیش کئے جانے کے بجائے ہمارے پاس صرف ایک شخص کا بیان ہے یا پھر میڈیا میں غیر مصدقہ اور بغیر حوالے کی خبریں ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ایک انتہائی طویل شخص ہے جو غیر ملکی زبان بولتا ہے اور اشاروں سے کھانا اور ٹھہرنے کی جگہ مانگتا ہے، وہ تیس رکنی القاعدہ یونٹ کا سرغنہ ہے اور لشکر، جیش محمد اور حزب المجاہدین جیسی دہشت گرد تنظیموں سے ہاتھ ملا چکا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔ بتایا جاتا ہے کہ اس قسم کی باتیں وائرلیس پر سنی گئی ہیں۔مگر وائرلیس پر سنی گئی بات غیر معتبر ہوتی ہے اور اس کے غلط مفہوم نکالے جا سکتے ہیں۔یہ ثابت کرنے کے لئے ٹھوس حقائق کی ضرورت ہے کہ اسامہ بن لادن اور الظواہری جو بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں، ان کے آدمی ہندوستان میں سرگرم دہشت گردوں کو کن ذرائع سے ہدایات دے سکتے ہیں۔ برطانوی پولیس بھی ہیتھرو سازش میں ایسے تعلقات کا پتہ لگانے میں ناکام رہی ہے۔اس قسم کی کمزور باتوں کی بنیاد پر ہندوستان میں القاعدہ کے پہنچنے کی ڈگڈگی پیٹنا یقیناً غیر ذمہ دارانہ قدم ہے۔اس سے کئی قابل اعتراض مقاصد کی تکمیل ہوتی ہے۔اول یہ کہ القاعدہ ہمارے سامنے ایک شیطانی اور ناقابل تسخیر طاقت کی تصویر بناتا ہے جس سے امریکہ بھی اپنے شہریوں کو نہیں بچا سکا تو پھر ہندوستان کی کیا بساط ہے۔دوم یہ کہ دہشت گردانہ خطرے کو مبالغہ آمیز انداز میں پیش کرنے سے عوام میں خوف ودہشت پیدا ہوتی ہے۔ ایک نئی اور بکواس اصطلاح ''اسلامی فاشزم'' گھڑ کر اور فلسطینی قوم پرستوں، عراقی مخالفت، حزب اللہ اور القاعدہ کو ایک ہی زمرے میں رکھ کر امریکی صدر جارج بش نے یہی کیا ہے۔بش کی غلطی کو ہندوستان میں دہرانا فرقہ وارانہ نتائج سے بھرپور ہوگا۔اس سے ہندوتو کی دہشت گردی مخالفت کو جواز مل جائے گا اور متعدد مذہبی گروپوں بلکہ فرقوں کو شیطانی قرار دینے کی اجازت مل جائے گی۔سیمی سے لے کر مدارس اور مسلم پرسنل لاء بورڈ جیسے

اداروں اور تنظیموں کے خلاف ثبوت ہوں یا نہ ہوں، انہیں القاعدہ سے متعلق بتایا جاسکتا ہے جس کے بھیانک نتائج برآمد ہوسکتے ہیں''۔

میڈیا کوریج کے فوری اثرات

ریسرچ اینڈ انالیسس ونگ ''را'' کے سابق سکریٹری وکرم سود نے بھی میڈیا کے اس خطرناک انداز کی شدید مخالفت کی ہے۔ انھوں نے ہندوستان ٹائمز کے ۳۰ راگست ۲۰۰۶ء کے شمارے میں ''نو نیوز از گڈ نیوز'' یعنی کوئی خبر اچھی خبر نہیں ہے، کے عنوان سے ایک مضمون لکھا ہے جس میں میڈیا کی گمراہی کا پوسٹ مارٹم کیا گیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کی اہمیت نہیں ہے کہ ہم کیا دکھا رہے ہیں بلکہ اس کی اہمیت ہے کہ کیسے دکھا رہے ہیں۔ ہندوستان میں جہاں ہم دہشت گردانہ حملوں کی زد پر ہیں، اس بات کی زیادہ اہمیت ہے۔ انھوں نے ایک امریکی ماہر نفسیات جیسکا ہیمبلین (Jassica Hamblin) کے ایک مطالعے کا حوالہ دیا ہے جو انھوں نے دہشت گردانہ حملوں کی میڈیا کوریج کے اثرات پر کیا ہے۔

رپورٹ کے مطابق جن لوگوں نے گیارہ ستمبر ۲۰۰۱ء کے دہشت گردانہ حملوں کو تقریباً آٹھ گھنٹے تک ٹی وی پر دیکھا انھوں نے زیادہ سخت ردعمل ظاہر کیا۔ جبکہ ٹی وی پر اسے نہ دیکھنے والوں نے اتنا سخت ردعمل ظاہر نہیں کیا۔ بڑی عمر کے لوگوں نے آٹھ گھنٹے کی کوریج سے جو ردعمل ظاہر کیا بچوں نے وہی ردعمل تین گھنٹے کی کوریج دیکھ کر کیا۔ اس مطالعے میں ۱۲۳۷ اسرائیلیوں کو دو گروپوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ایک گروپ کو دہشت گردانہ حملوں سے متعلق کلپنگ دکھائی گئی جبکہ دوسرے کو عام خبروں کی کلپنگ دکھائی گئی۔ اول الذکر نے ان رپورٹوں کو دیکھنے کے بعد بہت زیادہ اضطراب کا مظاہرہ کیا جبکہ دوسرا گروپ مضطرب نہیں ہوا۔ دراصل کسی بھی واقعہ یا تباہی کے بعد میڈیا کا رول بہت اہم ہو جاتا ہے۔ اس کا کام اطلاعات بہم پہنچانا ہوتا ہے نہ کہ لوگوں کو خوفزدہ کرنا۔ اسے یہ بتانا چاہئے کہ حکومت نے کیا اعلانات کیے ہیں، کیا امداد دی جارہی ہے اور متاثرین کو کیا کرنا چاہئے کیا نہیں کرنا چاہئے۔ لوگوں کو ان کی مدد کیسے کرنی چاہئے اور میڈیا کو چاہئے کہ وہ

لوگوں میں اعتماد اور طاقت پیدا کرے۔ وہ ایسا کر بھی سکتا ہے۔ اسے معلوم ہونا چاہئے کہ لاشوں کو دکھانے اور تباہی و بربادی کی منظر کشی کرنے سے دہشت گرد فائدہ اٹھاتے ہیں۔

دراصل میڈیا بھی اس طریقہ رپورٹنگ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے اور جیسا کہ پہلے لکھا گیا ہے وہ تخلیق کردہ خوف کو کیش کراتا ہے اس کو بیچتا ہے۔ اسے اس کی فکر نہیں کہ اس سے عوام میں جو خوف و دہشت پیدا ہو رہی ہے اس کے بھیانک نتائج نکل سکتے ہیں یا اس سے عوام فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم ہو سکتے ہیں۔ یہ رویہ انتہائی افسوسناک ہے اور اس کو بدلنے کی ضرورت ہے۔

قومی پریس اور فرقہ واریت

یہ کہنا شاید بہت حد تک صحیح ہوگا کہ تقریباً ہر زبان کے اخبارات اپنے فرقہ، اپنے طبقہ یا اپنے قارئین کے مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ اسے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بالواسطہ وہ ''فرقہ پرست'' ''طبقہ پرست'' یا ''قارئین پرست'' ہوتے ہیں۔ اپنے فرقہ یا طبقہ کے مفادات کے تحفظ کے تحت کام کرنا صحیح بھی ہوتا ہے اور غلط بھی۔ اگر اس ایک قسم کی فرقہ پرستی یا طبقہ پرستی سے دوسرے فرقوں اور طبقوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے تو میرے خیال میں شاید یہ سوچ غلط نہیں ہے۔ لیکن اگر اس سوچ سے دوسروں کو نقصان پہنچتا ہے یا ان کے مفادات پر ضرب پڑتی ہے تو پھر اس کی حمایت نہیں کی جاسکتی۔ اگر یہ سوچ دوسرے فرقوں اور طبقوں کی مخالفت اور دشمنی پر مبنی ہے تو یقیناً قابل نفرت اور قابل مذمت ہے اور اس سوچ اور ذہنیت کی بہر حال مذمت کی جانی چاہئے۔ اس طرح اگر یہ کہا جائے کہ اردو اخبارات بھی بالواسطہ کسی حد تک فرقہ پرست ہوتے ہیں یا فرقہ واریت کی ڈگر پر چلتے ہیں تو کوئی حرج نہیں ہونا چاہئے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اردو صحافت کی جذباتیت اردو والوں کے لئے نقصاندہ ہے لیکن قومی پریس کی ''فرقہ واریت'' دوسرے فرقوں کے لئے نقصاندہ ہے۔ اردو اخبارات اگر اردو والوں کے بالخصوص مسلمانوں کے مسائل اٹھاتے ہیں تو اس میں غیر اردو والوں کے تئیں منافرت کا جذبہ نہیں ہوتا بلکہ واحد مقصد اردو والوں یا مسلمانوں کے مسائل سے لوگوں کو واقف کرانا اور ان کو حل کرانے کی کوشش کرنا ہوتا ہے۔ (چونکہ آجکل اردو زبان کو مسلمانوں کی زبان بنا کر پیش کیا جاتا ہے اس لئے اردو والوں سے مراد عموماً مسلمان ہوتے ہیں۔)

صحافیوں کی تحریروں پر فرقہ واریت کا رنگ عموماً فرقہ وارانہ فسادات کے دوران زیادہ چڑھتا

ہے۔اس موقع پر اردو اخبارات مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی زیادتی کو اجاگر کرنے ہی میں لگے رہتے ہیں جبکہ ہندی اور انگریزی کے اخبارات جس انداز کی رپورٹنگ کرتے ہیں اس سے ماحول اور خراب ہو جاتا ہے۔خاص طور پر ہندی پریس میں امر اجالا، دینک جاگرن اور آج جیسے اخبارات اس سلسلے میں زیادہ بدنام ہیں۔اگر ہم بابری مسجد انہدام سے قبل کی ایودھیا تحریک کے دوران ان اخباروں کی رپورٹنگ کا جائزہ لیں تو ایسا لگے گا جیسے وہ کسی زبان کے اخبار نہیں بلکہ ہندوازم کے پروپیگنڈے کے اخبارات ہیں۔ ایل کے آڈوانی کی رام رتھ یاترا ہو یا وشو ہندو پریشد کی اجودھیا تحریک کے دیگر پروگرام ہوں۔ ان اخبارات نے ماحول کو خراب کرنے میں بڑا یوگدان دیا تھا۔اگر ان اخبارات اور انڈیا ٹوڈے جیسے ہندی کے رسالوں نے مثبت رپورٹنگ کی ہوتی تو نہ تو ایل کے آڈوانی ''ہنومان'' کا اوتار بن جاتے اور نہ ہی ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے تئیں نفرت کی آگ بھڑکتی۔ان اخبارات کی تحریروں نے بابری مسجد انہدام کی فضا ساز گار کرنے میں بڑا اہم رول ادا کیا تھا۔

انہدام کے بعد جب جگہ جگہ فسادات بھڑک اٹھے تو مذکورہ اخبارات نے اس آگ کو مزید بھڑکنے میں مدد دی۔ایسی گمراہ کن رپورٹنگ کی گئی کہ الحفیظ والامان! متعدد پرامن شہروں میں خطرناک رپورٹنگ کے نتیجے میں رفتہ رفتہ حالات خراب ہوئے اور نفرت و کشیدگی کی فضا بگڑتے بگڑتے فرقہ وارانہ فسادات میں بدل گئی۔ان فرقہ پرست اخبارات کی رپورٹنگ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا۔جب بھی فسادات مابعد انہدام کی تاریخ مرتب کی جائے گی تو زہریلی صحافت کو بھی موضوع بحث بنایا جائے گا۔

البتہ گجرات فسادات میں ان اخبارات اور نیوز چینلوں کی رپورٹنگ کا انداز مختلف رہا۔اس کے کئی اسباب ہیں۔سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ مسلم کش فسادات اتنے بڑے پیمانے پر بھڑکائے گئے تھے کہ ان کو نظر انداز کرنا مشکل نہیں، ناممکن تھا۔اگر قومی پریس اس وقت بھی اپنا سابقہ رویہ اپنائے رکھتا تو اس کے پوری دنیا میں بدنام ہو جانے کا خطرہ تھا۔دوسرے یہ کہ فسادات کی کوریج کے دوران کئی صحافیوں کو بھی ہندو اور بعض کے گجراتی ہونے کے باوجود نشانہ بنایا گیا اور ان کو بھی

زدوکوب کیا گیا۔فسادات اتنے بڑے پیمانے پر بھڑکائے گئے تھے کہ پوری دنیا کا میڈیا وہاں پہنچ گیا تھا۔اب ایسے میں اس کی پردہ پوشی آسان نہیں تھی۔بعض تجزیہ نگاروں کا یہ بھی کہنا ہے کہ قومی پریس نے سنگھ پریوار کو بے نقاب کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور یہ موقع اس کے لئے غنیمت تھا اس لئے اس نے کھل کر فسادات کی کوریج کی۔اگر ہم غور کریں تو پتہ چلے گا کہ شروع کے چند دن قومی پریس اتنا بے باک نہیں ہوا تھا۔چند روز کے بعد اس کی انصاف پسندی نے جوش مارا اور پھر گجرات میں آر ایس ایس کی ہندوتو کی تجربہ گاہ پوری دنیا کے سامنے کتاب کی مانند کھل گئی۔اس دوران جبکہ انگریزی اور ہندی کے اخبارات فسادیوں کو بے نقاب کر رہے تھے اور مسلمانوں پر ہو رہے مظالم کا کچا چٹھا پیش کر رہے تھے تو اس وقت بھی گجراتی اخبارات اپنی فرقہ پرستی پر قائم تھے اور انھوں نے نہ صرف فسادیوں کا دفاع کیا بلکہ مسلمانوں کو فساد بھڑکانے کا ذمہ دار قرار دیا۔

ہندی پریس کی ذہنیت:

دراصل اس سلسلے میں انگریزی اور ہندی اخبارات کی ذہنیت کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ان دونوں کی ذہنیت گرچہ صاف ستھری نہیں ہے،لیکن پھر بھی انگریزی اخبارات کی ذہنیت اتنی خراب نہیں ہے جتنی کہ مجموعی طور پر ہندی اخبارات کی ذہنیت خراب ہے۔انگریزی صحافیوں کی سوچ یہ ہے کہ انھیں عالمی سطح پر اپنی شکل وصورت ٹھیک ٹھاک رکھنی ہے اگر ان کی امیج خراب ہوگئی تو دنیا میں ان کی بدنامی ہوگی۔اس لئے انگریزی پریس قدرے سنبھل کر چلتا ہے مگر ہندی پریس کے منھ میں نہ کوئی لگام ہے اور نہ ہی اسے کوئی روکنا چاہتا ہے۔انگریزی اخبارات انٹرنیشنل مارکیٹ میں یہ دکھانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی رپورٹنگ بہت صاف ستھری ہے لیکن ہندی میڈیا کو انٹرنیشنل مارکیٹ میں نہ تو جانے کی ضرورت ہے اور نہ اس کی رسائی ہے۔تاہم ہندی میڈیا میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی گنیش شنکر ودیارتھی رہے ہیں تو آزادی کے بہت بعد اکشے، راجندر ناتھ ،سریندر پرتاب سنگھ، پربھاش جوشی اور راجندر یادو جیسے لوگ رہے ہیں جنھوں نے ہندی صحافت کو سنسنی خیزی سے بچائے رکھنے کی کوشش کی۔

ہندی کے بعض سنجیدہ تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ ہندی پریس کی ذہنیت کو سمجھنا ہو تو خاص مواقع پر ان کی رپورٹنگ ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ مثال کے طور پر کرگل کے دوران ان اخبارات نے جنگ جیسی صورت حال پیدا کردی تھی۔ جہاں ایک طرف یہ اخبارات پاکستان کو سبق سکھانے کی تلقین کرتے تھے وہیں آئی ایس آئی اور اس کے کارکنوں کے تعلق سے بے بنیاد اور گمراہ کن رپورٹنگ کرکے ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی زندگی اجیرن کرنے کی بھی کوشش کررہے تھے۔ ان لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندی کے سیکولر صحافی کھیل کے میدان میں خراب کارکردگی پر اس وقت کے کرکٹ کپتان اظہر الدین کی مذمت کرنے میں متحد ہو گئے تھے۔ یہاں تک کہ ایڈٹ پیج پر اظہر کے خلاف مضامین لکھے گئے لیکن جب سچن تندولکر اور سوروگانگولی اپنی خراب کارکردگی کے دور سے گذرے تو ان کے خلاف ایسی زہر پاشی نہیں کی گئی۔ اگر ہندوستان کی کرکٹ ٹیم پاکستان کو شکست دیدے تو اس سے بڑی فتح اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ پاکستان کو کھیل کے میدان میں شکست دینا ایسا ہی ہے جیسے کہ اسے جنگ کے میدان میں شکست دینا۔ اس وقت جبکہ ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات میں خوشگوار حد تک تبدیلی آرہی ہے تو ہندی پریس کی زبان تھوڑی شائستہ ہوگئی ہے، لیکن اس سے پہلے یہی پریس ہے جو پاکستان کو دہشت گرد ملک اعلان کروانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگائے ہوئے تھا۔ ہندی پریس اس کا پروپیگنڈا کرتا رہا ہے کہ ہم سیکولر اور لبرل روایات اور قدروں کے حامی ہیں اور پاکستان دہشت گردوں کی حمایت کرنے اور دہشت گردوں کی پرورش کرنے والا ملک ہے۔ ہم امن چاہتے ہیں اور وہ جنگ چاہتا ہے۔ ہمارے یہاں اظہار خیال کی آزادی ہے اور پاکستان میں نہیں ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت پاکستانی پریس میں دھڑلے کے ساتھ جو چیزیں لکھی جارہی ہیں سابقہ وقت میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

ہندی پریس کی جو ذہنیت ہے اس کے تحت وہ ہندو سیاسی پارٹی کی مانند برتاؤ کرتا ہے۔ ہندی پریس چاہتا ہے کہ مسلمانوں کے مسائل کا حل وہی پیش کرے۔ اگر مسلمان اپنے بارے میں اور اپنی قوم کے بارے میں لکھتا ہے تو اس کو اہمیت نہیں دی جاتی۔ ہندی پریس چاہتا ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے انداز میں سوچیں اور اپنے اندر ہندوؤں کی خواہشات کے مطابق اصلاح کریں۔

ہندی پریس اپنے کٹر پن کا دفاع یہ کہہ کر کرے گا کہ یہ اس کی قدریں ہیں اور اس کا کلچر ہے، لیکن مسلم کٹر پن کی مخالفت اور مذمت کرے گا۔ اگر کسی ریاست میں مسلمانوں کو ریزرویشن دینے کا اعلان کیا جاتا ہے تو ہندی پریس اسے بہت بڑا خطرہ بتاتا ہے۔ بعض ہندی اخبارات میں کٹر ہندوازم کا خوب پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور برہمنی سوچ کو اجاگر کیا جاتا ہے۔ دراصل ہندی پریس کی سوچ برہمنی سوچ ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ اس ذہنیت کا مظاہرہ تو کرتا ہی ہے دلتوں اور پسماندہ ہندوؤں کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کرتا ہے۔ جب پہلے سے ہی ایک ذہن بنا رہے گا تو پھر کوئی بھی صحافی خواہ وہ کسی بھی زبان کا ہو غیر جانبدار نہیں ہوسکتا۔ جب ایک ہندی صحافی کے ذہن میں یہ بات بیٹھی رہے گی کہ اجودھیا میں مندر توڑ کر مسجد بنائی گئی تھی تو پھر اس کے نزدیک ملکی قانون کی کیا اہمیت رہ جائے گی۔

حالانکہ ہندی پریس کو یہ سمجھنا چاہئے کہ ہندی صرف ہندوؤں کی زبان نہیں ہے۔ ہندی اخبارات ہندو بھی پڑھتے ہیں، مسلمان بھی پڑھتے ہیں، سکھ بھی پڑھتے ہیں عیسائی بھی پڑھتے ہیں اور دلت بھی پڑھتے ہیں۔ لیکن ہندی پریس عموماً ہندوؤں کے اور وہ بھی تنگ نظر ہندوؤں کے نقطۂ نظر سے سوچتا ہے۔ جبکہ زبان ترسیل کا ذریعہ ہے اسے فرقہ پرست نہیں بنانا چاہئے۔ پاکستانی سفارت خانہ کے باہر چند مسلمانوں کے مظاہرہ یا گوانٹانا موبے میں قرآن کی بے حرمتی کے خلاف جامع مسجد کے باہر مسلمانوں کے مظاہرہ کی تصویریں چھاپ دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہندی پریس مسلم مسائل کو بھی اٹھا رہا ہے۔ دراصل ہندی پریس کی ذہنیت ایسی ہے کہ وہ مسلم مسائل کو اٹھا ہی نہیں سکتا۔ اگر اٹھائے گا بھی تو ایک تنگ نظر اور کٹر ہندو کی حیثیت سے اٹھائے گا۔ ایسی صورتحال میں ہندی پریس فرقہ واریت کے دائرے سے باہر نہیں نکل سکتا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہندی پریس کی ذہنیت کو بدلنا اتنا آسان نہیں ہے۔

انگریزی پریس کی نفسیات:

جہاں تک انگریزی پریس کا تعلق ہے تو انگریزی کا صحافی ایک قسم کے احساس برتری میں

مبتلا رہتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ سب سے قابل، سب سے ذہین اور سب سے باصلاحیت ہے۔ اس کے سامنے دیگر زبانوں کے صحافی بونے ہیں اور وہ حالات حاضرہ اور سیاسی حالات و معاملات کا تجزیہ کرنے کی سمجھ سب سے اچھی اور سب سے زیادہ رکھتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتا ہے وہ حرف آخر ہے اور اس پر تنقید اور نکتہ چینی کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ چونکہ انگریزی کے اخبارات اعلی سوسائٹی کے لوگ پڑھتے ہیں اس لئے وہ بھی خود کو اعلی و ارفع سمجھتے ہیں اور دوسری زبان کے صحافیوں کو کمتر سمجھتے ہیں۔لیکن کیا واقعتاً ایسا ہے؟ اگر صحیح تجزیہ کیا جائے تو اس میں بہت زیادہ صداقت نظر نہیں آئے گی۔

حقیقت یہ ہے کہ دیگر زبانوں کے صحافی بھی ذہین، باصلاحیت اور قابل ہوتے ہیں اور حالات حاضرہ کا تجزیہ کرنے اور سیاسی پیشین گوئیاں کرنے کا ہنر ان کو بھی آتا ہے۔ بالخصوص اردو کے صحافیوں کو انگریزی کے صحافی کسی بھی طور پر قبول نہیں کر پاتے اور ان کی تجزیاتی تحریروں کو کمتر سمجھتے ہیں۔ان کے نزدیک وہ سب سے زیادہ وسیع الذہن اور روشن خیال ہیں اور دوسری زبانوں کے خصوصاً اردو کے صحافی تنگ نظر اور کند ذہن ہیں لیکن درحقیقت ایسا ہے نہیں۔ اگر آپ انگریزی اور اردو کے اخبار اٹھا کر دیکھیں اور خاص طور پر اداریوں اور تجزیاتی رپورٹوں کا موازنہ کریں تو اردو کا معیار کسی بھی طرح انگریزی کے معیار سے نیچا نہیں ملے گا۔ جہاں تک علاقائی زبانوں کا تعلق ہے تو انگریزی کے اخبارات بعض اوقات علاقائی زبانوں کے اخبارات کی خبروں کو نقل کر کے داد تحسین حاصل کرتے ہیں، البتہ ایک بات ماننی پڑے گی کہ انگریزی پریس جس خبر کو چاہے ایک قومی ایشو بنا سکتا ہے اور کسی قومی ایشو کو نظر انداز کر کے اس کی اہمیت کو ختم کر سکتا ہے اور وہ خبر جو قومی بحث کا موضوع بننے کے امکانات رکھتی ہو اپنی موت آپ مر سکتی ہے۔ عارف اور گڑیا کا معاملہ ہو یا عمرانہ کا معاملہ ہو، واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں واقعات ایسے نہیں تھے کہ ان کو قومی سطح پر موضوع بحث بنایا جاتا۔لیکن اس نے ان کو قومی بحث کا موضوع بنوا دیا۔جبکہ اسی طرح کے دیگر واقعات کو اس نے قومی بحث کا موضوع نہیں بننے دیا۔ چاہے شادی شدہ میاں بیوی کو بہن بھائی بنا دینے والا مقامی پنچایت کا فیصلہ ہو یا غیر برادری میں شادی کرنے پر میاں بیوی کو قتل کرنے کا پنچایتی فیصلہ

ہو۔ان کو قومی پریس نے نہیں اچھالا۔(چونکہ یہ معاملات مسلمانوں سے متعلق نہیں تھے۔اس لئے ان کو اچھالا نہیں گیا۔)

چونکہ ان اخباروں میں کسی بھی معاملہ کو قومی سطح پر اچھالنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس لئے ان میں شائع کسی بھی سنسنی خیز خبر کا قومی سطح پر اثر پڑتا ہے اور چونکہ دوسری زبانوں کے اخبارات بھی ان خبروں کو نقل کرتے ہیں لہٰذا وہ خبر ہر زبان کے اخبار کی خبر بن جاتی ہے۔ایسے میں انگریزی صحافی بعض اوقات شرارت کرنے سے بھی گریز نہیں کرتے اور بعض خبروں کو نمک مرچ لگا کر قارئین کے سامنے پیش کر دیتے ہیں۔یہ جاننے کے باوجود کہ اس کے منفی اثرات مرتب ہوں گے وہ محض اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنے کی غرض سے ایسا کرتے ہیں۔ان کو اس سے کوئی مطلب نہیں ہوتا کہ ان کی خبر یا رپورٹ کے کیا سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔یہ لوگ اکثر اوقات دوسروں بالخصوص مسلمانوں اور اسلام کو بدنام کرنے کی غرض سے معاملات کو اچھالتے ہیں اور اس کی آڑ میں اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔دوسری زبانوں کے اخبارات انھیں رپورٹوں کو اپنے انداز میں پیش کرکے، جس کا مقصد ان کی مذمت کرنا ہوتا ہے، بالواسطہ ان کی مدد کرتے ہیں۔اگر ان کی ایسی رپورٹوں پر کوئی ردعمل نہ ہو تو شائد ان کا کوئی اثر بھی نہیں ہوگا۔

آج کے ٹی وی سیریل: ''موضوعاتی'' جائزہ

ایسی خبریں پہلے کے مقابلے میں اب زیادہ پڑھنے کو ملتی ہیں جن میں کوئی مجرم یہ انکشاف اور اعتراف کرتا ہے کہ اس کو جرم کرنے کی ترغیب کوئی فلم یا ٹی وی سیریل دیکھ کر ملی۔ یہ اعتراف بذات خود اس بات کا اعتراف ہے کہ ٹی وی اور فلمیں ہماری زندگی کو نہ صرف متاثر کر رہی ہیں بلکہ منفی انداز میں زیادہ متاثر کر رہی ہیں۔ اگر فلموں کی بات کریں تو ایسی فلمیں یا تو بہت کم بنتی ہیں جن میں سماج پر مثبت اثرات مرتب کرنے کے بھرپور امکانات ہوں یا پھر اگر بنتی ہیں تو ناظرین ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ اس کا اطلاق ٹی وی سیریلوں پر بھی ہوتا ہے۔ ایسے سیریل جن کے دامن مثبت امکانات سے پُر ہوں آج شاذ و نادر ہی بنائے جا رہے ہیں۔ اگر میں غلط نہیں ہوں تو بیشتر سیریلوں کے تانے بانے منفی دھاگوں سے بنے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اثرات بھی سماج پر منفی انداز میں پڑ رہے ہیں۔

آج کے سیریلوں کے موضوعات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی جھجھک نہیں ہوگی کہ ان میں مقصدیت کا فقدان ہے اور چونکہ ان کی روح مقصدیت سے عاری ہوتی ہے، اسی لئے وہ سیریل مثبت اثرات مرتب نہیں کر پاتے۔ مقصدیت کے فقدان کے سبب ہی یہ سیریل بے سمتی کے بھی شکار ہوتے ہیں اور ان میں بھرتی کی چیزیں غیر ضروری طور پر بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ گذشتہ دنوں دوردرشن پر منشی پریم چند کی کہانیاں فلما کر دکھائی جا رہی تھیں لیکن وہ کہانیاں پرائیویٹ چینلوں پر نظر نہیں آئیں۔ پریم چند کی کہانیوں میں مقصدیت ہے اور وہ کہانیاں ہمارے سماج کے سروکار سے ہمیں روبرو کراتی ہیں اور چونکہ پرائیویٹ ٹی وی چینلوں کو مقصدیت نہیں سنسنی خیزی چاہیئے اس لئے انھیں پریم چند یا ان جیسے دیگر کہانی نویسوں کی کہانیاں فلمانے اور

دکھانے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ آج کسی بھی چینل پر دکھائے جانے والے کسی بھی سیریل کی دو چار قسطیں دیکھ لیجئے مذکورہ دعوی کی تصدیق ہو جائے گی۔

اس وقت ٹی وی کے جو سیریل مقبول ہیں اور جن کو گھروں میں کام سے فارغ عورتیں دیکھتی ہیں وہ نہ صرف ان خواتین کے بلکہ پوری فیملی کے ذہن و مزاج اور کردار کے تعلق سے انتہائی مضر ہیں۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ سنسنی خیزی ان سیریلوں کی جان ہے اگر سنسنی خیزی نہیں ہے تو ان کا آگے بڑھنا مشکل ہے۔ ان سیریلوں کے کردار کا اگر مطالعہ کریں تو پائیں گے کہ بیشتر ایسے ہیں جن کے یہاں نیک نیتی کا دور دور تک شائبہ نہیں ہوتا۔ اگر ایک دو کردار ایسے ملیں گے بھی تو بقیہ کردار ان کی خوبیوں کو اپنے عیوب سے ڈھانپ دیتے ہیں۔ اس لئے شاید ہی کوئی انکار کرے کہ ان کرداروں میں نیک جذبے کے بجائے انتقامی جذبے کی کارفرمائی ہوتی ہے اور ایک کردار کی انتقامی کارروائی ختم بھی نہیں ہوتی کہ دوسرے کی شروع ہو جاتی ہے۔ یہ کردار ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور زیر کرنے کے لئے انتہائی گھٹیا اور اوچھے ہتھکنڈے اختیار کرتے ہیں اور سازشوں کے ایسے تانے بانے بنتے ہیں کہ سامنے والا ان میں الجھے بغیر نہیں رہ پاتا۔

ان کہانیوں میں عام زندگی کی جھلک نہیں ہوتی۔ اگر کوئی ان میں اپنا معاشرہ تلاش کرنے کی کوشش کرے تو شاید اسے مایوسی ہوگی۔ اعلاترین سوسائٹی یا امیر و کبیر طبقہ کے ارد گرد بنی گئی کہانیوں میں سماج کا نچلا یا درمیانہ طبقہ کہیں کھو گیا ہے۔ شاید ہی کوئی ایسی کہانی ملے جن میں مذکورہ طبقات کی نمائندگی کرنے والا کوئی کردار موجود ہو۔ اگر کوئی ہوگا بھی تو گھریلو ملازم ہوگا یا دفتر میں چپراسی ہوگا۔ درمیانہ اور نچلے طبقہ کے جو مسائل ہیں اور ان کی جو مجبوریاں و مایوسیاں ہیں وہ ان میں کہیں دکھائی نہیں دیتیں۔ عالیشان عمارتیں، شاندار کاروں میں چلنے والے قیمتی اور مہنگے لباس میں ملبوس کردار اور ان کے ذریعہ دولت کی نمائش اور بربادی۔ ایسا لگتا ہے جیسے ان لوازمات کے بغیر کوئی کہانی مکمل ہی نہیں ہو سکتی۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ لوگ اپنی سازشوں اور گھٹیا امنگوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں اور کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ ان کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں آتی۔ بعض اوقات تو ناظرین کے ذہن میں یہ سوال ضرور اٹھتا ہوگا کہ کیا اعلا سوسائٹی کے لوگ اتنے گھٹیا

اتنے اوچھے اور اتنے کم ظرف ہوتے ہیں۔کیا یہی اعلا سوسائٹی اور اونچا طبقہ ہے اور ان سوسائٹیوں میں ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں یا پھر ان کرداروں کی فلم سازی کر کے اعلا سوسائٹی کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔یہ سوال بھی اٹھتا ہے کہ کیا اس طبقے میں کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے کیونکہ اگر مسائل ہوتے تو ان کو حل کرنے کے بجائے شاطرانہ چالوں میں اپنی توانائی ضائع نہیں کی جاتی۔کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ یہ کہانیاں لکھنے والے کبھی غریبوں کو بھی اپنا موضوع بنائیں، ان کے مسائل اٹھائیں، ان کی زندگی کے نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ اور ان کی زندگی میں بار بار آنے والے طوفانوں کو مرکزی خیال بنائیں اور امیر و کبیر کیرکٹروں کے بجائے غریب کردار کی تراش خراش کریں۔آج چاروں طرف مسائل کے انبار لگے ہوئے ہیں کیا ان میں سے کوئی ایک مسئلہ چن کر اور اس کو بنیاد بنا کر سیریل نہیں بنائے جا سکتے ہیں۔

آج کہانیوں کے کردار چونکہ امیر و کبیر ہوتے ہیں اور بڑے باپوں کی بگڑی اولاد ہوتی ہیں، اس لئے ان کے نزدیک پیسے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔لاکھوں، کروڑوں اور اربوں روپے کی بات کرتے ہیں اور کروڑوں روپے کے نقصان پر بھی یوں لا پروائی کا مظاہرہ کرتے ہیں جیسے کروڑوں کا نہیں سیکڑوں کا نقصان ہوا ہے۔ان حالات میں بھی ان کی پیشانیوں پر بل نہیں پڑتے۔کیا ایسی کردار سازی کرتے وقت کہانی نویسوں اور ایسے سیریل پیش کرنے والوں کے ذہن میں یہ بات نہیں اٹھتی کہ اس سے عام آدمی احساس محرومی کا شکار ہوگا اور وہ بھی دولت مند بننے کے جائز و ناجائز ہتھکنڈے اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔احساس محرومی آدمی کو زوال کے کس گہرے گڈھے میں گرا دیتا ہے اور اس سے معاشرہ میں کیا کیا برائیاں جنم لیتی ہیں، شاید ان لوگوں کو اس کا احساس نہیں ہے یا وہ احساس کرنا نہیں چاہتے۔یہ احساس محرومی دراصل سماج میں مجرمانہ ذہنیت پیدا کرتا ہے اور جرائم پیشہ افراد کی پرورش و پرداخت کرتا ہے۔ آج کے بیشتر جرائم کی تہہ میں کہیں نہ کہیں احساس محرومی کی کارفرمائی ضرور ہوتی ہے۔

جہاں منفی کردار گھڑنے میں انتہا پسندانہ روش اختیار کی جاتی ہے وہیں بعض اوقات مثبت کردار پیش کرنے میں بھی اعتدال کا دامن چھوڑ دیا جاتا ہے۔ایسی مبالغہ آرائی سے کام لیا جاتا ہے کہ کردار

بے شمار خوبیوں کا حامل ہونے کے باوجود مافوق الفطرت بن جاتا ہے۔ وہ اپنے حقیقی مقام سے پھسل کر اس مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں اس پر یقین کرنا مغرب سے سورج نکلنے پر یقین کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ ایسے کرداروں پر ہنسی بھی آتی ہے اور ترس بھی آتا ہے۔ یہ سوال ذہن کو کریدتا ہے کہ کیا آج کے دور میں کوئی شخص اتنی ساری خوبیوں سے مزین ہوسکتا ہے؟ یہ کہانیاں جہاں حقیقت پسندی سے عاری ہوتی ہیں وہیں ان میں سماجی قدروں کی بری طرح پامالی کی جاتی ہے اور فحاشی و بے حیائی کی اس طرح تبلیغ کی جاتی ہے جیسے یہی ہمارے معاشرے اور ہماری زندگی کی اساس ہیں۔ اب تو شاید ہی کوئی سیریل نظر آتا ہے جس میں بن بیاہی مائیں نہ ہوں، غیر شادی شدہ والدین کے اولادیں نہ ہوں، اور طرفہ تماشہ یہ ہے کہ ان سماجی برائیوں کا نہ صرف دفاع کیا جاتا ہے بلکہ پرمپراؤں اور مریاداؤں کے نام پر ناجائز تعلقات اور ناجائز رشتوں کی اعلانیہ اور فخریہ تشہیر بھی کی جاتی ہے۔ اور ان رشتوں اور تعلقات کو گھما پھرا کر سند قبولیت بھی تفویض کی جاتی ہے۔ ان سطحی اور اوچھے مناظر کا نتیجہ ہے کہ آج انسانی رشتوں کا احترام جیسے اٹھ گیا ہے اگر اٹھا نہیں ہے اور اس طرح کے سیریل اگر دکھائے جاتے رہے تو ایک نہ ایک دن ضرور اٹھ جائے گا۔ حالانکہ رشتوں کی دہائی خوب دی جاتی ہے لیکن جس قدر دہائی دی جاتی ہے اس سے بھی کہیں زیادہ حقارت کے ساتھ ان کی پامالی کی جاتی ہے۔ ان کہانیوں میں نوعمر کرداروں کو اس انداز میں پیش کیا جاتا ہے کہ سماج میں لڑکے لڑکیوں پر اس کے منفی اثرات مرتب ہوسکتے ہیں۔ ان میں والدین کی نافرمانی اور ان کی بے احترامی کو بھی عام طور پر دکھایا جاتا ہے اور یہی نوعمر کردار جب ذرا بڑے ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کے محبوبوں کو چھیننے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتے۔ یہاں تک کہ بعض اوقات شادی شدہ جوڑوں کو بھی ان حرکتوں کا ارتکاب کرتے ہوئے دیکھا جا سکتا ہے۔

حیرت اس وقت ہوتی ہے جب اعلا سوسائٹی کی تعلیم یافتہ خواتین سازشوں کے جال بنتی ہیں اور نہ صرف جال بنتی ہیں بلکہ اس میدان میں عیار مردوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ سازشیں اتنی خطرناک ہوتی ہیں کہ اگر حقیقی زندگی میں بھی انھیں برتا جانا ممکن ہوتا تو سماجی ڈھانچہ تہس نہس ہو چکا ہوتا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج کے معاشرے میں عورتوں کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ ان کے

تمام مسائل حل ہو چکے ہیں۔ وہ تمام تر تفکرات سے آزاد ہو گئی ہیں اور اتنی خالی ہو گئی ہیں کہ انھیں خود کو مصروف رکھنے کے لئے سازشوں کے جال بننے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ آجکل عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عورتیں جن سیریلوں کو زیادہ پسند کر رہی ہیں ان میں سازشیں بھی زیادہ ہو رہی ہیں اور گھٹیا حرکتوں کا ارتکاب بھی زیادہ ہو رہا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ یہ سیریل صرف دیکھنے کی حد تک محدود ہیں اور ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ سچائی یہ ہے کہ ان کے اثرات لاشعوری طور پر مرتب ہو رہے ہیں اور اگر یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہا تو نہ صرف یہ کہ عورتوں کا تقدس اور احترام داؤ پر لگ جائے گا بلکہ خانگی اور ازدواجی زندگی کا ڈھانچہ بھی کمزور پڑ جائے گا۔ اگر ایسا ہوا تو سماج پر ایسے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں جو انتہائی خطرناک نتائج کے حامل ہوں۔

اگر سنجیدہ موضوعات پر بنائے گئے سیریلوں کے مقابلے میں ان سیریلوں پر نظر ڈالیں جن میں ہلکا پھلکا مزاح بھی ہوتا ہے یا معاشرے کی کسی برائی پر نشتر زنی کی جاتی ہے تو قدرے اطمینان ہوتا ہے کہ ان میں موضوع کا کچھ تو حق ادا کیا گیا ہے۔ ہلکے پھلکے مزاح والے یہ سیریل منفی سیریلوں کی بھیڑ میں قدرے غنیمت ہیں۔ آج ہنسی مذاق اور لطائف والے سیریل بھی خوب مقبول ہیں۔ آج کے دور میں ہر انسان دنیا جہان کی مصیبتوں اور پریشانیوں میں گھرا ہوا ہے اور شہری زندگی تو اور بھی تھکا دینے والی ہے۔ اگر دن بھر کا تھکا ماندہ شخص شام کو گھر پہنچ کر سازش کرتی عورتوں کو ٹی وی کے پردے پر دیکھے گا تو ظاہر ہے اس کی طبیعت اور مکدر ہو جائے گی۔ ہاں مزاحیہ سیریلوں کو دیکھ کر ذہن پر چھایا ہوا غبار کچھ نہ کچھ ضرور چھٹے گا اور اس کے تھکے ہوئے ذہن کو تھوڑا بہت سکون بھی ملے گا۔ اگر چند مزاحیہ سیریلوں کو منظر نامہ سے ہٹا دیا جائے تو یہ کہنا پڑے گا کہ آج کے سیریلوں کا معیار انتہائی پست ہو گیا ہے۔ پرائیویٹ چینلوں کے مقابلے میں دوردرشن پر دکھائے جانے والے سیریل یا ٹیلی فلموں کا جائزہ لیں تو ان میں منفی پہلو زیادہ نہیں ہوتا۔ ان میں کسی حد تک مقصدیت بھی ہوتی ہے اور ٹیلی فلموں میں کسی سماجی مسئلے سے بحث بھی دکھائی دے گی۔ جب پرائیویٹ چینلوں کی بھرمار نہیں تھی اور صرف دوردرشن کے نیشنل چینل پر سیریل آتے تھے تو ان کا معیار قدرے بلند ہوتا تھا۔ آج بھی دوردرشن نے کسی حد تک اپنا معیار برقرار رکھا ہے۔

پرائیویٹ چینلوں نے بہت زیادہ آلودگی پھیلا رکھی ہے۔جن سے ثقافتی شفافیت ماند پڑ گئی ہے اور تہذیبی کثافت نے ناظرین کے ذہن و مزاج کو مکدر کر دیا ہے۔

گجرات فسادات میں میڈیا کا رول

فسادات اور میڈیا کا آپس میں چولی دامن کا رشتہ ہے۔ جب بھی کہیں فرقہ وارانہ تشدد ہوتا ہے، میڈیا کا رول بہت اہم ہو جاتا ہے۔ اس دوران میڈیا جو بھی کردار نبھاتا ہے (مثبت یا منفی) وہ موضوع بحث بنتا ہے اور لوگ یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ فسادات کی رپورٹنگ اور کوریج میں میڈیا یا قومی پریس نے کیا رویہ اپنایا اور یہ کہ اس نے جانبداری سے کام لیا یا غیر جانبدارانہ ہو کر اپنا فرض منصبی ادا کیا۔

عموماً مسلمانوں کے تعلق سے میڈیا کا رول تسلی بخش نہیں رہتا ہے اور میڈیا پر یہ الزام لگایا جا تا رہا ہے کہ مسلمانوں کے بارے میں اس کا نظریہ اور اس کی سوچ منفی بنیادوں پر قائم ہے۔ یہ الزام بے بنیاد بھی نہیں ہے۔ ایسی لاتعداد مثالیں ہیں جن سے اس الزام کو سچ ثابت کیا جا سکتا ہے اور بارہا کیا جا چکا ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اسلامک اسٹڈیز میں ہر مہینے کسی خاص موضوع پر کسی ایک شخصیت کو توسیعی خطبہ کے لئے مدعو کیا جاتا ہے، جس پر بعد میں سوال و جواب اور بحث مباحثہ بھی ہوتا ہے۔ ۱۳ فروری ۲۰۰۲ء کے ماہانہ پروگرام میں اس خاکسار کو توسیعی خطبہ کے لیے منتخب کیا گیا اور مجھے میرے پیشے کے اعتبار سے موضوع دیا گیا ''مسلم مسائل اور نیشنل میڈیا''۔ میں نے اپنے مقالہ میں مثالوں اور ثبوتوں کی بنیاد پر یہ بتانے کی کوشش کی تھی کہ مسلم مسائل کے تعلق سے نیشنل میڈیا کا رول ہمیشہ منفی رہا ہے اور وہ یا تو مسلم مسائل سے واقف ہی نہیں یا پھر عمداً ان کو منفی اور غیر مثبت انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔ ۱۱ ستمبر کو امریکہ پر اور ۱۳ دسمبر کو ہندوستانی پارلیمنٹ پر حملوں کے تناظر میں میڈیا نے جو ہائے توبہ مچائی تھی اور جس طرح اسلام اور مسلمانوں کو گھناؤنے

انداز میں نشانہ بنایا گیا تھا، وہ اب بھی لوگوں کے ذہنوں میں تازہ ہے۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کے تعلق سے میڈیا کا ذہن صاف نہیں ہے تاہم ایسے بہت سے غیر مسلم صحافی بھی ہیں جو اپنی رپورٹنگ میں انصاف اور غیر جانبداری کا دامن نہیں چھوڑتے اور ایسے صحافیوں کے دم سے ہی صحافت کا وقار قائم ہے۔ (یہ مقالہ بھی اس کتاب میں شامل ہے)

۱۳ فروری کو میں نے اپنے مقالہ میں نیشنل میڈیا کا پوسٹ مارٹم کیا اور بمشکل ایک پندرھواڑہ کے اندر ۲۷ فروری کو گجرات کے گودھرا میں سابرمتی ایکسپریس کے ایک ڈبے کو نذر آتش کر کے حیوانیت کا رقص برہنہ پیش کیا گیا جس میں ۶۲ افراد زندہ جل گئے اور اس کے بعد گجرات میں جس طرح منظّم انداز میں حکومت کی سرپرستی میں مسلمانوں کا قتل عام کیا گیا اس نے نیشنل پریس کو بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جہاں میں نے اپنے مقالہ میں نیشنل میڈیا کو مسلم دشمن رویہ اختیار کرنے پر ہدف بنایا تھا وہیں اب میں میڈیا کو گجرات تشدد کی رپورٹنگ کرنے اور اس کی پاداش میں حکومت گجرات اور پولیس کے عتاب کا شکار بننے پر مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی جھجھک نہیں ہے کہ اگر میڈیا بالخصوص الیکٹرانک میڈیا نے تشدد کی غیر جانبدارانہ رپورٹنگ نہ کی ہوتی تو گجرات میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے، اس کے سلسلے میں حقائق سے واقفیت نہیں ہو پاتی۔ دنیا صرف وہ دیکھتی اور وہ جانتی جو مودی حکومت یا واجپئی حکومت دکھاتی یا بتاتی، لیکن میڈیا کی سچی رپورٹنگ کے طفیل میں فرقہ پرستوں، فاشسٹوں اور سرکاری مشینری کے درمیان ساز باز بے نقاب ہوگئی اور پوری دنیا نے دیکھ لیا کہ نریندر مودی لاشوں کے سوداگر ہیں، موت کے تاجر ہیں، مسلمانوں کی خوں ریزی کے رسیا ہیں اور انھوں نے لاشوں کے ڈھیر پر اپنا تخت سجا رکھا ہے۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں نے آر ایس ایس کی تجربہ گاہ میں مسلمانوں کے خون اور ان کی لاشوں سے سیاسی تجربہ کرنے اور ہندوتو کے دیو کو انسانی خون پلانے کے کارنامے کو جس طرح بے خوف ہو کر پیش کیا وہ قابل مبارکباد ہے اور اس سے امید کی کرن پیدا ہوئی ہے اور ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ ہندوؤں کی ایک بڑی اکثریت اس ملک میں امن و امان کی خواہاں ہے اور وہ مسلمانوں کے ساتھ کی جانے والی ظلم و جور کی وارداتوں کا خاتمہ چاہتی ہے۔

الیکٹرانک میڈیا میں اسٹار نیوز چینل اور اب این ڈی ٹی وی نے حق گوئی و بیباکی کا ایسا ریکارڈ قائم کیا ہے جو ہمیشہ یاد رہے گا۔ اس چینل کے اس وقت کے سیاسی ایڈیٹر راج دیپ سردیسائی نے جو پہلے بھی اپنی حق گوئی کے پرچم بلند کر چکے ہیں، گجرات میں گلبرگ سوسائٹی بہیمانہ قتل عام اور دیگر خونیں واقعات کی جرأت مندانہ انداز میں رپورٹنگ کر کے صحافت کے وقار کو چار چاند لگا دیا۔ راج دیپ سردیسائی نے صرف الیکٹرانک میڈیا ہی میں رپورٹنگ نہیں کی بلکہ اخبارات کے لئے بھی لکھ لکھ کر مسلمانوں کے قتل عام اور سنگھی ذہنیت کا پوسٹ مارٹم کیا۔ اس چینل کی حق گوئی نریندر مودی کو پسند نہ آئی اور انھوں نے اپنی ریاست میں اس پر پابندی عائد کر دی تھی، اور بالآخر جب اسٹار نیوز نے حکومت سے معافی مانگی تب اس پر عائد پابندی ختم ہوئی۔ لیکن اس کے بعد بھی اس چینل نے حق گوئی کا دامن نہیں چھوڑا اور آج بھی وہ اپنی روش پر قائم ہے۔

راج دیپ سردیسائی کی مانند ایسے غیر مسلم صحافیوں کی ایک طویل فہرست ہے جنہوں نے صحافت کی آبرو بچائی اور اس سے قبل فرقہ وارانہ فسادات میں جانبدارانہ رپورٹنگ سے نیشنل پریس یا قومی میڈیا کے دامن پر جو بدنما داغ لگ چکا تھا، اس کو صاف کر ڈالا۔ حالانکہ اب بھی ایسے صحافیوں کی کمی نہیں ہے جو سنگھی بھونپو بنے ہوئے ہیں تاہم ایسے لوگوں کی سازشیں زیادہ کامیاب نہیں ہو رہی ہیں۔ معروف صحافی آمولیہ گانگولی نے اپنے متعدد مضامین میں وزیر اعلیٰ نریندر مودی کے خونیں عزائم کو بے نقاب کیا ہے اور ہندوتو کے ایجنڈے کا پوسٹ مارٹم کر کے عوام کو اس کی حقیقت بتائی ہے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں انتہائی جرأت مندانہ انداز اختیار کرتے ہوئے مودی کو بوسنیا کے جنگی مجرم سلوبودان میلوسیویچ کا نام دے کر ان کا نام نریندر میلوسیویچ رکھ دیا۔ واضح رہے کہ بوسنیا کی جنگ میں سلوبودان میلوسیویچ نے مسلمانوں کا بڑے پیمانے پر قتل عام کیا تھا جس کے نتیجے میں اس پر عالمی عدالت میں جنگی مجرم کی حیثیت سے مقدمہ چلایا گیا اور اب اس کی موت ہو چکی ہے۔ آمولیہ گانگولی نے اپنی بے باک تحریر سے مظلوموں میں جرأت و حوصلہ کی لہر دوڑا دی اور وہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ مودی کو نہ صرف برطرف کیا جائے بلکہ ایک خونیں مجرم کے طور پر ملکی عدالت میں ان کے خلاف مقدمہ چلایا جائے اور ہزاروں مسلمانوں کے

قتل عام (حالانکہ سرکاری طور پر صرف ۸۰۰ کے قریب ہی لوگ ہلاک ہوئے تھے) کی بھیانک سزا دی جائے۔

ایک معروف آئی اے ایس افسر ہرش مندر ہیں۔ وہ ۱۹۸۰ء سے برسر ملازمت رہے ہیں اور اپنی مدت کار کے دوران انھیں بارہا حق گوئی کی سزا بھگتنی پڑی ہے۔ گودھرا واقعہ کے بعد جب پورے گجرات میں مسلمانوں کا منظم قتل عام شروع ہوا تو ہرش نے متاثرہ مقامات کا دورہ کیا اور ریلیف کیمپوں میں لوگوں سے ملاقات کی۔ بعد میں انھوں نے انگریزی اخباروں میں ایک دردمند مضمون لکھا جس میں انھوں نے کہا کہ پہلے میں گاتا تھا کہ سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، لیکن اب میں کس منہ سے یہ گاؤں میں اب یہ نغمہ نہیں گا سکتا کیونکہ اب ہمارا ملک سارے جہاں سے اچھا نہیں رہ گیا۔ انھوں نے انتہائی جرأت و بیباکی سے کام لے کر یہاں تک لکھا کہ اگر ایک بھی آئی اے ایس اور آئی پی ایس افسر نے اپنی ذمہ داری نبھائی ہوتی تو گجرات میں وہ نہیں ہوتا جو آج ہو رہا ہے، انھوں نے اعتراف کیا کہ میں آئی اے ایس افسر ہونے پر شرمندہ ہوں۔ بعد میں ان کا یہ مضمون ملک کے تقریباً تمام اخباروں میں شائع ہوا اور اس مضمون کی اشاعت کی پاداش میں ہرش مندر کو اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دینا پڑا۔

الیکٹرانک اور پرنٹ دونوں میڈیا نے اس بار تشدد کی سنگینی کے پیش نظر اس صحافتی ضابطے کو اٹھا کر طاق پر رکھ دیا جس میں کہا گیا ہے کہ ایسے واقعات کی رپورٹنگ میں لفظ ہندو، مسلمان، مسجد، مندر کا استعمال نہ کیا جائے بلکہ ایک فرقہ، دوسرا فرقہ اور عبادت گاہوں جیسے الفاظ کا استعمال کیا جائے۔ لیکن صحافیوں کے ضمیر نے اس بار اس صحافتی اصطلاح کو ماننے سے انکار کر دیا اور انھوں نے کھلم کھلا اور واشگاف انداز میں لکھا کہ "مسلمانوں کی آبادیوں پر ہندو ہجوم نے حملہ کیا" یا "مشتعل ہندوؤں کی بھیڑ نے مسجدوں، درگاہوں، مدرسوں اور قبرستانوں کو منہدم اور نذر آتش کر دیا"۔ یہی وجہ ہے کہ گجرات کے وزیر اعلیٰ نریندر مودی نے اسٹار نیوز چینل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اس کی رپورٹنگ فساد بھڑکانے والی ہے اور آج تک کی رپورٹنگ حکومت کی مدد کرنے والی ہے۔ واضح رہے کہ آج تک چینل نے وہ رول ادا نہیں کیا جو اسٹار نیوز نے

ادا کیا، بلکہ اس نے اپنی رپورٹنگ میں واقعات کی سنگینی کو کم کر کے حکومت کی در پردہ پشت پناہی کی ۔

اخبار انڈین اکسپریس نے، جسے عام حالات میں مسلم مخالف رپورٹنگ کے لئے جانا جاتا تھا، اس فساد میں یکے بعد دیگرے ایسی رپورٹیں شائع کی ہیں جن سے گجرات کے وزیر اعلیٰ کی قلعی بار بار اتری ہے۔ اسی اخبار نے یہ رپورٹ شائع کی تھی کہ گودھرا ٹرین واقعہ کے ۶۲ ملزموں پر جو کہ سب کے سب مسلمان ہیں' پوٹا کا نفاذ کیا گیا ہے جبکہ گجرات فساد میں پکڑے گئے ۸۰۰ لوگوں میں سے کسی ایک پر بھی پوٹا نہیں لگایا گیا، کیونکہ وہ سب کے سب ہندو تھے۔ اس رپورٹ پر پارلیمنٹ میں ایسا شدید ہنگامہ ہوا کہ مودی کو پوٹا ہٹانا پڑا۔ یہ اخبار اب بھی مقام اور تاریخوار اس کی تفصیل پیش کر رہا ہے کہ مسلمانوں کے سینوں' سروں اور دونوں آنکھوں کے درمیان گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ اخبار ہندوستان ٹائمز نے وشو ہندو پریشد کی جانب سے تقسیم کیے جانے والے اس خطرناک پمفلٹ کو بے نقاب کیا جس میں مسلمانوں کے بائیکاٹ اور اسکولوں میں مسلم طلباء کے سروے کی باتیں کہی گئی تھیں۔ اس نے ایک رپورٹ میں یہ انکشاف بھی کیا کہ ہندو نو جوان کارکن ان علاقوں میں جہاں فسادات کی شدت کم ہے' ہندو کارکنوں کو چوڑیاں سپلائی کر رہے ہیں اور انہیں ان کی ''بزدلی'' کی یاد دلا رہے ہیں۔ اخبار کا کہنا ہے کہ ایسے واقعات کے بعد ان علاقوں میں بھی شدت آ گئی ہے جہاں چوڑیاں سپلائی کی جا رہی ہیں۔ اخبار ایشین ایج، ٹائمز آف انڈیا اور جرائد میں آؤٹ لک وغیرہ نے غیر جانبدارانہ رپورٹنگ کا ریکارڈ قائم کیا ہے۔ پرفل بدوائی' پربھاش جوشی' وپل گپتا' پریم سنگھ' مست رام کپور' سیما مصطفیٰ' سمیتا گپتا' راجندر شرما' اور تیستا سیتل واڈ جیسے ہندی اور انگریزی صحافیوں کی بڑی تعداد ہے جو حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کا حوصلہ رکھتی ہے اور جس نے اس فساد میں اپنی رپورٹنگ سے مسلمانوں کا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا ہے۔

دراصل اس کی بہت سی وجوہ ہیں۔ میڈیا کے نمائندے جو اس سے قبل خاص طور پر اجودھیا تحریک کے دوران رپورٹنگ سے فساد بھڑکایا کرتے تھے' اس بار الگ انداز میں نظر آئے۔ یہی وجہ ہے کہ میڈیا کو اس کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ نیشنل میڈیا نے گجرات کی حکومت، انتظامیہ اور

پولس کی قلعی کھول کر جس طرح بے نقاب کیا ہے اس پر ان کی ناراضگی اور غم وغصہ فطری ہے۔ جس کا اظہار انہوں نے احمد آباد کے سابرمتی آشرم میں صحافیوں پر لاٹھی چارج کر کے کیا۔ جب میڈیا والوں نے پولس زیادتی کو کور کرنا شروع کیا تو پولس افسران نے ان کو بھی اپنی وحشت و بربیت کا نشانہ بنایا۔ سابق وزیر داخلہ لال کرشن اڈوانی بھی صحافیوں سے بہت ناراض تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ کیا اس طرح واضح انداز میں رپورٹنگ اور لاشوں کی تصویر کشی ضروری تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ صحافی حضرات ان کی ہدایات پر عمل کریں اور 'محتاط'' ہو کر کام کریں۔

گجرات فسادات کے دوران الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا نے حق گوئی کی جو مثال قائم کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ ہمیں توقع رکھنی چاہئے کہ آئندہ بھی صحافیوں کی ٹیم اپنی ذمہ داری محسوس کرے گی اور بلا امتیاز مذہب وفرقہ غیر جانبدارانہ انداز میں رپورٹنگ کرے گی۔ ورنہ اب تک کا تجربہ بہت تلخ تھا۔ یہ تبدیلی بہت خوش گوار ہے اور توقع ہے کہ یہ آگے بھی قائم رہے گی۔

(۳)

میڈیا کی تکنیکی شناخت اور رسائی

الیکٹرانک میڈیا کی رسائی

ملک میں اطلاعات ونشریات اور فلم سیکٹر کے فروغ کی ذمہ داری مرکزی وزارت برائے اطلاعات ونشریات کے تحت ہے۔آل انڈیا ریڈیو اور دوردرشن بھی اس کے تحت آتے تھے،مگر مرکزی حکومت نے ۱۹۹۷ میں ایک ایکٹ کے ذریعہ پرسار بھارتی بنا کر ریڈیو اور ٹی وی کو اس کے تحت کر دیا۔ان دونوں کے علاوہ نیشنل ریڈیو سروس (این آر ایس) ۲۰۰۳ کے مطابق جو کہ ملک میں ریڈیو ،ٹیلی ویژن اور نئے ذریعہ ابلاغ ایس ایم ایس استعمال کرنے والوں کی جامع کوریج فراہم کرتا ہے، ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کی تعداد ۶ء۳۸۳ ملین ، ریڈیو سننے والوں کی تعداد ۱۸۹ ملین اور انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد ۶ ملین ہے۔(خیال رہے کہ یہ ۲۰۰۳ کے سروے کا نتیجہ ہے اور ادھر دو تین برسوں میں الیکٹرانک میڈیا نے زبردست ترقی کی ہے اور نہ صرف چینلوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے بلکہ ان کو دیکھنے اور استفادہ کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ایف ایم ریڈیو کی آمد نے ریڈیو کے شعبے کو مزید فروغ دیا ہے اور ریڈیو سننے والوں کی تعداد میں بھی بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے) اگر ہم ۲۰۰۲ میں کئے گئے انڈین ریڈرشپ سروے (آئی آر ایس) کے نتائج پر نظر ڈالیں تو پائیں گے کہ الیکٹرانک میڈیا مجموعی میڈیا کے ۹ء۵۱ فیصد پر حاوی ہے جبکہ کیبل اور سیٹلائٹ ٹیلی ویژن کا حصہ ۵ء۲۵ فیصد ،ریڈیو کا ۳ء۱۵ فیصد ،سینما کا ۴ء۷ فیصد اور انٹرنیٹ کا حصہ صفر اعشاریہ ایک فیصد ہے۔سروے کے مطابق ایف ایم ریڈیو اور انٹرنیٹ نے اس میدان میں زبردست چھلانگ لگائی ہے اور الیکٹرانک میڈیا کے ایک بڑے حصے پر انہوں نے قبضہ کیا ہے۔سروے سے ایک سال قبل کے مقابلے میں ایف ایم سننے والوں میں سات گنا اضافہ ہوا اور بالخصوص ۱۲ سے ۲۴ سال کی عمر کے لوگوں میں اس کے تئیں دلچسپی کافی بڑھی ہے۔۲۰۰۰ میں ایف ایم سننے والوں کی تعداد ایک لاکھ دس ہزار تھی

اور ۲۰۰۲ میں یہ تعداد بڑھ کر ۸ لاکھ ۰۷ ہزار ہوگئی ہے۔ اگر اب سروے کیا جائے تو ظاہر ہے کہ ایف ایم سامعین کی تعداد میں مزید کئی گنا اضافہ ہو گیا ہوگا۔

ریڈیو:

مذکورہ بالا اعداد وشمار سے ثابت ہوتا ہے کہ ملک میں الیکٹرانک میڈیا کی انڈسٹری نے قابل ذکر حد تک اپنے دائرہ کار میں وسعت دی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کا آغاز دراصل ریڈیو نشریات سے ہوتا ہے اور ریڈیو نشریات کی شروعات ۱۹۲۳ کے اوائل میں ہوئی ہے۔ ۱۹۴۷ء میں ۶ ریڈیو اسٹیشن اور ۱۸ ٹرانسمیٹر تھے اور وہ ۲.۵ فیصد علاقے کا احاطہ کرتے تھے جو کہ آبادی کا صرف گیارہ فیصد تھا۔ مگر اس وقت اس کے ۲۰۸ نشریاتی مراکز یا براڈ کاسٹنگ سینٹرس ہیں جو کہ ۹۰ فیصد علاقے کا احاطہ کرتے ہیں اور ملک کی ایک ارب سے زائد کی آبادی کے تقریباً ہر شخص تک ان کی رسائی ہے۔

ریڈیو نشریات کے تین زمرے بنائے گئے ہیں۔ نیشنل، ریجنل اور لوکل یعنی قومی، علاقائی اور مقامی۔ پانچ چینلوں سے ان کی نشریات ہوتی ہیں۔ پرائمری نیشنل چینل، کامرشیل براڈ کاسٹنگ سروس (وودھ بھارتی) ایف ایم چینل اور ایکسٹرنل سروس چینل۔ ۱۹۳۹-۴۰ میں ریڈیو سے ۵۷ نیوز بلیٹن جاری کئے جاتے تھے۔ مگر اب ان کی تعداد یومیہ ۳۶۴ بلیٹن کی ہوگئی ہے جن کا مجموعی وقت ۲۴ گھنٹے میں ۴۳ گھنٹے دس منٹ ہوتا ہے۔ ان میں سے ۸۴ بلیٹن دہلی کے ہوم سروسز سے نشر ہوتے ہیں۔ جبکہ پورے ملک میں ۴۵ ریجنل نیوز یونٹ پھیلے ہوئے ہیں۔ جہاں سے ۴۶ زبانوں میں ۱۸۷ علاقائی نیوز بلیٹن نشر کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو سے ہر گھنٹے پر پانچ پانچ منٹ کی خبر نشر ہوتی ہے جبکہ ایف ایم سے ہر گھنٹے پر خبروں کی سرخیاں نشر کی جاتی ہیں۔ ۱۹۹۸ سے فون پر بھی خبریں نشر کی جاتی ہیں۔ آپ اگر دہلی میں ہیں تو فون نمبر ۱۲۵۸ پر خبروں کی سرخیاں سن سکتے ہیں۔ حکومت نے دو فلم اور ٹیلی ویزن انسٹی ٹیوٹ قائم کئے ہیں۔ ایک پنے میں ہے اور دوسرا کولکاتا میں۔ اس کے علاوہ سو سے زائد ایف ایم ریڈیو اسٹیشنوں کو منظوری دی جا چکی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ گذشتہ کچھ برسوں سے ریڈیو سننے والوں کی تعداد میں خاص طور پر شہروں میں کمی

آئی ہے مگر اس کی اہمیت سے آج بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ایف ایم ریڈیو خاصے مقبول ہو رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب ریڈیو ہی اطلاعات و مواصلات اور تفریح طبع کا واحد ذریعہ تھا۔ (لوگوں کو ریڈیو کی خبروں کا انتظار ہوتا تھا اور جب ریڈیو سیٹ کم ہوتے تھے تو ایک ایک ریڈیو سے بے شمار لوگ خبریں سنا کرتے تھے۔ آج بھی دیہی علاقوں میں کم و بیش یہی صورت حال ہے اور چائے خانوں میں ایک ایک ریڈیو سیٹ سے درجنوں افراد خبریں سنتے ہیں۔)

ادھر حالیہ برسوں میں جب سے پرائیوٹ ایف ایم کا زمانہ آیا ہے ریڈیو سیٹ کی فروخت میں اضافہ ہوا ہے (حالانکہ اس نے مواصلات کی ایک نئی زبان ایجاد کی ہے جس میں فحاشی کی حد تک بے تکلفی پائی جاتی ہے) صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ریڈیو سیٹ رکھنے والوں کی تعداد ٹی وی سیٹ رکھنے والو ں سے کہیں زیادہ ہے۔ سنسس آف انڈیا اپریل۔ مارچ ۲۰۰۰ کے سروے کے مطابق جو کہ گھریلو اشیا سے متعلق پہلا اور بڑا سروے تھا، ۳۵ فیصد ہندوستانی گھروں میں ریڈیو سیٹ ہیں جبکہ ٹی وی سیٹ ۳۲ فیصد گھروں میں پائے جاتے ہیں۔

ٹیلی ویژن:

سیٹلائٹ اور کیبل ٹیلی ویژن کی آمد نے شہری علاقوں میں ریڈیو کی مقبولیت کو حقیقی معنوں میں متاثر کیا ہے۔ اس وقت ۷۵ ملین (ساڑھے سات کروڑ) گھروں میں ٹی وی موجود ہے اور ان میں سے ۶۰ فیصد کے پاس کیبل کنکشن ہے۔ TAM انڈیا گرافک (ہفت روزہ آؤٹ لک فروری ۲۰۰۴) کے مطابق ملک کے کل ٹیلی ویزن دیکھنے والوں کی تعداد ۱۱ سے ۱۷ جنوری کے درمیان ۳۸۳.۶ ملین تھی۔ جن میں آج تک دیکھنے والوں کی تعداد ۲۸ فیصد، ڈی ڈی نیوز دیکھنے والوں کی تعداد ۱۷ فیصد، اسٹار نیوز ۱۴ فیصد، این ڈی ٹی وی (ہندی) ۱۴ فیصد، زی نیوز ۱۴ فیصد، سہارا سے نیشنل ۸ فیصد، این ڈی ٹی وی (انگریزی) ۳ فیصد اور سی این بی سی ۳ فیصد ہے۔ جبکہ اناڈو ٹی وی، جین ٹی وی، ہیڈ لائنس ٹوڈے، بی بی سی ورلڈ، اور سی این این دیکھنے والوں کی تعداد حیرت انگیز طور پر صفر ہے۔ یعنی ان چینلوں کو لوگ نہیں دیکھتے۔ تاہم اس سروے میں علاقائی، مقامی، تفریحی اور بعض دیگر چینلوں کو شامل

نہیں کیا گیا۔

ہندوستان میں پہلا ٹیلی کاسٹ ۱۵ ستمبر ۱۹۵۹ کو آکاش وانی بھون نئی دہلی میں ایک عارضی اسٹوڈیو سے شروع ہوا، اور مستقل طور پر خبریں ۱۹۶۵ سے شروع ہوئیں۔ سات برسوں کے بعد دوسرا ٹیلی ویژن سنٹر ممبئی سے شروع ہوا۔ اس کے بعد یہ ملک کے دیگر شہروں میں بھی پھیلنے لگا۔ سیٹلائٹ ٹیکنالوجی کے ساتھ پہلا تجربہ سیٹلائٹ انسٹرکشنل ٹیلی ویژن ایکسپریمنٹ (ایس آئی ٹی ای) کے تحت ۷۶۔۱۹۷۵ میں کیا گیا۔ در اصل وہ دنیا میں سماجی تعلیم کے لئے سیٹلائٹ براڈ کاسٹنگ کے استعمال کی پہلی کوشش تھی۔

۱۹۸۲ میں ہندوستان کی نیشنل ٹیلی ویژن سروس (ڈی ڈی) نے علاقائی براڈ کاسٹنگ کے لئے تیزی کے ساتھ پورے ملک میں ٹرانسمیٹرس نصب کرنے شروع کئے۔ اسی سال دہلی اور دیگر ٹرانسمیٹروں کے مابین مستقل سیٹلائٹ رابطہ کے ذریعہ نیشنل نیٹ ورک کی شروعات ہوئی۔ دور درشن کے اس وقت ۲۳ چینل ہیں۔ اس کے نیشنل اور میٹرو چینل ٹرانسمیٹر اور سیٹلائٹ کی مدد سے دستیاب ہیں۔ اب دور درشن کا اردو چینل بھی شروع ہو گیا ہے جو سردست ۷ گھنٹے کی نشریات پیش کرتا ہے۔

دوردرشن نے دیگر پرائیویٹ ٹی وی چینلوں کی مانند منافع حاصل کرنے کو کبھی بھی اپنا مقصد نہیں بنایا۔ اس نے اپنے ناظرین کو شہری سمجھا، صارف نہیں۔ تاہم اس کی کوالٹی اور مواد کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بعض اسباب کی بنا پر دیگر چینل دستیاب نہ ہوں جبھی لوگ ڈی ڈی دیکھتے ہیں۔ جب دسمبر ۲۰۰۳ میں ڈی ڈی نیوز کی شروعات کی گئی تو یہ قیاس آرائی کی گئی تھی کہ یہ حکومت حامی ہوگا، بے مزہ ہوگا اور قومی انتخابات کے بعد بند ہو جائے گا۔ لیکن تمام قیاس آرائیاں غلط ثابت ہوئیں۔ چند ماہ کے اندر اس نے اپنی قابلیت وصلاحیت دکھا دی۔ نیوز چینلوں کے جنگل میں اس کا ٹیلی ویژن پروگرام ریٹنگ یعنی ٹی آر پی تیزی سے بڑھا اور یہ آج تک کے بعد دوسرا سب سے زیادہ دیکھنے والا چینل بن گیا۔ ایسا سمجھا گیا کہ ڈی ڈی نیوز ابتدائی پانچ ماہ یعنی نومبر ۲۰۰۳ سے مارچ ۲۰۰۴ء کے درمیان دو کروڑ کا ریونیو حاصل کرے گا لیکن صرف پہلے ماہ ہی میں

اس نے پچاس لاکھ کا ریونیو عبور کر لیا۔جس کے بعد اس کے ذمہ داروں نے ۵۔۲۰۰۴ میں پچیس کروڑ کے ریونیو کا ہدف مقرر کیا۔اس کے بعد اعلان کیا گیا کہ یہ جلد ہی ۱۴۶ ملکوں میں مفت دیکھا جائے گا۔

(بشکریہ۔ایمپاورمنٹ آف مسلمس ان انڈیا تھرو انفارمیشن اینڈ کمیونی کیشن۔اے یو۔آصف)

(Empowerment of Muslims In India Through Information and Communication- by: A.u. Asif)

نیشنل ریڈرشپ اسٹڈیز ۲۰۰۶ء کی سروے رپورٹ

نیشنل ریڈرشپ اسٹڈیز کونسل آڈٹ بیورو آف سرکولیشن کی ایک خودمختار باڈی ہے۔اس نے اگست میں ممبئی میں نیشنل ریڈرشپ اسٹڈیز ۲۰۰۶ء کی سروے رپورٹ جاری کی ہے۔رپورٹ کے مطابق زیادہ تر لوگ روزنامہ اخبارات پڑھتے ہیں۔کم لوگ میگزین پڑھتے ہیں۔ٹی وی دیکھنے والوں اور ایف ایم ریڈیو سننے والوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔البتہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد جتنی بڑھنی چاہئے تھی،اتنی نہیں بڑھی ہے۔

اس مطالعہ میں ۲۸۴۳۷۳ گھروں میں جاکر انٹرویو کیے گئے اور ۵۳۵ پبلی کیشنوں، ۲۳۰ روزنامہ اخبارات اور ۳۰۵ جریدوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

این آر ایس ۲۰۰۶ کے مطابق روزنامہ اخبارات کے قارئین کی تعداد دن بہ دن بڑھ رہی ہے۔اس میں ایک سال کے دوران ۱۲ء۶ ملین کا اضافہ ہوا ہے۔یہ تعداد بڑھ کر ۲۰۳ء۶ ملین تک پہنچ گئی ہے۔میگزین پڑھنے والوں کی تعداد میں معمولی اضافہ ہوا ہے، یہ تعداد گزشتہ سال کے ۲۱۶ ملین سے بڑھ کر ۲۲۲ ملین تک پہنچ گئی ہے۔

اس مطالعہ میں بتایا گیا ہے کہ شہروں میں لوگ روزنامہ اخبارات پر ۴۴ منٹ اور دیہی علاقوں میں ۳۵ منٹ یومیہ خرچ کرتے ہیں۔

این آر ایس نے ۱۸ روزنامہ اخبارات کی ایک فہرست مرتب کی ہے اور اسے ''فائیو ملین کلب'' کا حصہ بنایا ہے۔اس فہرست میں شامل ہر اخبار کے قارئین پانچ ملین سے زیادہ ہیں۔ان میں دینک جاگرن (۲۱ء۲ ملین) اور دینک بھاسکر (۲۱ ملین) بھی ہیں۔ان اخبارات کے قارئین

کی تعداد گزشتہ سال ۳۸۰۰۰۰۰ تھی اور امسال یہ تعداد گھٹ کر ۲۰۰۰۰۰ رہ گئی ہے۔ ’’فائیو ملین کلب‘‘ میں شامل ۱۸ روز نامہ اخبارات میں ہندی کے چھ، تمل کے تین، گجراتی، ملیالم اور مراٹھی کے دو دو اور بنگالی، تیلگو اور انگریزی کے ایک ایک اخبارات شامل ہیں۔ اس کلب میں صرف ایک انگریزی روزنامہ ’’دی ٹائمز آف انڈیا‘‘ ہے۔ اس کی سرکولیشن ۷ء۴ ملین ہے۔ گزشتہ سال کے مقابلے امسال اس کے قارئین کی تعداد کم ہوئی ہے اور یہ اٹھارہ اخبارات کی فہرست میں نویں نمبر سے گیارہویں نمبر پر آ گیا ہے۔ روز نامہ ہندو انگریزی روز نامہ اخبارات میں دوسرے نمبر پر آ گیا ہے۔ اس کے قارئین کی تعداد ۰۵ء۴ ملین ہے۔ اس کے بعد ہندوستان ٹائمز کا نمبر ہے۔ یہ اخبار گزشتہ سال دوسرے نمبر پر تھا۔ ممبئی سے نیا ایڈیشن شائع ہونے کے باوجود، جس کے قارئین کی تعداد ۳۶۰۰۰۰۰ ہے، یہ تیسرے نمبر پر آ گیا ہے۔ اس کی سرکولیشن ۸۵ء۳ ملین ہے۔

ہندی بیلٹ میں قارئین کی تعداد زیادہ بڑھی ہے۔ گزشتہ سال ہندی لینگویجز اخبارات کے قارئین کی تعداد ۱۹۱ ملین تھی جو اب بڑھ کر ۶ء۲۰۳ ملین ہو گئی ہے۔ انگریزی اخبارات کی تعداد ۲۱ ملین ہے۔

سیٹلا ئٹ ٹیلی ویژن نے اپنا دائرہ بڑھایا ہے۔ ۲۳۰ ملین لوگ آج ٹی وی دیکھتے ہیں جبکہ ۲۰۰۵ء میں یہ تعداد ۲۰۷ ملین تھی۔ این آر ایس ۲۰۰۶ء کے مطابق اس وقت ہندوستان کے ۱۱۲ ملین گھروں میں ٹی وی پہنچ گیا ہے۔ کیبل اور سیٹلا ئٹ ٹی وی والے گھروں کی تعداد ۶۱ ملین سے بڑھ کر ۶۸ ملین تک پہنچ گئی ہے۔ تمل ناڈو، کرناٹک اور آندھرا پردیش میں ٹی وی نے دوسری ریاستوں کے مقابلے اپنے ناظرین کی تعداد میں زیادہ اضافہ کیا ہے۔ البتہ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں کی تعداد میں سست رفتار اضافہ ہوا ہے۔ یہ تعداد ۲ء۷ ملین سے بڑھ کر ۴ء۹ ملین تک پہنچی ہے۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والوں میں ۸ء۱۰ ملین شہری ہیں اور ۸ء۱ ملین دیہی علاقوں کے ہیں۔ سائبر کیفے میں ۳۴ فیصد لوگ جاتے ہیں جبکہ ۳۰ فیصد گھروں میں اور ۲۰ فیصد دفاتر میں استعمال کرتے ہیں۔

ریڈیو سامعین کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ یہ تعداد ۲۳ فیصد سے ۲۷ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ ایف

ایم ریڈیو کے سامعین کی تعداد ۱۹املین ہے۔ایف ایم سننے والوں کی تعداد میں ایک سال میں ۵۵ فیصد کا اضافہ ہوا ہے۔

سنیما ہالوں میں جا کر فلم دیکھنے والوں کی تعداد میں کمی آئی ہے۔ پہلے ایک ماہ میں ایک بار ہالوں میں جا کر فلم دیکھنے والوں کی تعداد ۵۱ملین تھی وہ اب گھٹ کر ۳۹ملین رہ گئی ہے۔البتہ شہری علاقوں میں ایسے لوگوں کی تعداد بڑھ کر ۲۳ملین سے ۲۵ملین ہو گئی ہے۔

این آر ایس نے موبائل فون کو بھی میڈیا کا ایک حصہ قرار دیا ہے۔

(بہ شکریہ Rind survey۔6/اکتوبر2006)

نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن

ان دنوں میڈیا کی سرگرمیاں بہت زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کے شعبے میں آئے انقلاب نے ہر معمولی واقعہ کو غیر معمولی بنا دیا ہے اور ہر چھوٹی سے چھوٹی جگہ یا چھوٹے سے چھوٹے شخص میں خبر بننے کی بے پناہ قوت داخل کر دی ہے۔ میڈیا سیاست وحکومت میں موجود بدعنوانیوں کو یکے بعد دیگرے بے نقاب کر کے عوامی خدمت بھی انجام دے رہا ہے۔ میڈیائی انقلاب کے نتیجے میں ہندوستان میں اب اسٹنگ آپریشنوں کا دور شروع ہو گیا ہے اور ان آپریشنوں کی زد پر آئے ہمارے سیاستداں بھی، مذاق ہی میں سہی، میڈیا کے خلاف اسٹنگ آپریشن کرنے کی بات کرنے لگے ہیں۔ ہندوستان میں چونکہ نیوز چینل ابھی سن بلوغیت کو بھی نہیں پہنچے ہیں اس لیے وہ اس کے لیے مقرر قواعد وضوابط سے بھی واقف نہیں ہیں۔ یہ اسٹنگ آپریشن یہاں کے لیے نئے اور چونکا دینے والے ہیں اور لوگ انتہائی دلچسپی اور تجسس کے ساتھ ان کو دیکھتے اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر امریکا، برطانیہ اور یوروپی ملکوں میں اسٹنگ آپریشن نئے نہیں ہیں، اسی لیے وہاں اسٹنگ آپریشن کے قواعد وضوابط ہیں، مگر ہندستان میں ابھی ان کو منضبط کرنے کے لیے کوئی قانون نہیں بنا ہے۔ ان آپریشنوں سے وہ لوگ بہت پریشان ہیں جو ان کی زد پر ہیں یا جن کو خطرہ ہے کہ وہ بھی میڈیا کے بچھائے ہوئے نادیدہ جال میں پھنس سکتے ہیں یا اس کے چکرویوہ میں گھر سکتے ہیں۔ اب یہ احساس بھی بعض حلقوں میں بڑی شدت سے سر اٹھانے لگا ہے کہ جس طرح فدائین حملوں کے، وقت اور مقام کے بارے میں پیش قیاسی نہیں کی جاسکتی، اسی طرح اس کی بھی کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی کہ کب کون سا چینل یا کون سا صحافی خفیہ کیمرہ لے کر نکل پڑے اور لوگوں کے رازہائے سربستہ کو طشت از بام کر دے۔ اب اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں رہ گئی کہ خود کو کسی کمپنی یا این جی او کا نمائندہ

بتانے والا واقعتاً اس کا حقیقی نمائندہ ہے یا کمپنی کے نمائندے کے بھیس میں کسی چینل یا اخبار کا رپورٹر ہے جو بھید لینے کے لیے بھیس بدل کر آیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اب میڈیا کی ان سرگرمیوں کے تناظر میں بہت سے سوالات اٹھنے لگے ہیں اور یہ پوچھا جانے لگا ہے کہ کیا میڈیا اپنے فرائض کے دائرۂ کار سے باہر تو نہیں نکل رہا ہے۔یا خود پر قدغن لگانے والے لولے لنگڑے قوانین کی خلاف ورزی تو نہیں کر رہا ہے۔ان سرگرمیوں کے سبب جو سوال بہت شدت سے اٹھایا جا رہا ہے وہ یہ ہے کہ کیا میڈیا نئی نئی خبروں کی تلاش و جستجو کی ہوس میں عام لوگوں کی زندگی میں جھانکنے اور مداخلت کرنے کی کوشش تو نہیں کر رہا ہے اور اگر وہ ایسا کر رہا ہے تو کیا وہ اخلاقی جرم کا مرتکب نہیں ہو رہا ہے۔اور کیا میڈیا کو ایسی سرگرمیوں سے روکنے کے لیے اسے پابہ زنجیر کرنے کی ضرورت تو نہیں ہے؟

یہ سوالات آپریشن دریودھن کے بعد کافی شدت سے اٹھائے جانے لگے ہیں۔آپریشن دریودھن کو براپوسٹ ڈاٹ کام کے انرودھ بہل نے کیا ہے جس میں ممبران پارلیمنٹ کو ایوان میں سوال پوچھنے کے بدلے رشوت لیتے ہوئے رنگے ہاتھوں کیمرے میں قید کیا گیا ہے۔اس آپریشن کے بعد جس کے نتیجے میں رشوت خور تمام گیارہ ممبران کو پارلیمنٹ سے برخاست کر دیا گیا، میڈیا والوں پر سیاستدانوں کی نظریں جم گئی ہیں اور وہ ان کے پر کترنے کی تیاری کرنے لگے ہیں۔ممکن ہے کہ کچھ دنوں کے بعد صحافیوں کے ذریعہ اسٹنگ آپریشن پر پابندی لگا دی جائے اور جس طرح امریکا میں صرف ایف بی آئی ہی اسٹنگ آپریشن کر سکتا ہے اسی طرح ہندوستان میں یہ اختیار خصوصی صرف سی بی آئی کو سونپ دیا جائے۔

آپریشن دریودھن کے بعد ایک آپریشن چکرویوہ بھی لگے ہاتھوں ہو گیا جس میں کئی ممبران پارلیمنٹ نے علاقائی ترقیاتی فنڈ کو دلالی اور کمیشن کے عوض دوسروں کو دینے کا سودا کر لیا تھا۔اس پر بھی کافی ہنگامہ ہوا۔یکے بعد دیگرے ان دونوں آپریشنوں کے بعد مذکورہ سوالات کی شدت بڑھ گئی ہے اور یہ بھی کہا جانے لگا ہے کہ صحافیوں نے ممبران پارلیمنٹ کو پھنسانے کے لیے جال بچھایا تھا۔حالانکہ ایسا ہی جال تہلکہ ڈاٹ کام والوں نے بھی بچھایا تھا مگر اس وقت یہ سوالات نہیں اٹھے تھے، کیونکہ وہ اس نوعیت کا پہلا آپریشن تھا اور اس وقت تک میڈیا کی سرگرمی اتنی زیادہ نہیں

بڑھی تھی۔

تہلکہ ڈاٹ کام نے جب اسٹنگ آپریشن کر کے دفاعی سودوں میں بدعنوانی کو بے نقاب کرنے اور ایک برسر اقتدار سیاسی جماعت کو کھلے عام رشوت لیتے ہوئے دکھانے کا کارنامہ انجام دیا تو ملک میں زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ حالانکہ اس آپریشن میں کوئی حقیقی دفاعی کمپنی شامل نہیں تھی، جس سے سیاستدانوں نے دفاعی سودہ کیا ہو۔ البتہ بنگارو لکشمن کو پیسے لیتے ہوئے ضرور دکھایا گیا تھا۔ اسلحہ فروخت کرنے والی کمپنی فرضی تھی اور خود کو اس کمپنی کے نمائندے بتانے والے بھی تہلکہ کے رپورٹر تھے۔ لیکن اس آپریشن نے پورے ملک میں ایک کہرام برپا کر دیا اور اس وقت کے وزیر دفاع جارج فرنانڈیز کو اپنی وزارت سے ہاتھ دھونا پڑا، سمتا پارٹی کی صدر جیا جیٹلی کو صدارت چھوڑنی پڑی اور بی جے پی کے صدر بنگارو لکشمن کے سر سے بھاجپا کی صدارت کا تاج چھین لیا گیا۔ البتہ اس وقت کے وزیر اعظم اٹل بہاری واجپئی نے جارج فرنانڈیز کو تہلکہ کے انکشاف کی جانچ کرنے والے انکوائری کمیشن کی جانچ رپورٹ آنے سے قبل ہی دوبارہ وزیر دفاع مقرر کر دیا، لیکن تہلکہ کا بھوت آج بھی ان کا اور جیا جیٹلی کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا ہے۔

تہلکہ ڈاٹ کام کوئی ٹی وی چینل نہیں تھا بلکہ ایک پورٹل تھا ایک ویب میگزین تھا۔ لیکن اس کے اسٹنگ آپریشن کے فوٹیج کو تمام نیوز چینلوں نے مسلسل کئی دنوں تک دکھایا اور اب بھی ان کو حوالہ کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، حالانکہ اس اسٹنگ آپریشن سے سیاست دانوں کو اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا کہ خود تہلکہ ڈاٹ کام کے ذمہ داروں کو ہوا۔ انہیں مختلف مقدمات میں پھنسا دیا گیا اور اس پورٹل کے رپورٹروں کی زندگی اجیرن کر دی گئی۔ ہاں بنگارو لکشمن ضرور مطلع سیاست سے غائب ہو گئے، لیکن ان کی اہلیہ پارلیمانی الیکشن جیت کر ممبر پارلیمنٹ بن گئیں۔ تہلکہ ڈاٹ کام کے سی ای او ترون تیج پال نے رجت شرما اور مینکا گاندھی کے ساتھ مل کر انڈیا ٹی وی کے نام سے ایک نیوز چینل شروع کیا مگر بعد میں وہ اس سے الگ ہو گئے۔ وہ چینل نہ صرف چل رہا ہے بلکہ اس نے بھی اسٹنگ آپریشن کرنے شروع کر دئے ہیں اور اس نے اپنے آپریشنوں میں متعدد لوگوں کو بے نقاب کیا ہے جن میں سیاست داں بھی ہیں سادھو سنت بھی ہیں اور فلمی شخصیات بھی ہیں۔

انڈیا ٹی وی نے گجرات میں سوامی نارائن مندر میں پائی جانے والی جنسی برائیوں کو بے نقاب کیا اور اپنے آپ کو سادھو بتانے والے بدکرداروں کو مندر میں آشیرواد لینے آنے والی خواتین کے ساتھ جنسی عمل کرتے ہوئے بھی دکھایا۔ انڈیا ٹی وی کے فل اسکرین پر گھنٹوں ان مناظر کو دکھایا جاتا رہا۔ وہ ایسے مناظر تھے جو مخرب اخلاق بلیو فلموں ہی میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ عام فلمیں بھی ان مناظر کو دکھانے کی جرأت نہیں کر سکتیں۔ لیکن یہ ''جرأت'' انڈیا ٹی وی نے کی، اور ان مناظر کو جن کو گھروں میں افراد خانہ کے ساتھ دیکھنا گوارا نہیں کیا جا سکتا، دکھایا اور خوب دکھایا۔ اسی نیوز چینل نے بعض سیاسی پارٹیوں کے بعض ممبران پارلیمنٹ اور سیاست دانوں کو بھی ہوٹلوں میں دادِ عیش دیتے ہوئے دکھایا اور بتایا کہ کس طرح خفیہ کیمرے سے ان کے اس عمل کی تصویریں لی گئی ہیں۔ اس چینل نے فلم اداکار شکتی کپور اور ٹی وی اداکار امن ورما کو بھی لڑکیوں کے ساتھ جنسی استحصال کرتے ہوئے دکھایا۔ چینل نے فخریہ انداز میں یہ بھی بتایا کہ جب امن ورما کو ہمارے نمائندے نے رنگے ہاتھوں پکڑا تو کس طرح وہ نمائندے کے پیروں میں گر کر گڑ گڑانے لگے۔ لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ شکتی کپور اور امن ورما کو اس چینل کے رپورٹروں نے نہیں پکڑا، بلکہ نیوز چینل نے ان کے پاس لڑکیاں بھیج کر ایک طرح سے ان کو پھنسایا۔ جرم کی نقاب کشائی کی مخالفت کوئی نہیں کرے گا لیکن پہلے جرم کی ترغیب دینے اور پھر اس کو بے نقاب کرنے کی تائید بھی کوئی نہیں کر سکتا۔ ان رپورٹوں میں یہ بالکل واضح تھا کہ کس طرح چینل کی طرف سے بھیجی گئی لڑکیوں نے ان کو ملاقات کے لئے آمادہ کیا اور ان کی مبینہ طور پر غلط حرکتوں اور غلط باتوں کی حوصلہ افزائی کی اور پھر ان کی تصویریں لی گئیں۔

انڈیا ٹی وی کو ان اسٹنگ آپریشنوں سے کافی شہرت حاصل ہوئی اور اب وہ گمنام نیوز چینل نہیں رہ گیا۔ جن لوگوں کے خلاف یہ آپریشن کئے گئے ان میں سے بعض نے اس چینل کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کی ہے، لیکن چونکہ ان اسٹنگ آپریشنوں میں تہلکہ آپریشن کی مانند زیادہ بڑے لوگوں کو بے نقاب نہیں کیا گیا، اس لئے اس چینل کو تہلکہ کی مانند خمیازہ بھگتنے کا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ اس کے برعکس انڈیا ٹی وی کو شہرت ہی حاصل ہوئی۔ دیگر چینلوں نے بھی اسٹنگ آپریشن

کئے ہیں کسی نے ایشیا کی سب سے بڑی جیل تہاڑ جیل میں رشوت خوری اور دہلی کے محکمہ انکم ٹیکس آفس میں بدعنوانیوں کی پول کھولی تو کسی نے اندرا گاندھی انٹرنیشنل ائیر پورٹ پر سیکورٹی میں خامیوں کو بے نقاب کیا۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اور نیوز چینلوں کی جانب سے بدعنوانیوں اور ریکٹوں کو بے نقاب کرنے والی رپورٹیں عام طور پر دکھائی جا رہی ہیں۔لیکن جو اسٹنگ آپریشن تہلکہ ڈاٹ کام اور آپریشن دریودھن کے نام سے انرودھ بہل نے کیا شاید ویسا ہندوستان میں کوئی اور نہیں کر سکا ہے۔

اسٹنگ آپریشن اور اس کے آلات

اسٹنگ آپریشن کسے کہتے ہیں اور اس کی تعریف کیا ہے؟ یہ شاید زیادہ لوگوں کو نہیں معلوم۔ اسٹنگ کہتے ہیں بچھو کے ڈنک کو اور اسٹنگ آپریشن کا مفہوم ڈنک مارنا ہوا۔یعنی ایسا آپریشن جس کے بارے میں سامنے والے کو پیشگی طور پر کوئی علم نہ ہو،لیکن آپریشن کے بعد وہ درد اور تکلیف سے بلبلا اٹھے اور تڑپتا رہ جائے۔وہ یہ سمجھ ہی نہ پائے کہ آخر یہ اچانک کیا ہو گیا اور کیسے ہو گیا؟

اسٹنگ آپریشن میں انتہائی حساس اور جدید ترین آلات استعمال کئے جاتے ہیں۔اس آڈیو اور ویڈیو ٹکنالوجی میں خاص طور پر پن ہول (pin hole) کیمرہ ٹکنالوجی استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے ذریعہ کسی کی بات چیت یا اس کے اقدامات کی خفیہ طور پر ریکارڈنگ کی جاتی ہے۔ یہ پن ہول کیمرہ سستے بھی آتے ہیں اور مہنگے بھی۔ان کی قیمت ان کی کوالٹی پر منحصر ہوتی ہے۔عام طور پر اس آپریشن میں چار چیزیں استعمال کی جاتی ہیں۔انتہائی چھوٹا کیمرہ جو پچیس پیسے کے سکے کے برابر یا اس سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ایک اسی طرح کا بہت ہی چھوٹا ویڈیو ریکارڈنگ آلہ، سگنل کو ٹرانسمٹ کرنے کے لئے ایک کوارڈ اور ایک بیٹری سیل۔ان انتہائی چھوٹے کیمروں کو چھپانے کی کئی جگہیں ہوتی ہیں۔ جیسے بریف کیس کے اندر، فاونٹن پین کے اندر، بٹن کے اندر، فائل کے اندر، گھڑی کے اندر، اسموک ڈٹکٹر کے اندر یا چشمے کے فریم کے اندر۔ بریف کیس استعمال کرنے کی صورت میں ٹرانسمٹنگ کوارڈ چشمے کے حفاظتی کوارڈ کی مانند نظر آتا ہے جیسا کہ بعض لوگ

استعمال کرتے ہیں۔ بریف کیس میں رکھا کیمرہ اس وقت اپنا کام شروع کرتا ہے جب بریف کیس کو مخصوص پوزیشن میں اور مخصوص مقام پر رکھ دیا جاتا ہے۔

تہلکہ ڈاٹ کام کے اسٹنگ آپریشن میں جو خفیہ کیمرے استعمال ہوئے تھے وہ بیگ میں رکھنے والے تھے جو کہ اب پرانے ہو چکے ہیں۔ اب ان سے بھی چھوٹے کیمرے بازاروں میں آ گئے ہیں اور اب انہی نادیدہ کیمروں کی مدد سے نشان زد افراد کو بے نقاب کیا جاتا ہے۔ ان آپریشنوں کے دوران بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسی سرگرمیوں میں شامل رہنے والوں کا کہنا ہے کہ جب رپورٹر خفیہ کیمرہ لے کر چلے تو ٹرانسمیٹر یا رسیور اس کی جیب میں ہو یا ساتھ چلنے والے شخص کے پاس ہو یا پھر باہر کھڑی کار میں رکھا ہو۔ ان آپریشنوں میں صاف ستھری تصویر سے زیادہ آواز کی کوالٹی پر توجہ دی جاتی ہے۔ تاہم کبھی کبھی تصویر قدرے دھندلی رہتی ہے اور آواز بھی کبھی کبھار زیادہ صاف نہیں ہوتی۔ یہ اسپائی کیمرے بہت زیادہ مہنگے نہیں آتے۔ ہاں ان کیمروں کی قیمت زیادہ ہوتی ہے جو نیوز ریکارڈنگ کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ جنھیں ڈی جی کیم کہتے ہیں۔ نیوز چینل جو سونی پی ڈی ۱۷۰ یا سونی پی ڈی ۱۵۰ استعمال کرتے ہیں وہ سوا تین سے ساڑھے تین لاکھ روپے کے درمیان آتے ہیں۔ مگر ہائی ٹیک اسپائی کیم پچاس ہزار سے ڈیڑھ لاکھ روپے تک میں مل جاتے ہیں۔ یہ باہر کے ہوتے ہیں بالخصوص کوریا، جاپان یا تائیوان کے۔ دہلی میں بھی بعض ڈیلروں سے یہ دستیاب ہو جاتے ہیں۔ دہلی کے ایک ڈیلر سریندر نارنگ کے مطابق جب کسی خریدار کو ان کیمروں کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ ان کو کیمروں کی کل قیمت کا ۷۵ فیصد پیشگی ادا کر دیتا ہے تب وہ کیمرے برطانیہ سے منگائے جاتے ہیں اور دہلی آنے میں سات آٹھ روز لگتے ہیں۔ ویسے ان کیمروں کے ڈپلی کیٹ بھی مل جاتے ہیں جو قدرے سستے ہوتے ہیں۔ انھیں دہلی میں ہی اسمبل کیا جاتا ہے اور یہ قرولباغ کی غفار مارکیٹ یا چاندنی چوک سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ تاہم ان کی حصولیابی آسان نہیں ہوتی، کیونکہ یہ مخصوص ڈیلروں سے ہی مل سکتے ہیں اور ان کی شناخت خفیہ ہوتی ہے۔ مشکل سے ان تک پہنچا جا سکتا ہے۔ اسٹنگ آپریشنوں میں گرچہ رپورٹر کافی جوکھم اٹھاتے ہیں، لیکن صرف انہی کا کام نہیں ہوتا بلکہ

دیکھا جائے تو اصل کام اس ٹیکنالوجی کا ہوتا ہے۔ اگر ٹیکنالوجی جدید اور ترقی یافتہ نہیں ہے تو اسٹنگ آپریشنوں کی کوالٹی متاثر ہو جاتی ہے، اس لیے اس کام میں ٹیکنالوجی پر خاص دھیان دیا جاتا ہے۔

یہ کیمرے اتنے ننھے اور چھوٹے ہوتے ہیں کہ انھیں ایسی جگہوں میں چھپایا جا سکتا ہے جو میٹل ڈٹیکٹر کی پکڑ سے باہر ہوں جیسے ہیئر بینڈ یا بیلٹ کے بکل میں۔ یہ کیمرے دوسری شکلوں میں بھی دستیاب ہیں اور یہ کثیر المقاصد آلات بن گئے ہیں، جیسے کیمرے والی گھڑی یا کیمرے والے ریڈیو۔ ایسے ریڈیو میں خفیہ کیمرہ چھپا ہوتا ہے اور ریڈیو میں فور چینل رسیور والا ۲ء۴ GHz کا ٹرانسمیٹر نصب ہوتا ہے۔ یہ کیمرے سات سوفٹ دور سے بھی آواز کی لہروں کو پکڑ سکتے ہیں اور تصویر اتار سکتے ہیں۔ ایسے کیمرے کمرے کے ایک گوشے میں رکھ دیے جاتے ہیں اور یہ اتنے ''معصوم'' ہوتے ہیں کہ غیر تربیت یافتہ شخص ان کو پکڑ نہیں سکتا۔ ان کے علاوہ سیمی کنڈکٹر والے کیمرے بھی ہوتے ہیں جن کو پکڑے جانے کے خدشے کے پیش نظر اسی کمرے میں رکھنا ضروری نہیں ہوتا۔ اس میں دیکھنے والی ایک ایسی آنکھ فٹ ہوتی ہے جسے آپ مچھلی کی آنکھ کہہ سکتے ہیں۔ یہ دو ایم ایم کے یا اس سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں اور یہ ایک بہت چھوٹے سوراخ سے بھی تصویر اتار سکتے ہیں۔ بٹن ہول کیمرے بھی ملتے ہیں جو کہ بٹن کی طرح الگ الگ رنگوں میں ملتے ہیں۔ ان کو آپ شرٹ یا اسکرٹ میں سی لیجئے اور پھر ان کا پتہ لگانا ناممکن ہو جائے گا۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وائرلیس کیمرہ پین بھی ملتے ہیں۔ یہ ۲ء۴ GHz ٹرانسمیٹر اور فور چینل رسیور اور تین بیٹری بیک اپ سے لیس ہوتے ہیں۔ یہ حیرت انگیز پین جو کہ جل پین کی مانند لکھتے ہیں، اپنے شکار کو ۹۰۰ فٹ کی دوری سے بھی پکڑ سکتے ہیں۔ یہ رنگین اور بلیک اینڈ وائٹ دونوں میں ملتے ہیں۔ اسٹنگ آپریشن کر چکے ایک چینل کے ایک ذمہ دار کے مطابق ایسے ''معصوم'' کیمروں کی فہرست یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ بٹن کے علاوہ چشمے کے فریم، ٹائی، بیلٹ، کلائی گھڑی، بیگ اور دیوار گھڑی وغیرہ بھی ان کیمروں کے میزبان بن سکتے ہیں۔

مجلد کتاب میں بھی یہ کیمرے چھپائے جا سکتے ہیں یہ کتابیں اسی مقصد کے لیے بنائی جاتی

ہیں اور انھیں فیکٹری، موٹیل، اسکول، دفتر یا کسی کے گھر میں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ ٹکنیشین ایسے کیمروں کو کتابوں کے حساب سے بنا دیتے ہیں۔

ان کیمروں کی کوالٹی نارمل ہوتی ہے۔ دراصل ایسے معاملات میں کوالٹی پر نہیں بلکہ کام کی سچائی پر دھیان دیا جاتا ہے۔ کام مستند ہونا چاہئے۔ کوالٹی اگر بہت بہتر نہیں ہے تب بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن ان میں ہیرا پھیری کی گنجائش بہت کم ہوتی ہے۔ چونکہ ان اسٹنگ آپریشنوں کی مدت طویل ہوتی ہے، لہٰذا ان سے چھیڑ چھاڑ نہیں کی جا سکتی۔ البتہ جب ایسی اسٹوری کو اخبارات و رسائل میں شائع کرنا ہو تو ان سے ضرور چھیڑ چھاڑ کی جا سکتی ہے اور کچھ کا کچھ کیا جا سکتا ہے۔ ہاں ایک اور طریقہ ہے ان کو بدلنے کا۔ ایسے ویڈیو میں نظر آنے والے شخص کا چہرہ دھندلا کیا جا سکتا ہے۔

اگر کوئی سینئر فوٹو گرافر چاہے تو ان کیمروں کو از خود اسمبل بھی کر سکتا ہے۔ خفیہ کیمرہ اسمبل کرنے کے لیے ایک فوکس رنگ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ چاندنی چوک میں آسانی سے مل جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایک موبائل ریکارڈر اور ایک عام سا دستی کیمرہ ہونا چاہئے۔ فوکس رنگ کو کوٹ، شرٹ یا پینٹ کے بٹن سے جوڑ دیجئے اور اسے اپنے کپڑوں کی تہہ میں چھپے تار سے جوڑ دیجئے اور پھر خفیہ کیمرے کو کندھے سے لٹکنے والے بیگ میں چھپا لیجئے۔

آپ پالیکا بازار میں ماچس سائز کا بھی کیمرہ خرید سکتے ہیں مگر وہ اتنے کارآمد نہیں ہوتے جتنے کہ مذکورہ خفیہ اور جاسوسی کیمرے ہوتے ہیں۔

بنگارو لکشمن والے فوٹیج سے ایسا لگتا ہے کہ اس کیس میں کیمرہ اس کے استعمال کرنے والے صحافی کی کمر سے کچھ اوپر رہا ہوگا۔ اس میں بریف کیس کا استعمال نظر نہیں آتا کیونکہ عموماً بریف کیس فرش پر رکھ دیا جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے آپریشن میں کیمرے کو روزانہ کے استعمال ہونے والی اشیا میں چھپا کر میز پر رکھ دیا گیا ہو، تاکہ بنگارو لکشمن کو کنکٹنگ کوارڈ دیکھ کر کوئی شبہ نہ ہو۔ یعنی کنکٹنگ کوارڈ چشمے میں استعمال کیا گیا ہوگا۔

اسٹنگ آپریشنوں پر بے پناہ اخراجات بھی آتے ہیں، لیکن آپریشن شروع کرنے سے قبل

اخراجات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ انڈیا ٹی وی کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر ہیمنت شرما کے مطابق ایک دن کا آپریشن ہو یا چار ماہ کا، یہ اندازہ قطعاً نہیں لگایا جا سکتا کہ اس پر کتنا صرفہ آئے گا۔ اخراجات کا انحصار آپریشن میں صرف ہونے والے وقت اور اس کی نوعیت پر ہوتا ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی رپورٹر چند روز تک کسی کے پیچھے کیمرہ لے کر دوڑتا ہے اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتا ہے، اس طرح ساری سرمایہ کاری پانی میں چلی جاتی ہے۔

اسٹار نیوز کے آپریشن ریڈ الرٹ پر جو کہ ہائی پروفائل ماڈلوں کے خلاف تھا، بیس لاکھ روپے خرچ ہوئے تھے۔ اس آپریشن کے لیے ممبئی کے ایک ہوٹل میرین میں ایک سوٹ بک کیا گیا تھا، جس کا یومیہ کرایہ ۲۵ ہزار روپے تھا اور رپورٹروں کا کئی دنوں تک اس ہوٹل میں قیام رہا۔ اس کے علاوہ ہر ایک ماڈل کو ڈھائی سے تین لاکھ روپے تک دیئے گئے۔ آج تک نے دہلی کے محکمہ انکم ٹیکس میں آپریشن گھوس محل کے نام سے جو اسٹنگ کیا تھا، اس پر لاکھوں روپے خرچ آئے تھے۔ ہر افسر کو اس کے عہدے کے مطابق دو ہزار سے سات ہزار روپے تک رشوت دی گئی تھی۔ آپریشن دریودھن اور آپریشن چکرویوہ پر بھی لاکھوں روپے خرچ ہوئے ہیں۔

آپریشن دریودھن

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے کہ آپریشن دریودھن کو براپوسٹ ڈاٹ کام کے انرودھ بہل نے کیا تھا۔ اس سے قبل وہ دو اسٹنگ آپریشن کر چکے تھے ایک میچ فکسنگ سے متعلق اور دوسرا آپریشن ویسٹ اینڈ جس میں فرضی دفاعی کمپنی کے نمائندوں کی حیثیت سے سیاستدانوں سے دفاعی سودا کیا گیا تھا اور جو تہلکہ ڈاٹ کام کے اسٹنگ آپریشن کے نام سے مشہور ہے۔ انرودھ بہل کا کہنا ہے کہ انھیں آپریشن دریودھن کرنے کا خیال ایک قومی اخبار میں ایک مضمون لکھنے کے بعد آیا۔ اس مضمون کی اشاعت کے بعد ان کو پارلیمنٹ سے پریولیج نوٹس ملا تھا اور پھر انھوں نے آپریشن دریودھن کرنے کی ٹھان لی۔

آٹھ ماہ تک چلے آپریشن دریودھن میں ۵۶ ویڈیو ٹیپ اور ۷۰ آڈیو ٹیپ بنائے گئے اور ۹۰۰

فون کالوں کو ریکارڈ کیا گیا۔ اس میں ۰ ۷ ممبران پر جال پھینکا گیا تھا، جن میں سے ایک نے رشوت لے کر سوال پوچھنے سے انکار کر دیا اور دوسرے نے دلالی کے ذریعہ رشوت لینے سے انکار کر دیا۔ جبکہ گیارہ ممبران اس جال میں پھنس گئے۔ آپریشن کرنے والے صحافیوں نے ایک فرضی تنظیم NISMA بنائی اور اس کے نمائندوں کی حیثیت سے ممبران سے ملاقات کی اور ان کے سامنے ساٹھ سوالات رکھے۔ کئی ممبران نے ایک ہی سوال پارلیمنٹ میں پوچھ لیا اور اس سوال کا جواب بھی آ گیا۔

اس آپریشن میں بی جے پی کے چھ، بی ایس پی کے تین اور کانگرس اور آر جے ڈی کے ایک ایک ممبر پھنس گئے۔ سب سے کم رقم بی جے پی کے رکن پارلیمنٹ (راجیہ سبھا/اڑیسہ) چھتر پال سنگھ لودھا نے لی۔ وہ محض پندرہ ہزار روپے میں بک گئے جبکہ سب سے زیادہ قیمت آر جے ڈی جھارکھنڈ کے منوج کمار نے لی۔ انھوں نے ایک لاکھ دس ہزار وصول کیے۔ باقی ممبران کی تفصیل یوں ہے: ایم کے انا پاٹل (بی جے پی، سابق وزیر، ارنا دل مہاراشٹر) ۴۵ ہزار، وائی جی مہا جن (بی جے پی جلگاؤں مہاراشٹر) ۳۵ ہزار، سریش چندیل (بی جے پی حمیر پور ہماچل پردیش) ۳۰ ہزار، پردیپ گاندھی (بی جے پی راج نندگاؤں چھتیس گڑھ) ۵۵ ہزار، چندر پرتاپ سنگھ (بی جے پی سیدھی مدھیہ پردیش) ۳۵ ہزار، نریندر کمار کشواہا (بی ایس پی مرزا پور، یوپی) ۵۵ ہزار، لال چندر کول (بی ایس پی۔ رابرٹ گنج یوپی) ۳۵ ہزار، راجہ رام پال (بی ایس پی بلہار پور، اتر پردیش) ۳۵ ہزار، اور رام سیوک سنگھ (کانگریس گوالیار مدھیہ پردیش) ۵۰ ہزار روپے۔ اس آپریشن میں تین لوگوں نے حصہ لیا تھا۔

کوبرا پوسٹ ڈاٹ کام کے ایڈیٹر اور آپریشن دریودھن کے ماسٹر مائنڈ انرودھ بہل یہ دعوا کرتے ہیں کہ انھوں نے یہ کام نیک نیتی سے کیا اور ان کا مقصد صرف اور صرف بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا تھا۔ تاہم ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ خفیہ کیمرے کا بیجا استعمال نہیں ہونا چاہئے اور صرف اور صرف عوامی مفاد میں ہی اسٹنگ آپریشن کرنا چاہئے۔ ان کے خیال میں عوامی مفاد کی تعریف

وتشریح بھی ہونی چاہئے کہ یہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے۔ الہ آباد کے رہنے والے انرودھ بہل کو اس آپریشن کے بعد دھمکیاں ملنے لگیں۔ ان کی نگرانی ہونے لگی اور ان کے فون ٹیپ کیے جانے لگے۔ تاہم وہ کہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ کیا وہ غیر اخلاقی یا غیر قانونی نہیں بلکہ صرف عوامی مفاد میں تھا۔ وہ اس الزام کو مسترد کر دیتے ہیں کہ انھوں نے بعض سیاستدانوں کے دامن کو داغدار کرنے کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر سازش کی۔

بہل کا کہنا ہے کہ سیاست میں دلالوں کی بھرمار ہوگئی ہے اور ساؤتھ ایونیو اور نارتھ ایونیو میں، جو کہ ممبران پارلیمنٹ کے رہائشی علاقے ہیں، ایسے دلالوں کی کمی نہیں ہے۔ ان سے ایک دلال ٹکرا گیا اور اس نے دوسرے دلالوں سے ملوادیا پھر تو ان کا کام آسان ہوگیا۔ ان کے خیال میں قسمت نے ان کا ساتھ دیا اور ایک کو چھوڑ کر کسی کو بھی ان پر شبہ نہیں ہوا۔

آپریشن دریودھن کیوں کامیاب ہوا؟ اس سوال کا جواب ایماندار سیاستدانوں اور سیاسی تجزیہ نگاروں کے بیانات اور تجزیوں کے نتائج سے سامنے آجاتا ہے اور ان لوگوں کا کہنا ہے کہ دراصل ہمارا سیاسی نظام اس قدر کرپٹ اور بدعنوان ہوگیا ہے کہ محض پندرہ ہزار روپے کی رشوت پر ایک ایم پی پھسل جاتا ہے۔ اب اگر ہم یہ بھی دیکھ لیں کہ ممبران پارلیمنٹ کو کتنی تنخواہ اور کتنا الاؤنس ملتا ہے تو شاید بیجا نہیں ہوگا۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوجائے گا کہ اتنی تنخواہ اور اس قدر سہولیات حاصل کرنے والے ممبران پارلیمنٹ بعض اوقات کیسے معمولی رقم لے کر اپنی اور ایوان کی ساکھ داغدار کر دیتے ہیں۔

ایک ممبر پارلیمنٹ کو کاغذ پر تنخواہ ایک لاکھ ۴۴ ہزار روپے سالانہ یعنی بارہ ہزار روپے ماہانہ ملتی ہے (اب یہ تنخواہ سولہ ہزار روپے ماہانہ ہوگئی ہے)۔ اس کے علاوہ ان کو درج ذیل سہولیات حاصل ہوتی ہیں:

- دفتر کے اخراجات کے لیے ۲۴ ہزار روپے ماہانہ
- حلقہ الاؤنس کے نام پر ۱۰ ہزار روپے ماہانہ
- اجلاس کے دوران یومیہ الاؤنس ۵۰۰ روپے۔ (ہر سال تین اجلاس بجٹ، مانسون اور

سرمائی اجلاس ہوتے ہیں)

- ایک ایم پی اس کی بیوی یا شوہر کو اور ایک معاون کو ملک میں کہیں بھی اور کسی بھی وقت فرسٹ کلاس ریلوے سفر مفت
- ہر سال اندرون ملک چالیس ہوائی سفر بزنس کلاس میں مفت
- ایک وسیع وعریض بنگلہ۔ جس کا ماہانہ کرایہ محض دو ہزار روپے۔ یہ بنگلہ اے سی، ریفریجریٹر، ٹی وی وغیرہ سے لیس ہوتا ہے اور اس میں مرمت مفت کی جاتی ہے۔
- ہر سال پچاس ہزار یونٹ بجلی مفت، پانی مفت۔
- تین فون لائن، سالانہ ایک لاکھ ستر ہزار فون کال مفت۔
- غیر ملکی سرکاری دورے پر بزنس کلاس کا فضائی ٹکٹ مفت اور سفری الاؤنس بھی۔
- علاج مفت (سرکاری ادارے کنٹری بیوٹری ہیلتھ سروس اسکیم کے تحت)
- مقامی ایریا ڈیولپمنٹ فنڈ کے نام پر دو کروڑ روپے سالانہ۔ البتہ یہ رقم براہ راست نہیں ملتی بلکہ جس ترقیاتی کام میں اس کا استعمال ہو رہا ہو اس ضلع کے متعلقہ افسران کے توسط سے ملتی ہے (آپریشن چکرویوہ میں رشوت خور ممبران نے اسی فنڈ کا سودا کیا تھا)
- پارلیمنٹ کی رکنیت مکمل ہونے کے بعد تین ہزار روپے ماہانہ بیسک پنشن۔ رکنیت کی مدت جتنی زیادہ ہوتی ہے پنشن اتنی ہی زیادہ ملتی ہے۔

ان سہولیات کو جوڑ کر دیکھیں تو ایک ایم پی کو ۶۲ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔

اگر ہندوستان میں سیاسی اور عوامی زندگی میں کرپشن کا بول بالا نہ ہوتا تو اتنی تنخواہیں اور الاؤنس پانے والے ممبران پارلیمنٹ اور سرکاری اداروں میں اونچے عہدوں پر فائز افسران معمولی رقموں پر اپنی رال نہ ٹپکاتے اور یوں اسٹنگ آپریشنوں میں پھنس کر رسوا نہ ہوتے۔

ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل نے ۲۰۰۵ء میں ہندوستان میں ایک سروے کر کے یہ نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کی کہ یہاں کرپشن کی صورت حال کیا ہے اور لوگ کرپشن کے دلدل میں کہاں تک ڈوبے ہوئے ہیں۔ اس کی رپورٹ کے مطابق ملک کے ۷۵ فیصد لوگوں نے کہا کہ گزشتہ ایک سال میں

سیاسی اور عوامی زندگی میں کرپشن میں بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ رپورٹ نے ایک نتیجہ یہ بھی اخذ کیا کہ ہندوستان دنیا کے ۱۵۹ کرپٹ ملکوں کی فہرست میں ۸۸ ویں نمبر پر ہے اور اس میں اسے ۲ء۹ نمبر ملے ہیں۔ جبکہ اس سے قبل وہ ۱۴۶ ملکوں کی فہرست میں ۹۰ ویں نمبر پر تھا اور اس میں اسے ۸ء۲ نمبر ملے تھے۔ ٹرانسپیرنسی انٹرنیشنل کی رپورٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ گیارہ سروسز میں کرپشن کی مجموعی رقم ۶۸ ء۲۱ کروڑ روپے سالانہ آنکی گئی ہے یعنی ایک سال میں اتنی رقم بدعنوانی کی نذر ہو جاتی ہے۔

جہاں تک ممبران پارلیمنٹ کے سوال پوچھنے کے عوض پیسے لینے کا معاملہ ہے تو یہ کوئی نیا نہیں ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اتنے بڑے پیمانے پر پہلی بار یہ معاملہ منظر عام پر آیا۔ ورنہ بیشتر ممبران ایسے مل جائیں گے جو اس تجربے سے گزرے ہوں گے۔ اگر ان کو اس کا علم نہیں ہوگا تو کم از کم ان کے سکریٹری کو ضرور ہوگا۔ لیکن ان کے ساتھ کوئی اسٹنگ آپریشن نہیں ہوا۔ اسی لیے اب تک کوئی پکڑا نہیں گیا۔ ۱۹۵۱ء میں بھی ایسا ہی ایک معاملہ سامنے آیا تھا جب کانگریس کے رکن ایچ جی مدگل نے پارلیمنٹ میں سوال پوچھنے کے عوض پیسے لیے تھے۔ اس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ معاملہ ایک کمیٹی کے سپرد کر دیا تھا۔ کچھ دنوں تک تو مدگل اِدھر اُدھر بھاگتے پھرے مگر جب پنڈت نہرو کا سامنا ہوا تو ان کی نظروں کی تاب نہ لا سکے فوراً انھوں نے استعفا دیدیا۔

امریکا کے رشوت خور ممبران پارلیمنٹ

اگر اور پیچھے جائیں تو بدعنوانی کے اور بھی مناظر دیکھنے کو مل جائیں گے۔ ملک کے سیاہ وسفید کا فیصلہ کرنے والے ممبران پارلیمنٹ اور قانون سازوں کی رشوت ستانی کا معاملہ بہت پرانا ہے۔ چدانندراج گھٹا نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ جس وقت ۱۸ ویں صدی کے اواخر میں ٹیپو سلطان ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے، جارجیا کی قانون سازیہ کے تمام ممبران اور اس کے بعد مسلسل تین حکومتوں کو ایک غیر معمولی فراڈ میں پکڑا گیا تھا جو یازولینڈ اسکینڈل کے نام سے مشہور ہوا تھا، جس میں سرکاری زمین کے بہت بڑے خطہ کو انتہائی معمولی قیمتوں میں

فروخت کر دیا گیا تھا۔ یعنی خود کو تمام جمہوریتوں کا باپ کہنے والے ملک امریکا میں بھی رشوت ستانی کا معاملہ بہت پرانا ہے۔

لیکن وہاں کے قانون ساز اتنے کم پیسے میں خود کو فروخت نہیں کرتے۔ ہندوستان میں جس ممبر نے سب سے کم قیمت لی تھی وہ تھی پندرہ ہزار روپے۔ وہاں لوگ اپنی اونچی بولی لگاتے ہیں۔ امریکا میں لابنگ کرنے والا گروپ ہے جو قانون سازوں کو مختلف بہانوں سے مراعات فراہم کرتا ہے اور اس کے عوض فائدہ اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ ممبران کو تعطیلات گزارنے کے اخراجات دیتا ہے، ڈنر پر بلاتا ہے، تحفہ تحائف دیتا ہے اور غیر ملکی اسفار کے اخراجات برداشت کرتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ساز باز میں ماہر وہ لوگ قانون سازیہ کے افسران کو بھی مختلف طریقوں سے خوش کرتے ہیں۔ لیکن ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہاں دھیان نہیں دیا جاتا، البتہ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ سامنے آجائے تو اس پر ضرور کارروائی ہوتی ہے۔ جیسے کہ ایک کانگریس مین **اینڈی کننگھم** (Randu Cunnin Gham) نے لکشمن ریکھا پار کر لی اور اس کی انھیں سزا ملی۔

ایک مالیاتی بدعنوانی میں کانگریس مین کننگھم نے ۲.۵ ملین ڈالر یعنی ۲۵ لاکھ ڈالر کی رشوت لی تھی۔ یہ رشوت انھوں نے بعض مخصوص ٹھیکہ داروں کو دفاعی سودوں میں فائدہ پہنچانے کے لیے لی تھی۔ انھوں نے کار، کارپیٹ اور اس طرح کے دیگر تحائف بھی لیے تھے۔ ان کے خلاف قانونی کارروائی ہوئی اور عدالت نے ان سے کہا کہ یا تو وہ خود کو قصوروار مان لیں اور دس سال کی جیل بھگتنے کو تیار ہو جائیں یا پھر عدالت میں اپنا دفاع کریں اور شکست کی صورت میں اپنی بقیہ زندگی جیل میں گزارنے کو ترجیح دیں۔ اس پر **کننگھم** نے پہلی تجویز قبول کر لی اور ۶۴ سالہ **کننگھم** نے دس سال کی قید کو عمر قید پر ترجیح دی۔

کننگھم ایسے واحد قانون ساز نہیں ہیں جنھوں نے رشوت خوری کی پاداش میں جیل کی ہوا کھائی۔ امریکی کانگریس کے متعدد قانون سازوں کے خلاف کارروائی کی جا چکی ہے۔ جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

۱۹۸۰ء میں سینیٹر ہیری سن ولیم سمیت نصف درجن قانون سازوں کو ایک اسکینڈل میں پکڑا

گیا، جسے ایبسکیم اسکینڈل (Abscam Scandal) کے نام سے جانا گیا۔ انھیں ایک سرکاری ٹھیکہ دلانے کے عوض رشوت کھانے کا ملزم قرار دیا گیا۔ ولیم کے خلاف الزامات ثابت ہو گئے اور انھیں تین سال کی جیل ہوئی۔ ۲۱ ماہ کی سزا کاٹنے کے بعد انھیں رہا کر دیا گیا۔

۱۹۹۴ء میں ڈیموکریٹک کانگریس مین ڈان روستین کومسکی (Dan Rostenkomski) کو ایک مالی بدعنوانی میں پکڑا گیا اور انھیں کم سے کم سیکورٹی والی جیل میں پندرہ مہینے گزارنے پڑے۔

۲۰۰۱ء میں اوہیو کے ڈیموکریٹ کانگریس مین جیمس ٹریفکینٹ (James Traficant) کو ایک فیڈرل گرینڈ جیوری نے ٹیکس چوری، رشوت خوری، ریکٹنگ، سازش اور انصاف میں رکاوٹ ڈالنے کا مجرم قرار دیا اور انھیں آٹھ سال کی سزا سنائی۔ وہ اپنی سزا کی نصف منزل پار کر چکے ہیں اور ابھی نصف قید بھگتنی ہے۔

برطانیہ کا بدنام زمانہ رشوت برائے سوال اسکینڈل

پارلیمنٹ میں سوال پوچھنے کے عوض پیسے لینے کا معاملہ صرف ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا ہے، بلکہ ایسا ہی ایک بدنام زمانہ واقعہ برطانیہ میں بھی پیش آیا اور وہاں ایک وزیر پر یہ جرم ثابت ہوا۔ البتہ اس وزیر نے جس کا نام نیل ہیملٹن (Neil Hamilton) ہے ہندوستانی ممبران پارلیمنٹ سے دس گنا زیادہ رقم لی تھی۔ ۱۹۹۰ء کے اوائل میں یہ تنازعہ ملک گیر سطح پر بحث کا موضوع بنا تھا اور ہیملٹن کو اس کی سزا بھگتنی پڑی تھی۔ گارجین اخبار نے اس اسکینڈل کو بے نقاب کرتے ہوئے الزام لگایا تھا کہ دو برطانوی کنزرویٹو ممبران پارلیمنٹ کو سوال کے عوض پیسے دیئے گئے ہیں۔ سوال اٹھوانے کی ضرورت ہیروڈس ڈپارٹمنٹ اسٹور کے متنازعہ مالک اور بزنس ٹائکون محمد الفیاد کو تھی۔ اس نے نیل ہیملٹن اور ٹیم اسمتھ کو سوال پوچھنے کے عوض دو ہزار پاؤنڈ فی سوال دیئے تھے۔ ہیملٹن نے دیگر تحائف کا بھی مطالبہ کیا جو پورا کیا گیا تھا۔ اسمتھ نے اپنے جرم کا اعتراف کرتے ہوئے استعفا دیدیا تھا۔ مگر ہیملٹن ۱۹۹۶ء تک مرکزی حکومت میں وزیر بنے رہے۔

رشمی روشن لال نے اپنے مضمون میں لکھا ہے کہ ہیملٹن کی حرص دن بہ دن بڑھتی چلی گئی۔

انھوں نے ۱۹۹۹ء میں نارتھ سی آئل کمپنی کو ٹیکس میں چھوٹ دلانے کے لیے اپنی کوششوں کے عوض دس ہزار پونڈ لیے تھے۔ یوروپین پارلیمنٹ کے لیبر رکن گیری ٹٹلی (Gery Titlly) کے مطابق یہ انکشاف ملک کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سوال کے بدلے پیسے لینے کے اسکینڈل سے یہ انکشاف ہوا کہ بعض ممبران پارلیمنٹ حکومت کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے لیے کام کرتے ہیں۔ بہرحال ہیملٹن کا معاملہ جب کافی اچھلا تو انھیں ۱۹۹۶ء میں استعفا دیدینا پڑا اور اس طرح ان کی سیاسی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ ۱۹۹۷ء میں پارلیمنٹری جانچ سے یہ ثابت ہوا کہ انھوں نے پیسے لیے تھے۔

ایک اہم سوال

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس طرح خفیہ کیمرے سے کسی کی بات چیت یا عمل کو اس کے علم میں لائے بغیر ریکارڈ کیا جا سکتا ہے اور کیا یہ قانونی طور پر جائز ہے؟ بعض مغربی ملکوں میں ایسے خفیہ ریکارڈنگ آلات کی خرید و فروخت اور کسی کے مکان یا آفس میں ان کے استعمال پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن متعدد ملکوں میں کسی شخص کے گھر یا آفس میں خفیہ طور پر اس کا استعمال غیر قانونی ہے۔ واٹر گیٹ کے معروف اسکینڈل میں خفیہ کیمرے ہی کی کارفرمائی رہی ہے جس میں اس وقت کے صدر امریکہ کو بے عزتی کے ساتھ اپنا عہدہ چھوڑنا پڑا تھا اور ان کے معاون کو جیل جانا پڑا تھا۔ امریکا میں بھی اس پر پابندی ہے، البتہ قانون نافذ کرنے والی ایجنسیوں اور پولس سے لائسنس یافتہ پرائیویٹ جاسوسوں کو ان آلات کے استعمال کی اجازت حاصل ہے۔ تاہم ان کو یہ ہدایت ہے کہ وہ بہت ہی خاص معاملات میں اور بہت ہوشیاری کے ساتھ یہ کام کریں۔ لائسنس یافتہ پرائیویٹ جاسوس شواہد حاصل کرنے کے لئے ان آلات کا استعمال کر سکتے ہیں، وہ اسٹنگ آپریشن نہیں کر سکتے۔ صرف فیڈرل بیورو آف انوسٹی گیشن (ایف بی آئی) ہی اسٹنگ آپریشن کر سکتا ہے۔ کوئی پرائیویٹ شخص یہاں تک کہ کوئی صحافی بھی اسٹنگ آپریشن نہیں کر سکتا۔ باوقار کمپنیاں جو ان آلات کو بناتی اور فروخت کرتی ہیں ان کے اشتہاروں پر مخصوص ہدایتیں درج کرتی

ہیں جن میں لکھا ہوتا ہے کہ ان کو استعمال کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اس ضمن میں مقامی ،صوبائی اور وفاقی قوانین کی پابندی کرے۔ان میں سے بعض آلات کے استعمال کے لئے پیشگی لائسنس لینا ضروری ہوتا ہے۔ان اشتہاروں میں یہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ اگر ان کا استعمال جرائم کے لئے کیا جائے یا قانون کی خلاف ورزی کر کے کیا جائے تو وہ کمپنیاں اس کی ذمہ دار نہیں ہوں گی ۔ ان کے استعمال کرنے والے کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ اس سلسلے میں قواعد وضوابط سے واقف ہو۔ مذکورہ تفصیلات اور قواعد وضوابط کی روشنی میں یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تہلکہ ڈاٹ کام نے جو کچھ ہندوستان میں کیا اگر وہی امریکہ میں کیا ہوتا تو ممکن ہے کہ اس کے صحافیوں کو گرفتار کر لیا جاتا اور ان کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ قائم ہو جاتا۔

امریکہ میں قانونی تحفظ کے باوجود نہ صرف پرائیویٹ افراد بلکہ قانون نافذ کرنے والی کمپنیوں کے ذریعہ بھی ان خفیہ آلات کے غلط استعمال کی شکایتیں بڑھتی جارہی ہیں۔حکومت ہند کے کابینہ سکریٹریٹ میں سابق ایڈیشنل سکریٹری اور انسٹی ٹیوٹ فار ٹاپکل اسٹڈیز کے ڈائرکٹر بی رمن ''اسٹنگ آپریشن،، کے عنوان سے تحریر کردہ اپنے مضمون میں لکھتے ہیں کہ واشنگٹن کی ایک غیر سرکاری تنظیم پرائیویسی انٹرنیشنل ۱۹۹۰ سے ہی ان آلات کے خفیہ استعمال سے پیدا شدہ خطرات کی طرف توجہ مبذول کرا رہی ہے۔اس کا کہنا ہے کہ ویڈیو آڈیو آلات کلوز سرکٹ ٹی وی کے خفیہ اور بے لگام استعمال سے انصاف کے بنیادی تقاضے خطرے میں پڑ گئے ہیں اور معاشرے کو بھی خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔پرائیویسی انٹرنیشنل کا کہنا ہے کہ حکومت کو چاہئے کہ وہ اس انڈسٹری کی جانچ کے لئے ایک واچ ڈاگ مقرر کرے جو مناسب قوانین کی سفارش کرے۔

بی رمن کے مطابق ایف بی آئی جبریہ وصولی،منشیات، نابالغوں کو سگریٹ کی فروخت اور چائلڈ سیکس سے متعلق شکایات کی جانچ کے لئے ہر سال ۱۷۵ اسٹنگ آپریشن کرتا ہے۔۱۹۹۲ میں ایسے ہی دو اسٹنگ آپریشنوں میں اس نے خفیہ کیمرے استعمال کر کے شکاگو کے ۱۸ سرکاری ملازمین اور انڈیانا میں بل کلنٹن کی انتخابی مہم کی ٹیم کے ایک ممبر کو رشوت لینے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔تاہم امریکا میں اسٹنگ آپریشنوں کے لئے سخت قواعد وضوابط

بنائے گئے ہیں تا کہ اس کا غلط استعمال کم سے کم ہو۔ پھر بھی امریکہ کی انسانی حقوق کی تنظیموں کو شکایت ہے کہ ایف بی آئی کے اسٹنگ آپریشنوں سے بے قصور شہریوں کو سنگین نقصانات ہوتے ہیں اور وہ غیر ارادتاً ایف بی آئی کی کارروائیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

کبھی کبھار بہت ہی مزیدار اسٹنگ آپریشن بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک آپریشن میں جو کیلی فورنیا میں کیا گیا بہت ہی دلچسپ انداز میں مطلوب مجرموں کو گرفتار کر لیا گیا۔ ہوا یوں کہ جیل حکام کو ایسے متعدد جرائم پیشہ افراد کی تلاش تھی جن کو جیل کی سزا ہو چکی تھی مگر وہ فرار تھے۔ پولیس اور جیل حکام نے ان کو پکڑنے کے لئے ایک اسٹنگ آپریشن کیا۔ انھوں نے ان مجرموں کے نام خطوط لکھے اور ان کو یہ مژدہ سنایا کہ آپ نے ایک بہت اچھا انعام جیتا ہے۔ آپ فلاں تاریخ کو فلاں وقت اور فلاں مقام پر آ کر اپنا انعام حاصل کر لیں۔ یہ تمام مجرم خط میں دئے گئے پتے پر وقت مقررہ پر پہنچ گئے اور جب اس عمارت میں داخل ہوئے تو انھوں نے وہاں جیل حکام اور پولیس والوں کو دیکھا۔ وہاں ان کا استقبال کیا گیا اور فوری طور پر ہتھکڑیاں پہنا کر گرفتار کر لیا گیا۔ پولیس والوں نے کہا کہ آپ لوگوں نے جیل جانے کا انعام جیتا ہے۔ گرفتار شدگان نے اس موقع پر کہا کہ خط پا کر ان کو یہ اندیشہ ہوا تھا کہ کہیں یہ اسٹنگ آپریشن نہ ہو مگر انعام کے لالچ میں وہ وہاں چلے گئے اور اس طرح گرفتار کر لیے گئے۔

اسٹنگ آپریشن سے متعلق مختلف نقطہ ہائے نظر

اب ہم پھر لوٹتے ہیں نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشنوں کی طرف۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ اسٹنگ آپریشن اخلاقی طور پر جائز ہیں، کیا ان کو قانونی تحفظات حاصل ہیں، کیا ایسے اسٹنگ آپریشنوں کی اجازت ہے جن کا مقصد بدعنوانی کو اجاگر کرنا کم اور کردار کشی کرنا زیادہ ہو، کیا ان آپریشنوں کی زد پر آئے ہوئے شخص کو قانونی اجازت ہے کہ وہ ان چینلوں کے خلاف کارروائی کر سکے۔ یہ تو واضح ہے کہ ایسے بیشتر آپریشنوں کا مقصد اپنی مقبولیت میں اضافہ کرنا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ انڈیا ٹی وی جیسے مذکورہ آپریشن اسی لئے کئے جاتے ہیں کہ بدعنوانی کو بے

نقاب کرنے کی آڑ میں سنسنی خیزی پیدا کی جائے اور اپنی مقبولیت بڑھائی جائے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایسی مخرب اخلاق حرکتوں کی ریکارڈنگ بار بار نہیں دکھائی جاتی۔

کہا جاتا ہے کہ ایسے اسٹنگ آپریشنوں کا بڑا مقصد پیسہ کمانا ہوتا ہے اور بدعنوانی کو اجاگر کرنا ثانوی درجے میں آجاتا ہے۔ ٹی وی چینل ان آپریشنوں سے اپنا TRP بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں جس کے سبب ان کو ملنے والے اشتہاروں کی تعداد اور ان کے معاوضے میں کئی گنا کا اضافہ ہوجاتا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق انڈیا ٹی وی نے شکتی کپور اور امن ورما کے خلاف جو اسپائی کیم آپریشن کیا تھا اس کا بھی مقصد یہی تھا اور وہ اس میں کامیاب بھی رہا۔ اس آپریشن کے بعد انڈیا ٹی وی کے بزنس میں دس فیصد کا اضافہ ہوگیا تھا۔ سن رائز ایڈورٹائزنگ پرائیویٹ لمیٹڈ کے ڈائرکٹر دیویندر راوت کے مطابق انڈیا ٹی وی مذکورہ اسٹنگ آپریشن سے قبل دس سکنڈ کے اشتہار کے لیے پانچ سو روپے چارج کیا کرتا تھا لیکن آپریشن کے بعد اس کی شرح بڑھا کر فی دس سکنڈ آٹھ سو روپے کردی گئی۔ یہی نہیں بلکہ یہ چینل اس طرح کے ہر آپریشن کے بعد اپنے ناظرین سے ایس ایم ایس بھیجنے پر اصرار بھی کرتے ہیں۔ مذکورہ آپریشن کے بعد اس کو ایک لاکھ ایس ایم ایس ملے تھے یہ ایس ایم ایس عام ایس ایم ایس کے مقابلے میں مہنگے ہوتے ہیں اور اس سے جو رقم اکٹھی ہوتی ہے وہ سروس مہیا کرنے والی کمپنی اور متعلقہ چینل میں تقسیم ہوجاتی ہے۔

انرودھ بہل کے آپریشن دریودھن نے ملک میں ایک ایسا ہنگامہ برپا کیا تھا جس کے نتیجے میں پارلیمنٹ نے عدیم المثال فیصلہ لیتے ہوئے اپنے گیارہ ممبران کو پارلیمنٹ کی رکنیت سے برطرف کردیا تھا۔ انرودھ بہل یہ دعوا کرتے ہیں کہ انھوں نے بدعنوانی کو بے نقاب کرنے کے لیے ایمانداری کے ساتھ یہ آپریشن کیا تھا۔ مگر وہ یہ نہیں بتاتے کہ انھوں نے جو لاکھوں روپے خرچ کیے وہ کہاں سے آئے اور اس کا انھیں کیا فائدہ حاصل ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ بتائیں گے بھی نہیں۔ مگر ایک سیاسی تجزیہ نگار اجے بوس نے روزنامہ پائنیر میں اپنے مضمون میں لکھا ہے:

> ''افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ تسلیم کرنا بہت مشکل ہے کہ عوامی مفاد میں یہ آپریشن کیا گیا، کیونکہ انرودھ بہل نے خود اس سے قابل ذکر مالی

فائدہ اٹھایا ہے اور ایسا قیاس لگایا جا رہا ہے کہ انھوں نے اس آپریشن کے ٹیپ کو ایک ٹی وی چینل کے ہاتھوں کم از کم ایک کروڑ روپے میں فروخت کیا ہے۔ یہ رقم اس آپریشن میں خرچ ہونے والی رقم سے کئی گنا زیادہ ہے''۔

لیکن آپریشن دریودھن اور آپریشن ویسٹ اینڈ میں شامل رہے ایک صحافی کمار باول اسٹنگ آپریشنوں کے اثرات کو اہمیت دیتے ہیں اور ساتھ میں یہ بھی کہتے ہیں کہ اس میں جان کو جوکھم میں ڈالنا پڑتا ہے۔ قانونی خوف الگ رہتا ہے۔ وہ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ جہاں جان کو جوکھم میں ڈال کر آپریشن کیا جاتا ہے وہاں مالی فائدہ کتنا ملے گا؟ تاہم وہ ایسے اسٹنگ آپریشن کے حق میں نہیں ہیں جو عوامی مفاد میں نہ کیا گیا ہو۔ بقول ان کے:

''صرف TRP بڑھانے یا سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے اس بڑے کام کو ہاتھ میں نہیں لینا چاہئے اور مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کا میڈیا ذمہ داری کے ساتھ اپنے فرائض کی ادائیگی کرے گا کیونکہ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت میں میڈیا پر اعتماد کیا جا سکتا ہے''۔

کمار بادل آگے کہتے ہیں:

''ان اسٹنگ آپریشنوں کو بند کرنے یا ان پر پابندی عائد کرنے سے قبل بہتر ہوگا کہ ہم ان آپریشنوں کا اثر ہندوستان جیسے ترقی پذیر سماج پر دیکھ لیں۔ اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ ایک عام ہندوستانی نے اپنی آنکھ سے دیکھ لیا ہے کہ اقتدار کے ایوانوں میں کیا ہوتا ہے، چاہے وہ کرکٹ میچ میں فکسنگ ہو، دفاعی سودوں میں کمیشن خوری ہو، ممبران پارلیمنٹ کا ایوان میں سوال پوچھنے کے لیے رقم طلب کرنا ہو، یا ایم پی لیڈ فنڈ میں کمیشن خوری ہو۔ اس کے علاوہ سرکاری افسران کا رشوت قبول کرنا، تہاڑ جیل میں معمولی چیزوں کے لیے پیسے لینا، انسپکٹر جنرل آف پولیس (آئی جی پی) کا فائل آگے بڑھانے کے لیے رشوت لینا وغیرہ جن میں مقامی افسران کے کرپٹ رویہ کو سامنے لایا گیا ہے، ان کیسوں میں خطا کار افسران کو معطل کر دیا گیا اور ان کے خلاف مقدمہ

چلانے کی کارروائی شروع کردی گئی یہاں تک کہ آپریشن ویسٹ اینڈ میں رشوت طلب کرتے ہوئے دکھائے جانے والے فوجی افسران کا کورٹ مارشل کردیا گیا،لیکن طاقتور اور بااثر سیاستداں محفوظ رہے، ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی،لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ رشوت لیتے وقت افسر یہ ضرور پوچھ لیتا ہے کہ کہیں کیمرہ تو نہیں چھپا ہوا ہے۔

خفیہ کیمرے کا خوف، سرکاری ایجنسی کی شکایت یا سی بی آئی کی کرپشن مخالف ٹیم کے ذریعہ پکڑے جانے سے زیادہ شدید ہے، عام لوگ جو سرکاری محکموں میں کرپشن یا رشوت خوری کے خلاف شکایت کرنے کے لیے سرکاری محکموں کے ہی افسران پر تکیہ کیے ہوئے تھے، اب ان کو ایک اور راستہ مل گیا ہے وہ ہے ٹیلی ویژن چینلوں کا۔ وہ اب کسی بھی ٹیلی ویژن چینل سے بات کرکے اپنی شکایت کرسکتے ہیں۔ ان کو ایسا کرکے تسلّی ملے گی کہ انھوں نے بدعنوان افسران کو رنگے ہاتھوں پکڑوا دیا ہے۔ اسٹنگ آپریشن سے عام شہری کو بڑا استحکام اور سکون ملا ہے، اس کا اثر اتنا ہے کہ سرکاری مشینری یا غیر سرکاری تنظیموں کی مہم کا اثر بھی اس قدر گہرا اور دیرپا نہیں ہوتا جتنا معمولی اسٹنگ آپریشن کا ہوتا ہے۔ عام آدمی کو اس سے طاقت ملی ہے۔ اسٹنگ آپریشن پر پابندی عائد کرنے سے قبل پالیسی سازوں کو یہ ضرور سوچنا پڑے گا کہ پالیسی ساز اپنی ذمہ داری سے فرار حاصل نہیں کرسکتے ہیں کہ اس مہم نے عام آدمی کو اقتدار دیا ہے، صرف ان لوگوں میں ہی خوف ہے جو اپنے کرتوت چھپانا چاہتے ہیں۔ نوبل انعام یافتہ سروی ایس نائیپال نے مجھ سے کہا کہ کمار تم نے طاقتور اور برسر اقتدار لوگوں کی بداعمالیوں کو منظر عام پر لاکر بہت بڑا کام کیا ہے، لیکن یاد رکھو تم ایسے لوگوں سے مقابلہ کررہے ہو جو بہت طاقتور ہیں جن کے پاس زبردست اثر ورسوخ ہے، تم سب سے پہلے اپنی بنیاد مستحکم کرو تاکہ تم آگے بڑھ سکو۔ میں نائیپال کو خط لکھنے کو سوچ رہا ہوں کہ بنیاد کو مستحکم بنادیا گیا ہے اور ملک میں ایک تہلکہ سے کئی تہلکہ نے جو مشن شروع کیا تھا وہ آگے بڑھ گیا ہے، ہندوستان میں بہت سے صحافی اس اسٹنگ آپریشن کو آگے بڑھانے پر سنجیدگی کے ساتھ سوچ رہے ہیں۔ آپریشن دریودھن کے بعد فوراً آپریشن چکرویوہ سامنے آیا ہے، صحافی جمشید خان اور مایا بھوشن ناگونکر جیسے جانباز صحافیوں نے دستک دی ہے مجھے فخر ہے ان دونوں نے ہی مجھ

کو کیمرہ پکڑنا سکھایا ہے اور جب میں تہلکہ میں تھا تو وہ میرے ساتھی تھے تمام ٹیلی ویژن چینل اسٹنگ آپریشن کے باقاعدہ سیل کھول رہے ہیں۔ میری یہ دلی خواہش ہے کہ ایک دن سرکار کو براپوسٹ ڈاٹ کام کے ایڈیٹرانرودھ بہل کو ہندوستان میں اسٹنگ آپریشن شروع کرانے کے لیے ضرور اعزاز سے نوازے۔ میں نے بہت سے اسٹنگ آپریشن جیسے فالن ہیروز، آپریشن ویسٹ اینڈ، آپریشن دریودھن میں حصہ لیا مجھ کو فخر ہے کہ میں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ میں اس طرح کے آپریشن چلا کر مالی فائدہ حاصل کروں جبکہ بہت سے لوگ یہ کہہ رہے ہیں کہ صحافی اسٹنگ آپریشن سے مالی فائدہ اٹھا رہے ہیں، دولت کما رہے ہیں ایسے الزامات بنیادی اور اساسی ایشوز سے توجہ ہٹانے کے لیے لگائے جا رہے ہیں۔ اسٹنگ آپریشن کا اپنا ایک صحافتی جواز ہے'' آپریشن'' انجام دینے والوں کو کئی اہم باتوں کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے''۔

لیکن این ڈی ٹی وی 24x7 کی مینجنگ ایڈیٹر برکھا دت ایسے اسٹنگ آپریشنوں کی پوری طرح حمایت نہیں کرتیں۔ ان کا کہنا ہے:

> ''اب تو مجھے بھی لوگ مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے ہیں۔ اب یہ سوالات اٹھنے لگے ہیں کہ کیا صحافیوں کو اپنا شکار پھانسنے کے لیے شیرا لے کر یا چوہے دانی لے کر چلنا چاہیئے؟ کیا ہم کو چیک بک صحافت کرنی چاہیئے۔ آج ہم نوٹوں کا بنڈل لے کر نکل پڑتے ہیں اور سفر شروع کرنے سے قبل ہی ہمیں اپنی منزل کا پتہ ہوتا ہے (یعنی ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کس کو پھانسنا ہے) اس سلسلے میں وہی پرانی دلیل دی جاتی ہے کہ بعض اسٹوری حاصل کرنے کے لیے دوسرا کوئی راستہ نہیں ہوتا''۔

وہ اس طریقہ کار پر بہت سے سوالات کھڑے کرتی ہیں۔ روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے ۲۶ دسمبر ۲۰۰۵ء کے شمارے میں انھوں نے اپنے مضمون میں لکھا ہے:

'' کولمبیا یونیورسٹی کے جرنلزم اسکول میں جہاں میں نے تعلیم حاصل کی، میرے استاد پروفیسر ز ایک واقعہ سناتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کی دہائی میں امریکی اخبار شکاگو سن ٹائمز نے ان پولیس

والوں اور افسران کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا جو شراب کا لائسنس دینے کے عوض بھاری رشوت لیتے تھے۔ لہٰذا ۱۷ رپورٹروں کو ایک بار یعنی شراب خانہ کھولنے کی ذمہ داری دی گئی۔ انھوں نے میراج نام سے ایک بار کھولا اور یہ اعلان کرا دیا کہ آپ یہاں سے سستی شراب حاصل کر سکتے ہیں۔ پلان کامیاب رہا اور پولیس انسپکٹر رشوت مانگنے آنے لگے۔ یہ بار چار ماہ تک چلا اور تقریباً روزانہ پولیس رشوت لینے پہنچ جاتی تھی۔ رپورٹروں نے خفیہ کیمروں کا استعمال کیا اور انھیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیا۔ بار بند کر دیا گیا اور یہ اسٹوری ۲۵ قسطوں میں اخبار میں شائع ہوئی۔ اسے مختلف ایوارڈ حاصل ہوئے مگر پلٹزر ایوارڈ نہیں مل سکا۔ اس کا فیصلہ کرنے والی جیوری نے اس طریقہ کار کو تسلیم نہیں کیا۔ حالانکہ رپورٹروں نے یہ دلیل دی کہ انھوں نے کوئی مصنوعی لالچ نہیں دیا، میز پر جان بوجھ کر رشوت میں پیسے نہیں رکھے گئے۔ انھوں نے تو واقعی ایک اصلی بار کھولا تھا تاکہ وہ یہ دکھا سکیں کہ چھوٹے موٹے کاروباریوں کو کس طرح روزانہ بدعنوان لوگوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، مگر جیوری نے رپورٹروں کی یہ دلیل تسلیم نہیں کی''۔

برکھا دت کا کہنا ہے:

''میرے نزدیک وہ اسٹنگ آپریشن سب سے معتبر ہے جس میں اس وقت خفیہ کیمرہ استعمال کیا جائے جب واقعتاً کوئی بدعنوانی ہو رہی ہو۔ دوسرے لفظوں میں بدعنوانی اگر ہو رہی ہے تو اس کو پکڑنا اور بے نقاب کرنا معتبر اسٹنگ آپریشن ہے، خواہ کیمرے کا استعمال ہو یا نہ ہو۔ موجودہ صورت حال یا ''پھنساؤ صحافت'' رپورٹروں کے اصل رول یا ان کے اصل فرائض کو دھندلا کر رہی ہے۔ ہم پیشہ ور جاسوس یا ایکٹر بن کر دوسروں کے کام کرنے لگے ہیں۔ تہلکہ والوں نے اپنے اسٹنگ آپریشن میں کال گرلز کو استعمال کیا تھا یا کم از کم وہ عورتیں خود کو کال گرلز پوز کر رہی تھیں۔ اس کا مقصد تجربہ کار لوگوں کو نرم کر کے راہ راست پر لانا تھا۔ آپریشن دریودھن میں جو آواز سنائی دیتی ہے وہ کسی سابق انشورنس سیلر کی محسوس ہوتی ہے۔ اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ایک وقت ایسا آئے گا جب حقیقی اطلاعات حاصل کرنے کا سرچشمہ خشک ہو جائے گا اور پھر اطلاعات کی حصولیابی کا ایک ہی راستہ بچے گا اور وہ ہوگا، سورس یعنی ذریعہ''۔

جبکہ سی۔فو(Cfore) کے ڈائرکٹر یشونت دیش مکھ ایسے آپریشنوں کی مکمل تائید وحمایت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یومیہ زندگی میں درآئے کرپشن کو اگر صحافی بے نقاب نہیں کرے گا تو کون کرے گا۔لیکن وہ اسٹنگ آپریشنوں میں پاکیزگی پر زور دیتے ہیں۔ بقول ان کے تہلکہ انکشافات کے وقت سی ووٹر نے زی نیوز کے لیے ایک رائے شماری کروائی تھی جس میں ۹۵ فیصد لوگوں کا جواب تھا کہ سیاسی حلقوں کو بدعنوانوں سے پاک کرنے کے لیے ایسے اسٹنگ آپریشنوں میں پاکیزگی ہونی چاہئے۔ پانچ سال بعد بھی یہ بنیادی نظریہ تبدیل نہیں ہوا ہے۔لیکن بقول ان کے ایسے اسٹنگ آپریشنوں کے جواز پر شکوک وشبہات کی انگلی اٹھائی جا سکتی ہے، مگر اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اس نے سیاست، تجارت اور سماج سے کرپشن کو ختم کرنے میں مدد دی ہے۔ممکن ہے کہ ایسے آپریشنوں کے پس پردہ مالی مقاصد کی کارفرمائی ہو مگر اسے کون نظر انداز کر سکتا ہے کہ ہارس ٹریڈنگ سے لے کر پارلیمنٹ کے وقار کو داغدار کرنے والوں کی شناخت کرنے میں ان سے مدد ملی ہے۔وہ کہتے ہیں:

> ”بعض لوگ الیکٹرانک میڈیا کے اس رول کے جواز پر انگلی اٹھا سکتے ہیں، مگر میں ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر میڈیا نے واچ ڈاگ کا کام نہیں کیا تو پھر کون کرے گا۔میڈیا کی مانند عدلیہ پر بھی اس وقت ضرورت سے زیادہ سرگرم ہونے کا الزام لگایا جاتا ہے جب وہ ایسا کچھ کرنا چاہتی ہے۔جو لوگ بدعنوان ہیں ان کو عوام کے سامنے اپنے کرتوتوں کے تئیں جوابدہ ہونا چاہئے اور میڈیا بھی عوام کے تئیں جوابدہ ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ آج میڈیا اپنا یہ فرض بحسن وخوبی نبھا رہا ہے“۔

تاہم اسی کے ساتھ یشونت دیش مکھ عوامی مفاد والے اسٹنگ آپریشنوں اور سنسنی خیزی والے اسٹنگ آپریشنوں میں فرق بھی کرتے ہیں۔ان کا کہنا ہے کہ سنسنی خیزی والے آپریشن نہیں ہونے چاہئیں۔اس ضمن میں وہ ایک رپورٹر کے امیتابھ بچن کی بیماری کے وقت اسپتال میں ایک ڈاکٹر کے بھیس میں ان کے کمرے میں گھس جانے کا واقعہ بھی پیش کرتے ہیں اور اسے

عوامی مفاد والا آپریشن نہیں مانتے (خیال رہے کہ ٹی وی چینل آج تک کی ایک رپورٹر نے یہ حرکت کی تھی مگر بعد میں چینل نے اس خبر کی تردید کی تھی)

اس سلسلے میں وہ بعض مغربی ملکوں کی مثال دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہاں کسی شخص کے گھر یا دفتر میں خفیہ کیمرے کا استعمال ممنوع ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکا کے ایک صدر کو اپنے سیاسی حریف کو خفیہ کیمرے کے ذریعے پکڑنے کی کوشش میں رسوا ہو کر مستعفی ہونا پڑا تھا۔ لیکن چونکہ ہندوستان میں ایسا کوئی قانون نہیں ہے اس لیے یہاں کے صحافی بجا طور پر خفیہ کیمروں کا استعمال کر سکتے ہیں۔ میں ہندوستانی صحافیوں کا موازنہ امریکی صحافیوں سے نہیں کر رہا، البتہ جو فرق ہے اس کو اجاگر کر رہا ہوں۔ وہ سوال کرتے ہیں کہ امریکا میں ایف بی آئی ہر سال ڈیڑھ دو سو اسٹنگ آپریشن کرتا ہے مگر کیا ہندوستان میں عوامی زندگی میں بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے سی بی آئی نے کوئی اسٹنگ آپریشن کیا؟ اب ایسی صورت حال میں اس کھائی کو کون پاٹے گا؟ لہٰذا ہندوستانی میڈیا آگے آیا ہے اور وہ اس کھائی کو پاٹنے کا فریضہ انجام دے رہا ہے۔

اس سلسلے میں ہم نے مختلف شعبوں کے لوگوں سے گفت وشنید کی تو الگ الگ رائیں سامنے آئیں۔ جہاں ایک طبقہ ایسے اسٹنگ آپریشنوں کو جائز سمجھتا ہے وہیں دوسرا طبقہ سرے سے ان کو مسترد کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ان آپریشنوں کی قانونی اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔ کچھ لوگ بعض تحفظات کے ساتھ اس کی اجازت دیتے ہیں، لیکن یہ بھی کہتے ہیں کہ ان آپریشنوں کا مقصد بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا ہونا چاہئے نہ کہ سنسنی خیزی پیدا کرنا۔ میڈیا کو زیادہ سے زیادہ آزادی دینے کی حمایت کرنے والوں کا کہنا ہے کہ ان آپریشنوں پر کوئی روک ٹوک نہیں ہونی چاہئے اور ایسا کرنے والوں کے خلاف کوئی کارروائی بھی نہیں ہونی چاہئے۔ جبکہ بیشتر لوگوں کا خیال ہے کہ اسٹنگ آپریشنوں کی آڑ میں کردارکشی کی اجازت نہیں دی جانی چاہئے اور اگر کسی ٹی وی چینل کے اسٹنگ آپریشن میں کسی شخص کی کردارکشی کی گئی ہے تو اس کو اس چینل کے خلاف ہتک عزت کا مقدمہ قائم کرنے کی قانونی اجازت ہونی چاہئے اور اگر واقعی کردارکشی کے مقصد سے وہ آپریشن کیا گیا ہے تو اس کے ذمہ داروں کو قرار واقعی سزا ملنی چاہئے۔ ایسے قوانین تو موجود ہیں اور ان کا سہارا

لے کرامن ورما اور شکتی کپور جیسے لوگوں نے انڈیا ٹی وی کے خلاف قانونی کارروائی بھی کی ہے، لیکن ایسی کوششوں کے کیسے نتائج برآمد ہوتے ہیں اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔

جب ہم نے خفیہ ایجنسیوں کے بعض ذرائع سے (جن کو عرف عام میں جاسوس کہا جاتا ہے) یہ سوال کیا کہ کیا نیوز چینل والے جاسوسی کر کے ان کے دائرہ کار میں مداخلت تو نہیں کر رہے ہیں تو انھوں نے کہا کہ نہیں یہ مداخلت نہیں ہے۔ اگر ان آپریشنوں کا مقصد بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا ہے، رشوت ستانی کے خلاف لوگوں کو بیدار کرنا ہے، کرپٹ افسران کو لوگوں کے سامنے ننگا کرنا ہے اور سسٹم میں موجود خرابیوں کو طشت از بام کرنا ہے تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ نیوز چینل کے رپورٹر بھی جاسوسی کر سکتے ہیں لیکن اس میں بہت احتیاط برتنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جاسوسی کی آڑ میں اور نئی نئی اسٹوری تلاش کرنے کی ہوس میں بے قصور لوگوں کو قصور وار ٹھہرا دیا جائے اور جو لوگ کرپٹ اور بدعنوان نہیں ہیں، شبہات کی بنیاد پر ان کو بھی کرپٹ اور بدعنوان قرار دے دیا جائے۔ ان ذرائع کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ان اسٹنگ آپریشنوں کی آڑ میں کسی کی کردار کشی کی جا رہی ہو، وہ عمداً ہو یا نادانستگی میں کردار کشی کا پہلو نکلتا ہو تو اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جانی چاہئے۔ اس لئے نہیں کہ وہ جاسوسی کرنے کے دوسروں کے کاموں میں مداخلت کر رہے ہیں، بلکہ اس لئے کہ ان کی نام نہاد جاسوسی سے سماج میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہو سکتا ہے۔ ان کو اس کی بھی اجازت نہیں دی جانی چاہئے کہ وہ بات بے بات جاسوسی کرنے نکل پڑیں۔ بہت خاص حالات میں ہی اس کی اجازت دی جانی چاہئے۔ اگر ان کی کوششوں سے سماج کو مختلف برائیوں سے پاک کرنے میں مدد ملے تو اس کی ضرور ستائش کی جانی چاہئے لیکن اگر اس کے برعکس نتائج برآمد ہوں تو اس کی قطعاً اجازت نہیں ملنی چاہئے۔ یہ ذرائع زور دے کر کہتے ہیں کہ اسٹنگ آپریشن اور کردار کشی میں فرق کو نہ صرف سمجھنا چاہئے بلکہ کردار کشی سے ہر حال میں پرہیز کرنا چاہئے اور اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرتا ہے تو اس کے خلاف قانونی کارروائی ضرور کی جانی چاہئے۔

ایک بات یہ بار بار اٹھائی جاتی ہے کہ میڈیا اسٹنگ آپریشن کی آڑ میں لوگوں کی ذاتی زندگی

میں جھانکنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں شاہد کپور اور قرینہ کپور کا واقعہ مثال کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ ایک ٹی وی چینل نے ان دونوں کے قابل اعتراض مناظر کو محض اس لئے بار بار دکھایا تا کہ ناظرین میں سنسنی پیدا ہو اور ان کے ذہن میں مذکورہ چینل کا نام بیٹھ جائے۔ ورنہ اخلاقی طور پر اس کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ ان دونوں کے بوس و کنار کے فحش مناظر دکھائے جاتے۔ اگر ایسے مناظر کو دکھانے کی اجازت دیدی جائے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ دوسروں کی خواب گاہوں میں بھی جھانکنا اپنا وطیرہ بنا لیں اور جس طرح لیڈی ڈائنا کو پاپارازی فوٹوگرافروں کے دست برد سے بچنے کی کوشش میں اپنی جان گنوانی پڑی اسی طرح یہاں شرفاء کو ایسی آہنی خواب گاہیں بنانی پڑ جائیں جن میں پرندہ بھی پر نہ مار سکے اور جاسوس نما صحافی ان کی دیواروں سے سر ٹکرانے لگیں۔

اس بات کی تائید ایک بہت بڑا حلقہ کرتا ہے کہ اپنی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرانے کے لئے اس قسم کے آپریشن کئے جاتے ہیں۔ این ڈی ٹی وی کے ایک پروگرام میں ممبئی کے ایک نڈر صحافی نکھل واگھلے نے بھی اس کی تائید کی اور بتایا کہ جب ممبئی سے ہندوستان ٹائمز کا ایڈیشن شروع ہونے والا تھا تو اس کو ایسا کوئی اسکینڈل چاہئے تھا جس کے سہارے وہ لوگوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا سکے اور اسے ایک ایسا اسکینڈل مل گیا اور وہ تھا فلم اداکار سلمان خان اور اداکارہ ایشوریہ رائے کے مابین ہوئی بات چیت۔ جس میں سلمان خان نے یہ دعوی کیا تھا کہ اس کا تعلق مافیا ڈانوں سے ہے اور اسے ممبئی بم دھماکوں کی پیشگی اطلاع تھی۔ واضح رہے کہ یہ ٹیپ چار سال پرانا تھا اور باخبر لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ٹیپ پولس نے خود ہی فراہم کیا تھا، حالانکہ اس نے چار سال کے دوران اس کی بنیاد پر کوئی کارروائی نہیں کی، لیکن جب اس ٹیپ کی تفصیلات ہندوستان ٹائمز میں شائع ہوئیں اور ٹی وی چینلوں پر اسے دکھایا گیا تو سلمان خان کے خلاف ایک طوفان برپا ہو گیا اور میڈیا نے اس سلسلے میں اپنے فیصلے خود سنا دئے۔ تاہم نکھل واگھلے جیسے لوگوں نے کہا کہ میڈیا نے اس معاملے میں لوگوں کے گھروں میں جھانکنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ ان کی اور ان جیسے دیگر باخبر لوگوں کی باتوں سے ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ میڈیا نے اس کیس میں تاک جھانک نہ کی ہو مگر

وہ اکثر و بیشتر یہ جرم کرتا رہتا ہے۔لیکن میڈیا کی گوش مالی کسی بھی طرف سے نہیں ہوتی۔نہ ایسے قوانین ہیں جن سے اس کو روکا جا سکے اور نہ ہی پریس کونسل آف انڈیا میں اتنی طاقت ہے کہ وہ کردار کشی کرنے والے چینلوں کے خلاف کوئی کارروائی کر سکے۔ پریس کونسل آف انڈیا ایک ایسا شیر ہے جس کے دانت نکال لیے گئے ہیں اور جس کے ناخن اکھیڑ دئے گئے ہیں۔ یہ بات بھی بار بار اٹھتی ہے کہ پریس کونسل آف انڈیا کو اتنے اختیارات دئے جانے چاہئیں کہ وہ اپنے طور پر کارروائی کر سکے،لیکن اس سمت میں کوئی قدم نہیں اٹھایا جاتا۔اگر کسی معاملے نے بہت طول پکڑا تو اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ پریس کونسل اس کی مذمت کر دے اور آئندہ اس قسم کی رپورٹنگ سے اجتناب کرنے کی تلقین کر دے۔

ضابطۂ اخلاق

ان اسٹنگ آپریشنوں نے بہت سے سوالات کھڑے کر دیئے ہیں اور یہ پوچھا جانے لگا ہے کہ اپنی شناحت چھپا کر اور خفیہ کیمرہ لے کر نکل پڑنا اور لوگوں کو پھنسا کر بے نقاب کرنا کہاں تک جائز ہے۔اس سلسلے میں شعبہ جرنلزم ماس میڈیا مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شافع قدوائی کہتے ہیں:

> ''صحافیوں کو اپنے ضابطہ اخلاق کی پاسداری کرنے کی تلقین کرنے والے شاید پریس کونسل کے مقررہ ضابطہ اخلاق سے پوری طرح واقف نہیں ہیں ورنہ شاید یہ مطالبہ نہیں کرتے۔کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے کیا ناروا طرز عمل اختیار کیا جا سکتا ہے، یہ ایک ایسا اخلاقی سوال ہے جس پر زمانہ قدیم سے بحث ہو رہی ہے۔ ماہرین نشریات ،نفسیات اور ابلاغ عامہ کی اکثریت کا خیال ہے کہ عوام کے وسیع تر مفاد کے پیش نظر اگر غیر اخلاقی وسائل بھی استعمال کیے جائیں تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں کہ کبھی کبھی غیر اخلاقی طرز عمل سے بھی اخلاقی اقدار کی

بازیافت کی جاسکتی ہے''۔

وہ آگے کہتے ہیں کہ ممبران پارلیمنٹ کو جس اسٹنگ آپریشن سے گزارا گیا ہے، اس کا تعلق تفتیشی صحافت سے ہے۔ تفتیشی صحافت اصلاً عوامی خدمت کی صحافت (پبلک سروس جرنلزم) ہے یعنی صحافی اعلیٰ سطح پر موجود بدعنوانی کو بے نقاب کرنے کے لیے ایک ماہر سراغرساں کی طرح کام کرتا ہے اور عوام کو غلط کاریوں سے واقف کرا کر متعلقہ سربرآوردہ شخص کو مستعفی ہونے پر مجبور کرتا ہے۔ پریس کونسل نے صحافت کے آداب معین کرتے ہوئے کہا ہے کہ تفتیشی صحافت لازماً تین اجزاء پر مشتمل ہونی چاہئے۔

(1) تفتیشی صحافت کی پوری کارروائی صحافی کو سرانجام دینا چاہئے اور وہ کسی اور کی تفتیش یا اس کی کارروائی کی محض رپورٹنگ نہ کرے۔

(2) تفتیشی صحافت کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا گیا ہو اس میں عوام کو گہری دلچسپی ہو۔

(3) تفتیشی صحافت کو اس صورت میں بروئے عمل لانا چاہئے جب عوام سے سچ کو پوشیدہ رکھنے کی شعوری کوشش کی جارہی ہو۔

مندرجہ بالا نکات سے واضح ہوتا ہے کہ تفتیشی صحافی خود پورے واقعہ کی گہرائی سے چھان بین کرے اور واقعات کی تصدیق کرے اور سنی سنائی باتوں یا کسی دوسرے کے جمع کردہ شواہد پر انحصار نہ کرے۔ تفتیشی صحافی عجلت سے بالکل کام نہ لے اور واقعات کی تصدیق کئی اور ذرائع سے بھی کرے۔ تفتیش کے نتائج کو ممکنہ معروضیت اور غیر جانبداری کے ساتھ پیش کیا جائے اور ملزم کو بھی صفائی کا پورا موقع دیا جائے۔ تفتیشی صحافی کا رول ایک جج کی طرح ہونا چاہئے یعنی ہر شخص کو اس وقت تک بے گناہ سمجھنا چاہئے جب تک اس پر الزام حتمی طور پر ثابت نہ ہو جائے۔ پریس کونسل کے مطابق تفتیشی رپورٹ بالکل یکطرفہ نہیں ہونی چاہئے اور پیش کش کا انداز ولہجہ نرم، معتدل اور غیر جارحانہ ہونا چاہئے۔ سنسنی خیزی سے عملاً اجتناب کرنا چاہئے۔

پریس کونسل کے ضابطہ اخلاق کی مختصر وضاحت سے ظاہر ہوتا ہے کہ انڈیا ٹی وی، کوبرا پوسٹ

ڈاٹ کام اور اسٹار نیوز نے آپریشن دریودھن اور چکرویوہ کے ذریعہ جن حقائق کو پیش کیا وہ بڑی حد تک صحافتی ضابطہ اخلاق کے تحت آتے ہیں۔ صحافیوں نے پوری ذمہ داری کے ساتھ رپورٹنگ کی اور کئی ہفتوں کی محنت کے بعد جب خود ممبران پارلیمنٹ غیر قانونی طور پر رقم لینے کے لیے تیار ہو گئے تو پھر خفیہ کیمرے سے اس کارروائی کی ریکارڈنگ کی گئی۔ ممبران پارلیمنٹ سے متعلق ہر بات عوام جاننا چاہتے ہیں، لہٰذا ان کی سرگرمیوں کو مرکز توجہ بنانا بالکل حق بجانب تھا۔

اسٹنگ آپریشن ہر چند کہ صحافتی ضابطۂ اخلاق سے کسی نوع کے انحراف کو خاطر نشان نہیں کرتا مگر ٹی وی چینلوں نے پیش کش کی سطح پر ضرور سنسنی خیزی کو اپنی توجہ کا اولین مرکز بنایا۔ ٹی وی پر رپورٹ جس طرح پیش کی گئی اس میں ہندوستان کے سب سے مقتدر ادارہ پارلیمنٹ میں بدعنوانی پر افسوس کے بجائے اس سے لطف اندوز ہونے یا عوام کو ایک چٹپٹی اسٹوری سے واقف کرانے کو بنیادی اہمیت حاصل تھی۔ اسٹوری پیش کرنے والے ون ڈے کرکٹ میچ کی طرح کمنٹری کر رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک روزہ کرکٹ میچ کی سنسنی خیزی اور اس سے وابستہ تفریح ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔

لیکن بزرگ صحافی محفوظ الرحمٰن گناہ کی ترغیب دے کر گناہگار کو پھانسنے کے عمل کی مخالفت کرتے ہیں اور اسے غیر اخلاقی طریقہ بتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں:

''بدعنوان لوگوں کو بے نقاب کرنے اور اس طرح سماج کی خدمت کرنے کے بلند آہنگ دعوے دراصل ہاتھی کے دکھانے کے دانت ہیں جو کھانے والے دانتوں سے بالکل الگ ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کرپشن کے دلدل میں پھنسے ہمارے سماج میں چھوٹے سے لے کر بڑے اسٹنگ آپریشنوں کا ایک خاص رول دکھائی دیتا ہے اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ کرپشن کی لعنت اس سطح تک پہنچ چکی ہے کہ جال بچھا کر خفیہ کیمروں کے استعمال کے ذریعہ ہی قصورواروں کو بے نقاب کیا جا سکتا ہے، لیکن اس معاملے میں نہ تو قانونی و اخلاقی قدروں کو نظر انداز کیا جانا چاہئے، نہ ہر کہہ ومہہ کو یہ آزادی دی جانی چاہئے کہ وہ اپنے طور پر جو چاہے کرے۔ یہ بے قید آزادی بجائے خود کرپشن کی لعنت میں اضافہ اور مفادات حاصلہ کی تقویت کا سبب بن سکتی ہے۔ کون نہیں جانتا کہ اس

ملک میں ہمہ قسم کی بدعنوانی کے پس پشت عام طور پر بڑے کاروباری، سیاستداں اور افسر شاہی پر مشتمل وہ تکون ہی ہوا کرتا ہے، جو بوجوہ اتنا طاقتور بن چکا ہے کہ اسے آسانی سے لگام دینا اگر ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور بن گیا ہے۔اور اگر باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو اسٹنگ آپریشنوں کے پس پشت بالواسطہ یا براہ راست اس تکون کی کارفرمائی کا مشاہدہ بہر حال کیا جاسکتا ہے۔اسٹنگ آپریشنوں کے حوالہ سے اس سوال کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ کیا ہمہ قسم کی ترغیب وتحریص کا حربہ استعمال کر کے اپنے بچھائے ہوئے جال میں کسی کو پھنسالینا اخلاقی اور قانونی دونوں ہی اعتبار سے درست ہوسکتا ہے؟ کیا آپ کسی ایسے شخص کو مجرم یا ملزم قرار دے سکتے ہیں جو آپ کی حوصلہ افزائی اور ترغیب وتحریص کے بغیر متعلقہ جرم کا ارتکاب نہ کرتا؟ ترغیب وتحریص اور اپنے بچھائے ہوئے جال میں تقریباً زبردستی کھینچ لانے کی مثالیں ہر اسٹنگ آپریشن میں ملتی ہیں۔شکتی کپور اور امن ورما کے معاملے کو ہی لے لیجئے۔ان کے پیچھے ان دولڑکیوں کو لگادیا گیا جن کا انداز خود سپردگی چھپائے نہیں چھپ رہا تھا۔نوجوان خوبصورت سجی سنوری کوئی لڑکی اگر پکے آم کی طرح کسی کی جھولی میں گر پڑنے کے لیے بیتاب ہو اور اس کے قدم بہک جاتے ہوں، وہ دعوت گناہ کو ٹھکرا دینے اور اپنے آپ کو کنٹرول کرسکنے کی پوزیشن میں نہ رہ جاتا ہو تو کیا سارا قصور اسی کے سر منڈھ دیا جائے گا؟ گناہ کی ترغیب دینا کیا بجائے خود گناہ نہیں ہے؟شکتی کپور اور امن ورما کا تعلق جس دنیا سے ہے اس میں عام طور پر عصمت وعفت کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی ہے، تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ ان دونوں نے بذات خود کسی لڑکی کو نہ تو دریافت کیا تھا نہ اس سے رابطہ قائم کیا تھا۔انھیں دریافت اور نشان زد اس چینل نے کیا تھا جس نے اسٹنگ آپریشن ترتیب دیا تھا، جس نے انھیں پھنسانے کے لیے جال بُنا تھا اور اپنی ''وِش کنیاؤں'' کو ہدایت دی تھی کہ جس طرح بھی ممکن ہو اپنے شکار کو ڈس لیں۔اب وشوامتر جیسے لوگ کہاں ملیں گے جن کی تپسیا کو بھنگ کرنے کے لیے مینکا نے جتنے بھی روپ بہروپ بھرے، جتنے بھی حربے استعمال کیے، ناکامی ان کا مقدر بن گئی۔ترغیب گناہ، کسی کو رجھانا، لبھانا اور جنسی عمل پر آمادہ کرنا اخلاقی اعتبار سے تو غلط اور قابل مذمت ہے ہی، قانون بھی عام حالات میں غالباً اس کی اجازت نہیں دیتا۔ایک عام عورت اگر اس طرح

کی حرکت کرتی دیکھی جاتی ہے تو اس کا چالان کر دیا جاتا ہے، لیکن نہ جانے کیوں ٹی وی چینلوں کی مینکاؤں تک قانون کے لمبے ہاتھ پہنچنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ترغیب کے علاوہ تحریص کا عمل بھی اخلاقی اور غالباً قانون کی نگاہ میں بھی ناپسندیدہ ہی قرار پائے گا۔ آپ ایک شخص کو پیسے کا لالچ دیتے ہیں، اس سے کچھ مراعات حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جب وہ آپ کے جال میں پھنس جاتا ہے تو خفیہ کیمرے سے تصویریں اتار کر اسے مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کرتے ہیں۔ رشوت لے کر سوال پوچھنے اور ممبران پارلیمنٹ کے لیے مخصوص علاقائی ترقیاتی فنڈ کے حوالہ سے سودے بازی کے سلسلے میں جن لوگوں کو مجرموں کے کٹہرے میں لا کھڑا کیا گیا ان سب کے ساتھ یہی تو ہوا کہ پہلے انھیں نشان زد کیا گیا، پھر ان کے گرد جال بچھایا گیا، ان کے تعلق سے ترغیب وتحریص کے تمام حربے استعمال کیے گئے اور جب وہ بشری کمزوری کے تحت جال میں پھنس گئے تو انھیں گردن زنی قرار دیدیا گیا۔ جن صحافیوں نے اس مہم میں حصہ لیا انھوں نے بے تکان جھوٹ بولے، اپنی شناخت چھپائی، اپنے شکاروں کو رشوت دی، انھیں جی بھر کر دھوکہ دیا۔ کیا اس عمل کو صحافتی اخلاقیات سے ادنیٰ درجے میں بھی ہم آہنگ کیا جاسکتا ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اسٹنگ آپریشنوں کی صحافت نے تمام اعلیٰ صحافتی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اہل صحافت کو چاہئے کہ وہ صحافتی اخلاقیات کی ایک نئی کتاب مرتب کریں جس کے صفحہ اول پر جلی حروف میں لکھا جائے کہ دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا، روپ بہروپ بھرنا اور عورت کو بطور چارہ استعمال کرنا، کسی بھی اعتبار سے نہ تو غلط ہے، نہ ناپسندیدہ۔ کسی بھی ''اعلیٰ'' مقصد کے حصول کے لیے کوئی بھی ذریعہ استعمال کیا جاسکتا ہے، خواہ وہ قانون واخلاق کی نظر میں انتہائی ناپسندیدہ کیوں نہ ہو۔ اور اس کے نتیجے میں انسانیت خاک بہ سر پابرہنہ کونوں کھدروں میں سر چھپاتی کیوں نہ پھرے''۔

ایسا نہیں ہے کہ میڈیا کو کچھ بھی کرنے کی آزادی ہے۔ اس پر بھی پابندیاں ہیں اور اس کے لئے بھی ضابطہ اخلاق مقرر ہے لیکن سوال یہ ہے کہ میڈیا والے اس ضابطہ اخلاق پر عمل کرتے ہیں یا نہیں اور اگر کرتے ہیں تو کتنا کرتے ہیں۔ تقریباً تمام آزاد اور جمہوری ممالک میں میڈیا والوں کے لئے ضابطہ اخلاق مقرر کیا گیا ہے اور بیشتر ملکوں نے اس سلسلے میں امریکی ضابطہ اخلاق کو بنیاد بنایا ہے۔

ہندوستان میں پریس کونسل آف انڈیا اور آل انڈیا نیوز پیپر ایڈیٹرس کانفرنس نے میڈیا کے لئے قواعد وضوابط طے کئے ہیں۔ان کے مطابق صحافیوں کو اپنا پیشہ ایک مقدس پیشہ سمجھنا چاہئے اور اس کی تقدیس سے کھیلنا نہیں چاہئے۔ایک صحافی کو بنیادی انسانی حقوق اور قانون کے تئیں جواب دہی کا بھی پاس و لحاظ رکھنا چاہئے۔ انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ اس کو ایسی رپورٹوں اور تبصروں سے پرہیز کرنا چاہئے جن کے دامن ملک میں بدامنی اور منافرانہ کشیدگی پھیلانے کے امکانات سے پُر ہوں۔ فرقہ وارانہ طور پر حساس خبروں کے سلسلے میں اس کو زیادہ ہوشیار رہنا چاہئے۔ فسادات کی کوریج کے وقت فسادیوں کے نام، مذہب اور ذات برادری کی شناخت کو پوشیدہ رکھنا چاہئے۔صحافی ایسی خبروں سے بھی پرہیز کریں جن سے ملکی سالمیت وقومی ہم آہنگی کو خطرہ پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ علاحدگی پسندی کو ہوا دینے والے مواد سے بھی بچنا چاہئے۔ رپورٹنگ کے وقت یہ ضرور ذہن میں رہے کہ غلط بات کی تشہیر نہ ہو، بلکہ صرف انہی خبروں کو پیش کیا جائے جو صداقت پر مبنی ہوں افواہ بازی پر نہیں۔اگر غلطی سے ایسی خبر شائع یا نشر کر دی گئی ہے جو بعد میں جھوٹی ثابت ہو تو اخبار یا نیوز چینل کو اس پر فراخ دلی کے ساتھ معذرت کرنی چاہئے۔(لیکن عموماً ہوتا یہ ہے کہ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا والے بھی معذرت تو نہیں کرتے ،البتہ یہ شیخی ضرور بگھارتے ہیں کہ ہماری رپورٹنگ کا یہ اثر ہوا اور وہ اثر ہوا۔) صحافی کو چاہئے کہ وہ دوسروں کے اعتماد کا لحاظ رکھے اور آف دی ریکارڈ کہی گئی باتوں کو آن دی ریکارڈ نہ لائے۔ پیشہ ورانہ معاملات میں ذاتی مفادات کو ترجیح نہ دے اور پیسے لے کر یعنی رشوت کھا کر صحافت نہ کرے۔

ان باتوں کی خلاف ورزی کرنے والے صحافیوں کے خلاف کارروائی کرنے کی بھی دفعات موجود ہیں جن میں ایک دفعہ ہتک عزت کے تعلق سے بھی ہے۔ بہت سے لوگ میڈیا کے ہاتھوں ہتک عزت کے شکار بننے کے بعد اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتے ہیں۔لیکن اس ملک کا قانون ایسا ہے کہ ایسے معاملات میں یا تو بہت جلد فیصلے نہیں ہو پاتے یا ہوتے ہیں تو سزا اتنی ہلکی پھلکی ہوتی ہے کہ اس سے نہ تو غلط قسم کے صحافیوں کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے اور نہ مظلوم کو اتنی رقم مل پاتی ہے کہ اس کی رسوائی کا تھوڑا بہت ازالہ ہو سکے۔

الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا تقابلی جائزہ

جب الیکٹرانک میڈیا کا دور شروع ہوا اور بالخصوص یکے بعد دیگرے نیوز چینلوں کی بھرمار ہونے لگی تو بڑے اندیشے پیدا ہو گئے تھے اور یہ کہا جانے لگا تھا کہ پرنٹ میڈیا کا دور اب ختم ہونے والا ہے اور الیکٹرانک میڈیا کی بڑی مچھلی پرنٹ میڈیا کی چھوٹی مچھلی کو کھا جائے گی، لیکن یہ اندیشہ اندیشہ ہائے دور دراز ثابت ہوا اور الیکٹرانک میڈیا پرنٹ میڈیا کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکا، بلکہ اس کے برعکس اگر گہرائی سے جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ نیوز چینلوں کی آمد کے بعد پرنٹ میڈیا میں اپنی بقا کے تحفظ کا ایک نیا احساس پیدا ہوا اور اس احساس نے پرنٹ میڈیا میں کئی ابعاد جوڑ دئے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ نیشنل ریڈر شپ سروے کے مطابق نیوز چینلوں کا انقلاب آنے کے بعد پرنٹ میڈیا میں دس فیصد کا اضافہ ہوا۔

اب سے تقریباً دس سال پہلے جب سرکردہ نیوز چینل آج تک چوبیس گھنٹے کا ہوا تھا، پرنٹ میڈیا کو لاحق اندیشہ نے اس سے وابستہ صحافیوں کی نیند اڑا دی تھی اور پرنٹ میڈیا سے الیکٹرانک میڈیا کی جانب صحافیوں کے چھلانگ لگانے کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور بے شمار پرنٹ جرنلسٹ الیکٹرانک جرنلسٹ بن گئے۔ اس کے بعد اور بھی کئی چینل آئے مگر اب یہ بھاگ دوڑ تھم سی گئی ہے اور اس سلسلے میں ایک استحکام آ گیا ہے۔ انہی دنوں یعنی اب سے کوئی تین چار سال قبل ایک نیشنل ریڈر شپ سروے کیا گیا تھا جس کے نتائج پرنٹ میڈیا کے لئے انتہائی حوصلہ افزا تھے۔ اس سروے میں بتایا گیا تھا کہ دو سال قبل کل روزنامہ اخبارات کے روزانہ قارئین کی تعداد جہاں تیرہ کروڑ دس لاکھ تھی وہیں وہ دو سال کے اندر پندرہ کروڑ ساٹھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ رپورٹ کا یہ بھی کہنا ہے کہ ابھی تقریباً چوبیس کروڑ اسّی لاکھ خواندہ قارئین ہیں جو اخبار نہیں پڑھ پاتے، ان تک

اخبار نہیں پہنچ پاتا، یعنی ان کے پاس قوت خرید نہیں ہے۔ سروے نے کئی حقائق کا انکشاف کیا۔ مثال کے طور پر پرنٹ میڈیا کے قارئین کا ۴۰ فیصد طبقہ دیہی علاقوں سے تعلق رکھتا ہے، اب لوگ ٹی وی کم دیکھتے ہیں اور یہ بھی واضح ہوا ہے کہ عورتیں بڑی تعداد میں اخبار پڑھتی ہیں، اتنے ٹی وی چینلوں اور انٹرنیٹ کی موجودگی میں بھی آج اخبار کا عام قاری روزانہ تقریباً اٹھارہ منٹ اخبار پڑھتا ہے۔ تاہم رسالوں اور جریدوں کی تعداد میں کمی آئی ہے اور ان کے قارئین کم ہوئے ہیں۔ جریدوں کے قارئین کی تعداد جو ۱۹۹۹ء میں ۹ کروڑ ۴۸ لاکھ رہی ہے، سروے کے وقت گھٹ کر ۸ کروڑ ۶۲ لاکھ تک ہی رہ گئی ہے۔ یہ گراوٹ ۲۲ فیصد ہے۔ دراصل اس کی سب بڑی وجہ یہ ہے کہ روزنامہ اخبارات میں نئے نئے تجربات کئے جا رہے ہیں اور اخباروں کی شکل وصورت تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ وہ کھلے بازار کے مقابلے میں آ گئے ہیں۔ صرف خبر تک ان کا دائرہ محدود نہیں رہ گیا ہے، بلکہ اور بھی بہت سی چیزیں اس میں در آئی ہیں۔ چھوٹے قصبوں کے اخبارات میں مقامی رنگ زیادہ ہوتا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اب تو بعض بڑے اخباروں میں بھی ''مقامیت'' نظر آنے لگی ہے۔ بعض روزنامہ اخبارات دو دو چار چار صفحات کے مقامی ضمیمے بھی نکالتے ہے۔ ان اخباروں میں وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو پہلے صرف میگزینوں میں پڑھنے کو ملتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ تحقیقاتی رپورٹیں جو پہلے صرف جریدوں میں نظر آتی تھیں، اب روزناموں میں بھی خوب دکھائی دیتی ہیں۔ ان اسباب نے میگزین کے قارئین کا دائرہ محدود کر دیا ہے۔ گویا بڑے اخبارات ہفت روزہ اخباروں کے بدل بنتے جا رہے ہیں۔

آیئے اب الیکٹرانک میڈیا کے تناظر میں پرنٹ میڈیا کا جائزہ لیں۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں اور پرنٹ میڈیا میں جس اضافے کی بات ابھی کی گئی ہے اس میں الیکٹرانک میڈیا کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ دراصل الیکٹرانک میڈیا نے خبر کو نئی شکل وصورت عطا کی ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اب کوئی بھی فرد خبر بن سکتا ہے یا خبر بنا سکتا ہے۔ پہلے جس عام آدمی پر توجہ نہیں دی جاتی تھی اب وہ بھی خبر کے وسیع امکانات اپنے دامن میں رکھ سکتا ہے۔ لیکن نیوز چینلوں کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ کچھ خبروں کو بہت اختصار کے ساتھ پیش

کرتے ہیں اور بعض خبروں کو غیر ضروری طور پر انتہائی تفصیل کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ اخبارات کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے اور ان میں شائع خبر اگلے روز یکسر باسی ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ پر نئی خبر آ جاتی ہے، اگلے روز وہ بھی باسی ہو جاتی ہے اور وہ اپنی جگہ دوسری خبروں کے لئے خالی کر دیتی ہے۔ اگر غور کیا جائے تو جہاں اخبارات کی خبروں کی زندگی چوبیس گھنٹے کی ہوتی ہے وہیں نیوز چینلوں کی خبروں کی زندگی لمحاتی ہوتی ہے۔ وہ چند سیکنڈ یا چند منٹ کے لئے ٹی وی اسکرین پر آتی ہیں اور پھر غائب ہو جاتی ہیں۔ جن خبروں کو نیوز چینل بہت اختصار سے دکھاتے ہیں، عام لوگ ان کی تفصیل جاننے کو بے چین رہتے ہیں۔ تفصیلی خبر حاصل کرنے کی عام آدمی کی پیاس کو اخبارات ہی بجھاتے ہیں۔ وہ اگلے روز اجمال کی تفصیل پیش کر کے ناظرین اور قارئین کے ذوقِ جستجو اور اشتیاق نظر کو آسودہ کر دیتے ہیں۔ نیوز چینلوں میں عام طور پر ریاستی راجدھانیوں یا بڑے شہروں کی ہی خبریں زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ گلی کوچوں کی خبروں پر اس وقت تک توجہ نہیں دیتے جب تک کہ ان میں ملک گیر سطح پر اشتیاق اور ہنگامہ پیدا کر دینے یا ان کے تنازعہ بن جانے کے امکانات نہ ہوں۔ جبکہ اخبارات گلی کوچوں کی ان چھوٹی چھوٹی خبروں کو بھی شائع کرتے ہیں جن سے عام آدمی وابستہ ہوتا ہے اور جن میں گرچہ قومی بحث کا موضوع بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے پھر بھی وہ عام آدمی کی سوچ کے قریب ہوتی ہیں۔ نیوز چینل خبریں دے دیتے ہیں اور رپورٹیں پیش کر دیتے ہیں لیکن عموماً ان کا فالو اپ نہیں کرتے۔ ان خبروں میں وہ کہانی پن نہیں ہوتا جو عام آدمی کے ذوق قصہ خوانی کی تسکین کر سکے۔ اس ذوق کی تسکین اخبارات سے ہی ہوتی ہے۔ اخبارات خبروں کا فالو اپ کرتے ہیں اور دوسرے تیسرے روز تک یہ بتاتے ہیں کہ جس خبر نے اتنا ہنگامہ برپا کیا تھا یا جس نے ایک تنازعہ پیدا کر دیا تھا، اس کا اب کیا بنا۔ الیکٹرانک میڈیا کی خبروں میں ادبی چاشنی نہیں ہوتی۔ یہ چاشنی اخبارات ہی میں مل سکتی ہے۔ الیکٹرانک میڈیا چوبیس گھنٹے میں دس پندرہ بڑی خبریں ہی دیتا ہے اور انہی کو بار بار دوہراتا رہتا ہے جس کے سبب ان کے تعلق سے دلچسپی کے بجائے اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ اخبارات میں بڑی خبروں کے ساتھ ساتھ چھوٹی خبریں بھی ہوتی ہیں اور بڑی خبروں کی تعداد

نیوز چینلوں کی بڑی خبروں سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ہاں اب کچھ نیوز چینلوں نے اس سمت میں بھی توجہ دی ہے اور انھوں نے مختلف عنوانات کے ساتھ چھوٹی خبریں بھی دینی شروع کر دی ہیں۔ گویا روزنامہ اخبارات کے ''مختصرات'' یا ''بریفس'' کی نقالی کی جانے لگی ہے۔ تاہم ان میں وہ بات نہیں ہوتی جو اخبارات کی چھوٹی خبروں میں ہوتی ہے۔ نیوز چینل ہر گھنٹے پر چند سرخیاں بھی دکھاتے ہیں، مگر ہوتا یہ ہے کہ تقریباً پورے دن وہی سرخیاں گھوم پھر کر آتی ہیں۔ البتہ نیچے کی جانب ایک پٹی سی چلتی نظر آتی ہے جس میں تازہ سرخیاں کبھی کبھی دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

نیوز چینلوں میں ہر آٹھ منٹ کے بعد بریک آجاتا ہے جس سے خبروں کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے۔ جبکہ اخبارات میں ایسا کوئی بریک نہیں ہوتا۔ حالانکہ اخباروں میں بھی اشتہارات ہوتے ہیں اور خوب ہوتے ہیں، کئی کئی صفحات پر مشتمل ہوتے ہیں اور بعض اوقات اشتہاروں کے ضمیمے تک شائع ہوتے ہیں، لیکن ان سے خبروں کا تسلسل نہیں ٹوٹتا اور اخبار کا قاری ان کو پڑھنے کے لئے مجبور بھی نہیں ہوتا۔ جبکہ ٹی وی کا ناظر مجبور ہے اشتہارات کو دیکھنے کے لئے خواہ وہ اسے پسند ہوں یا نہ ہوں اور ان کا رنگ ڈھنگ کیسا ہی کیوں نہ ہو۔ گویا اشتہار دہندگان ٹی وی میں زیادہ طاقتور نظر آتے ہیں نسبتاً اخبارات کے۔ یعنی ٹی وی پر بازار پوری طرح حاوی ہے اور عام آدمی کے مزاج کو کنٹرول کر رہا ہے۔ اشتہاروں کی بات چلی ہے تو یہ بھی بتاتے چلیں کہ گرچہ ٹی وی کے اشتہاروں میں زیادہ قوت ہے لیکن ٹی وی پر وہ اشتہارات نہیں آسکتے جو ہندوستان ٹائمز یا ٹائمز آف انڈیا میں کئی صفحات پر مشتمل میٹری مونیل اشتہارات کی شکل میں ہوتے ہیں۔

نیوز چینلوں میں بعض اوقات پورے دن بلکہ چوبیس گھنٹے ایک ہی خبر چلتی رہتی ہے اور یہ تقریباً تمام چینلوں پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر گیارہ ستمبر کا واقعہ، پارلیمنٹ پر دہشت گردانہ حملہ، یا پچھلے دنوں ممبئی میں زبردست بارش، گوڑگاؤں میں پولس اور مزدوروں کا ٹکراؤ اور ایک بچے کا ۶۰ فٹ گہرے گڈھے میں گر جانا وغیرہ۔ جب کبھی ایسی کوئی بڑی خبر آتی ہے تو لگتا ہے کہ اب ملک میں کوئی دوسری خبر ہے ہی نہیں۔ یہاں تک کہ بہت اچھی اور اہم خبریں بھی معدوم ہو جاتی ہیں یا ان بڑی خبروں کے نیچے دب جاتی ہیں۔ جبکہ اخبارات میں وہ بڑی خبریں تو ہوتی ہی

ہیں دیگر خبروں سے بھی ہم واقف ہو جاتے ہیں۔ البتہ ٹی وی سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اس سے استفادہ کرنے والے کا خواندہ ہونا ضروری نہیں ہے۔ اخبارات میں ضمیمے شائع ہوتے ہیں جو مختلف النوع چیزوں سے بھرے ہوتے ہیں، ان کی اہمیت کا اندازہ اس سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی بڑی شخصیات ان ضمیموں میں بھی نظر آتی ہیں اور ان کے کالم شائع ہوتے ہیں۔ پرنٹ میڈیا کی ان خصوصیات کی نقالی کرنے کی کوشش الیکٹرانک میڈیا کر رہا ہے۔ صحت، آٹو موبائل ،کار اور اس قسم کے دیگر پروگرام اس کی مثال کے طور پر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ اخبارات کا ایک فائدہ یہ ہے کہ قارئین کا ایک بڑا طبقہ ان کا مطالعہ صبح کو باتھ روم میں کرتا ہے۔ البتہ باتھ روم میں ٹی وی نہیں ہوتا۔ بسوں میں بیٹھ کر یا کاروں میں سفر کرتے وقت بھی نیوز چینل نہیں دیکھے جاسکتے، جبکہ بہت سے لوگ وہاں بھی اخبارات پڑھتے ہیں۔

الیکٹرانک میڈیا میں خبروں اور رپورٹوں کی پیشکش کا انداز تھوڑے بہت فرق کے ساتھ تقریباً یکساں ہوتا ہے جبکہ اخبارات میں ایسا نہیں ہوتا۔ اخبارات میں ایکسکلوسیو رپورٹوں کی تعداد بھی قدرے زیادہ ہوتی ہے، البتہ نیوز چینلوں کی جرائم رپورٹیں کافی بہتر ہوتی ہیں اور ان کے نمائندے چھوٹے شہروں، قصبوں اور دیہاتوں سے بھی جرائم کی تحقیقاتی رپورٹیں پیش کرتے ہیں اور کچھ رپورٹیں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ زیادہ تر رپورٹیں ان کے جنسی پہلو کو سامنے رکھ کر بنائی جاتی ہیں اور اس پہلو کو مختلف طریقوں سے اس طرح ابھارنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اصل موضوع ثانوی بن کر رہ جاتا ہے۔ ممبران پارلیمنٹ اور ممبران اسمبلی اخبارات میں چھپی کسی خبر کی آڑ میں اپنے مخالفین کو زیادہ شدت سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔ وہ کسی اسکینڈل کی اشاعت پر پارلیمنٹ و اسمبلیوں میں اخبارات لہرا لہرا کر آواز اٹھاتے ہیں، لیکن نیوز چینلوں میں آئے اسکینڈل کے تعلق سے وہ ایسا نہیں کر سکتے۔ ہاں اخبارات میں چھپی خبر کو سیاستداں یا کوئی بھی آسانی کے ساتھ جھٹلا سکتا ہے اس کی تردید کرسکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ اس کے بیان کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے جبکہ الیکٹرانک میڈیا پر یہ الزام اتنی آسانی سے نہیں لگایا جاسکتا، پھر بھی ہمارے بعض سیاستداں اتنے گھاگھ ہیں کہ وہ الیکٹرانک میڈیا پر بھی یہ الزام جڑ دیتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ پکی روشنائی میں چھپی ہوئی چیز دیرپا ہوتی ہے، لیکن اس کے باوجود اخبارات کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی زندگی ایک دن کی ہوتی ہے اور ان میں شائع خبریں اگلے روز باسی ہو جاتی ہیں۔ یہ بات بہت حد تک سچ ہونے کے باوجود مکمل طور پر سچ نہیں ہے۔ رپورٹوں کا فالواپ اس نظریے کی تردید کرنے کے لئے کافی ہے لیکن اگر اس بات کو مکمل سچ مان لیا جائے تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نیوز چینلوں کی خبروں کی زندگی چند سکنڈ یا چند منٹ کی ہوتی ہے۔ ادھر ان کو نشر کیا گیا ادھر وہ ہوا اور فضا میں تحلیل ہو گئیں۔ تاہم الیکٹرانک میڈیا کی ایسی بہت سی خبریں ہیں جو کئی دنوں تک ذہن پر کچوکے لگاتی رہتی ہیں۔ مجموعی طور پر الیکٹرانک میڈیا پرنٹ میڈیا کا دشمن نہیں ہے اور میں پھر یہ بات دوہراؤں گا کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ بعض اوقات اخبارات میں چھپی خبروں کے پیچھے نیوز چینلوں کے رپورٹر بھاگتے ہیں اور بعض اوقات نیوز چینلوں کی خبروں کا پیچھا پرنٹ میڈیا کے رپورٹر کرتے ہیں۔ گویا دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ اخبارات میں چینلوں کے اشتہارات آتے ہیں اور چینلوں میں اخبارات کے۔ اس طرح دونوں ایک دوسرے کے بھائی ہوئے دشمن نہیں۔

ایس ایم ایس: ایک انوکھا ذریعۂ ترسیل

میڈیا نے ایک نیا اور انوکھا ذریعہ ترسیل پیدا کر دیا ہے، جس میں بہت سی خوبیاں ہیں اور جو نوجوانوں میں بہت مقبول ہے۔ اس کا نام شارٹ میسیج سروس یعنی ایس ایم ایس ہے۔ یہ موبائیل سے منسلک ذریعہ ترسیل ہے۔ یہ انتہائی خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتا ہے اور بعض اوقات بہت بڑے بڑے کھیل دکھاتا ہے۔ یوں تو اس پر بہت معمولی سا صرفہ آتا ہے، مگر یہ لاکھوں اور کروڑوں روپے کے کاروبار پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسا عوامی میڈیم ہے جو کئی ملکوں میں یکساں مقبول ہے۔ اس کی خاموش زبان جہاں عاشقوں کی زبان بن گئی ہے وہیں یہ غیر رومانی شخصیات کا بھی پسندیدہ میڈیم ہے۔ یہ اپنی سہل انگاری کے سبب تقریباً ہر طبقہ میں مستعمل ہے اور اسی لئے یہ صارفیت کو فروغ دیتا ہے۔ ہندوستان میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ آج تقریباً ہر نیوز چینل اپنے پرائم ٹائم بلیٹن میں اپنے سامعین و ناظرین کو ایس ایم ایس کر کے اپنی رائے دینے کی دعوت دیتا ہے اور سیکنڈوں میں فیصد نکال کر نتائج سب کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ یہ ذریعہ ترسیل و ابلاغ نوجوانوں کو انڈین آئیڈل، فیم گروکل اور ہنسی کا شہنشاہ بنا کر ان کی تقدیر لکھتا ہے تو یہ بھی بتاتا ہے کہ عوام میں کس سیاستداں کی کتنی مقبولیت ہے اور کس موضوع پر عوام کی کیا رائے ہے۔

ایس ایم ایس سے بھی پولنگ ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ جاننے کے لئے ہفتوں یا دنوں تک انتظار نہیں کرنا پڑتا، بلکہ سیکنڈوں کے انتظار کے بعد نتیجہ سامنے آجاتا ہے۔ نہ مہر لگتی ہے نہ بکس کھلتا ہے نہ پرچی گنی جاتی ہے بلکہ موصول ہونے والے ایس ایم ایس کا فیصد نکال لیا جاتا ہے۔ یہ ایک عجلت پسند میڈیم ہے۔ اس میں ہفتوں اور مہینوں غور نہیں کرنا پڑتا۔ ادھر سوال پوچھا گیا اور ادھر

ایس ایم ایس تیار اور لگے ہاتھوں نتیجہ بھی سامنے۔ اس کی عجلت پسندی جہاں اس کا ایک عیب ہے وہیں ایک خوبی بھی ہے۔ عیب اس لئے کہ اس میں سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کی گنجائش نہیں ہوتی اور خوبی اس لئے کہ رائے دہندہ اپنا پہلا ردعمل جو کہ عموماً فطری ہوتا ہے، دے دیتا ہے۔ چونکہ یہ عجلت پسند میڈیم ہے اس لئے غالباً سنجیدہ طبقہ اس کو سنجیدگی سے نہیں لیتا۔ لیکن نوجوان طبقہ اسے سنجیدگی سے لیتا ہے اور اس میں یہ بہت مقبول ہے۔ نیوز چینل والے بھی اس لحاظ سے اسے سنجیدگی سے لیتے ہیں کہ کسی بھی مسئلے پر ان کو فوری جواب مل جاتا ہے۔ میڈیا پر گہری نظر رکھنے والے ایک کالم نگار سدھیش پچوری کا کہنا ہے:

> ''یہ موبائیل ڈیموکریسی ہے اور یہ حرکت پذیر ہے، غیر منجمد ہے۔ اس کے فیصلے کی عمر محض پندرہ سیکنڈ ہے۔ یہ حکومتیں تو نہیں بناتا مگر کسی معمولی بات کو، گانے کو، گویے کو، نیتا کو اچانک پندرہ سیکنڈ کے برانڈ میں بدل کر مارکیٹ کر ڈالتا ہے''۔

ایس ایم ایس کی مدد سے صلاحیتوں کی تلاش بھی ہو رہی ہے۔ اس کی مدد سے گلوکار سامنے آ رہے ہیں، فنکار سامنے آ رہے ہیں اور یہ میڈیم لوگوں کی خفیہ صلاحیتوں کو بڑی آسانی کے ساتھ منظر عام پر لا رہا ہے۔ یہ میڈیم امراء کی جاگیر نہیں ہے بلکہ غریب اور نچلے طبقہ کے لوگ بھی اس سے استفادہ کر رہے ہیں۔ انڈین آئیڈل کا انتخاب ہو یا فیم گروکل کا یا پھر ہنسی کے شہنشاہ کا، ان سب میں ایس ایم ایس نے اپنا کھیل دکھایا ہے اور عوام نے ان لوگوں کا انتخاب کیا ہے جو امراء و روٴسا میں نہیں آتے۔ امراء و روٴسا شائد ایسے پروگراموں میں اپنی رائے دینے کے لئے ایس ایم ایس بھی نہیں کرتے ہوں گے۔ ایس ایم ایس وہ لوگ کرتے ہیں جو درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی لئے عوام نے اس میڈیم کے ذریعے ایسے لوگوں کا انتخاب کیا جو انہی کے بیچ کے تھے۔ یہاں تک کہ انڈین آئیڈل کے پہلے مرحلے میں عوام نے ججوں کے پینل کی رائے کو ایک بار نہیں کئی بار مسترد کیا اور پنجاب سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے نوجوان کو بار بار ووٹ دیا جو گرچہ گلوکاری میں ماہر تو نہیں تھا اور نہ ہی اس کے فن سے پوری طرح انصاف کر پاتا تھا مگر تھا عوام کے

درمیان کا۔ نچلے طبقے کا۔ گھروں اور عمارتوں میں پینٹنگ کرنے والا ایک پینٹر۔ یہ ذریعہ ترسیل و اظہار کسی کا دباؤ قبول نہیں کرتا۔ کسی کی باتوں میں نہیں آتا اور کوئی شخص اس پر اثر انداز نہیں ہوسکتا۔ یہ مکمل طور پر آزاد میڈیم ہے۔ یہ کسی کی مداخلت برداشت نہیں کرتا۔

یہ ایک موثر ذریعہ ترسیل بھی ہے۔ بالخصوص نیوز چینلوں کے ہاتھ میں آکر اس میں اور طاقت پیدا ہوگئی ہے۔ ان چینلوں کی جانب سے کسی مسئلے پر عوام سے ایس ایم ایس کی اپیل کی جاتی ہے اور ایس ایم ایس کی عوامی طاقت کے آگے ہمارا سسٹم جھکنے پر مجبور ہو جاتا ہے اور پولیس کو مخصوص لوگوں کے خلاف کارروائی کرنی پڑتی ہے۔ گویا عوام اس کے ذریعہ اپنی طاقت کا اظہار و استعمال کرتے ہیں اور حکومت و انتظامیہ کو یہ بتاتے ہیں کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ جہاں پولیس محکمہ کسی معاملے میں عوام کی براہ راست مداخلت کو یکسر نظر انداز کر دیتا ہے وہیں وہ عوام کی اس بالواسطہ مداخلت کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ گویا ہمارا نظام ایک ان دیکھی قوت کے آگے جھکنے پر خود کو مجبور پاتا ہے۔ ناانصافی کے خلاف 'ایس ایم ایس ردعمل' اتنا طاقتور ہوتا ہے کہ عدالت تک کو سو موٹو کارروائی کرنی پڑتی ہے اور پولیس کو ہدایت دینی پڑتی ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ 'ایس ایم ایس دباؤ' کے لئے نیوز چینلوں یا اخبارات کا سہارا چاہئے۔ جب تک میڈیا کے یہ طاقتور ستون ایس ایم ایس قوت کی تشہیر نہیں کرتے اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور پھر اگر میڈیا لوگوں سے ایس ایم ایس طلب نہ کرے تو یہ کیسے پتہ چلے گا کہ کس موضوع پر عوام کی کیا رائے ہے اور کس کیس میں عوام کیا سوچتے ہیں۔ لہٰذا اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ایس ایم ایس کی عوامی قوت میڈیا سے وابستہ ہے۔ جب تک الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اس کی طاقت کے اظہار کا ذریعہ بنے رہیں گے اس وقت تک یہ اپنا اثر دکھاتا رہے گا۔ آج جبکہ عوامی طاقت کی اہمیت کم ہوتی جارہی ہے، اس انوکھے میڈیم کی زبردست اہمیت ہے اور اسے نہ صرف برقرار رہنا چاہئے بلکہ مزید طاقتور ہونا چاہئے۔

ایس ایم ایس کی تاریخ:

جی ایس ایم سسٹم اور ٹیلی مواصلات کے ماہرین کا خیال ہے کہ کوئی بھی شخص خود کو ایس ایم ایس کا بانی ہونے کا دعوا نہیں کر سکتا۔ ۱۹۸۰ کے اوائل میں موبائل کمیونی کیشن سروسز کے ذمہ داروں کے ذہن میں ٹیکسٹ کے ذریعہ پیغام رسانی کا خیال آیا اور ۱۹۸۵ میں جی ایس ایم کے ٹیلی سروسز کے ٹیبل پر شارٹ میسیج نمودار ہوا۔ پہلا تجارتی ایس ایم ایس ۳ دسمبر ۱۹۹۲ کو برطانیہ میں ارسال کیا گیا۔ یہ ایس ایم ایس Sema گروپ کے Neil Papworth نے ووڈافون کے Richard Jarvis کو اپنے پرسنل کمپیوٹر سے جی ایس ایم نیٹ ورک پر بھیجا۔ اس کے بعد یہ سلسلہ رفتہ رفتہ آگے بڑھا اور تجارتی ایس ایم ایس کے ساتھ عام ایس ایم ایس بھیجے جانے لگے۔ دھیرے دھیرے اس کو فروغ حاصل ہوتا گیا اور یہ تجارتی اور غیر تجارتی تمام حلقوں میں مقبول ہو گیا۔

ایس ایم ایس کی عالمی مقبولیت:

دنیا بھر میں بڑی سرعت کے ساتھ ایس ایم ایس خدمات کا ارتقا ہوا۔ ۲۰۰۰ میں ۱۷ ارب ایس ایم ایس بھیجے گئے۔ ۲۰۰۱ میں ۲۵۰ ارب ایس ایم ایس ارسال کئے گئے اور ۲۰۰۴ کے وسط تک یہ تعداد بڑھ کر ۵۰۰ ارب تک پہنچ گئی۔ ایس ایم ایس خاص طور پر یوروپ، ایشیا اور آسٹریلیا میں مقبول ہے۔ ایشیا میں جاپان اور کوریا میں اسے مقبولیت نہیں ملی۔ ان دونوں کو چھوڑ کر بقیہ ملکوں میں اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ اس نے ایک نئی زبان ایجاد کر دی ہے۔ چین میں تو یہ بہت مقبول ہے اور وہاں شارٹ میسیج خدمات فراہم کرنے والی کمپنیوں کو اس سے زبردست مالی فائدہ ہو رہا ہے۔ چین میں ۲۰۰۱ میں ۱۸ ارب ایس ایم ایس کئے گئے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے ایس ایم ایس نوجوانوں میں بہت مقبول ہے اور خاص طور پر شہری نوجوانوں میں۔ دیہی علاقوں میں اس کو ابھی وہ اہمیت اور مقبولیت حاصل نہیں ہوئی ہے جو شہروں میں ہے۔ یہ سروس کافی سستی بھی ہے۔ مثال کے طور پر آسٹریلیا میں ایک میسیج کی قیمت صفر اعشاریہ بیس اور ۲۵ آسٹریلیائی ڈالر کے بیچ آتی ہے۔ جبکہ وائس کال پر صفر اعشاریہ چالیس اور دو

آسٹریلیائی ڈالر کے درمیان لاگت آتی ہے۔ ایس ایم ایس کی قیمت انتہائی کم ہونے کے باوجود اس کی کمپنیاں خوب منافع کمارہی ہیں۔ ہندوستان میں بھی یہ کافی سستی سروس ہے۔ بعض کمپنیاں تو ایس ایم ایس کا کوئی چارج نہیں لیتیں۔

جنوب مشرقی ایشیا میں تسلسل کے ساتھ ایس ایم ایس کئے جاتے ہیں۔ سنگاپور میں سیکڑوں ایس ایم ایس ماہانہ مفت کئے جاسکتے ہیں۔ بعد میں جو قیمت وصول کی جاتی ہے وہ سنگاپوری کرنسی میں صفر اعشاریہ صفر پانچ اور صفر سات کے درمیان ہوتی ہے۔

ایشیا کے بعد یوروپ میں ایس ایم ایس زیادہ مقبول ہے۔ ۲۰۰۳ میں وہاں ۱۶ ارب پیغامات ماہانہ ارسال کئے گئے۔ جبکہ اسپین میں اس سے کچھ زیادہ پیغامات بھیجے گئے۔ اٹلی، جرمنی اور برطانیہ میں فی موبائیل یہ تعداد محض ۳۵۔۴۰ ایس ایم ایس ماہانہ رہی ہے۔ ان ملکوں میں ایس ایم ایس بھیجنے کی قیمت صفر اعشاریہ صفر تین اور صفر اعشاریہ اٹھارہ پونڈ کے درمیان آتی ہے۔ اس کا انحصار ادائیگی کے طریقہ کار پر ہوتا ہے۔ فرانس میں بھی ایس ایم ایس کو زیادہ مقبولیت حاصل نہیں ہے۔ وہاں ایک موبائیل سے مہینے میں زیادہ سے زیادہ بیس ایس ایم ایس کئے جاتے ہیں۔ ایس ایم ایس سے ووٹنگ بھی کی جاتی ہے۔ ایس ایم ایس ووٹنگ پہلے امریکہ اور یوروپ میں شروع ہوئی، بلکہ یہ کہنا شائدزیادہ مناسب ہوگا کہ ایس ایم ایس ووٹنگ کی ایجاد امریکہ ہی میں ہوئی ہے۔ ٹیلی ویژن پروگرام امریکن آئیڈل سے ایس ایم ایس ووٹنگ کا آغاز ہوا۔ (اس کی نقالی میں انڈین آئیڈل پروگرام بنایا گیا۔) یوروپ میں ۲۰۰۲ میں یوروپین گلوکاری مقابلہ ہوا، اور ۲۰۰۲ میں پہلے پان یوروپین ایس ایم ایس ووٹنگ کا اہتمام کیا گیا۔ اس پروگرام میں کلاسیکل فون سے بھی ووٹ ڈالے گئے۔ ۲۰۰۵ میں اب تک کا سب سے بڑا گلوکاری مقابلہ یوروو زن کے نام سے منعقد کیا گیا۔ اس میں بھی ایس ایم ایس اور فون لائن سے ووٹنگ کی گئی۔ اس کے بعد مختلف ملکوں میں ایس ایم ایس ووٹنگ کو ایک نئی جہت ملی۔ مثال کے طور پر فن لینڈ میں بعض ٹی وی چینلوں نے ایس ایم ایس Chat کا آغاز کیا، جس میں ایک فون

نمبر پر مختصر پیغامات بھیجے گئے اور تھوڑی دیر میں ان کو ٹی وی کے اسکرین پر دکھایا گیا۔ ہندوستان میں بھی ایسا ہونے لگا ہے۔ یہ طریقہ اس قدر مقبول ہوا کہ یہ گیم میں بدل گیا اور پھر ٹیلی ویژن کے اس قسم کے گیم بنائے جانے لگے۔

ایس ایم ایس کی زبان:

ایس ایم ایس کی مقبولیت نے ایک نئی زبان ایجاد کر ڈالی۔ چونکہ اس میں بڑے پیغامات کی گنجائش نہیں ہوتی اس لئے مخفف کا استعمال کیا جانے لگا اور الفاظ کی جگہ پر ہندسے بھی استعمال ہونے لگے۔ الفاظ کو بھی مختصر کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر For کی جگہ پر 4' Your کی جگہ پر You'ur کی جگہ پر u وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح جملوں کو بھی انتہائی مخفف کر دیا گیا ہے۔ دراصل یہ شارٹ ہینڈ کی تبدیل شدہ شکل ہے اور اسے ایس ایم ایس میں خوب استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس کے لکھنے میں بھی آسانی ہے اور لوگ اس زبان کو آسانی سے سمجھ بھی لیتے ہیں۔

ایس ایم ایس کے اثرات:

سماج پر ایس ایم ایس کے بہت دلچسپ اثرات بھی مرتب ہو رہے ہیں اور کچھ لوگ اس کو تفریح کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں۔ جہاں ہندوستان میں نیوز چینلوں کو ایس ایم ایس سے کسی مسئلے پر سنجیدگی کے ساتھ اپنی رائے دی جاتی ہے، وہیں دوسرے ملکوں میں اسے تفریح کا ذریعہ بھی بنا لیا گیا ہے۔ اس تفریح کے نتائج بھی لوگوں کو بھگتنے پڑ رہے ہیں۔ بعض طلبہ اس کی مدد سے امتحانات میں نقل کرتے ہیں اور پکڑے جاتے ہیں۔ دسمبر ۲۰۰۳ میں یونیورسٹی آف میری لینڈ کالج پارک میں ہونے والے فائنل امتحان میں درجنوں طلبہ اپنے سیل فون پر ٹیکسٹ میسیج کے ذریعے نقل کرتے پکڑے گئے۔ اسی سال جاپان میں Hitotsubashi یونیورسٹی میں ۲۶ طلبہ کو امتحان میں اپنے سیل فون پر ای میل کے ذریعے نقل کرنے کی پاداش میں فیل کر دیا گیا۔

دسمبر ۲۰۰۱ میں بلجیم میں ایک فلپائنی کو اس لئے گرفتار کر لیا گیا کہ اس کے ایک دوست نے

اس کو مذاق میں ایک ایس ایم ایس کیا جس میں اس کو انتہائی مطلوب دہشت گرد اسامہ بن لادن بتایا گیا تھا۔۱۴ اگست ۲۰۰۵ کو Helios Airways کی فلائٹ ۵۲۲ کے تباہ ہونے سے متعلق ایس ایم ایس کرنے پر ایک مسافر کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس نے اعتراف کیا کہ اس نے جہاز کی تباہی کی کہانی گھڑی تھی تا کہ اسے مقبولیت حاصل ہو۔ جنوری ۲۰۰۱ میں ایک ایس ایم ایس مہم کے نتیجے میں جوزف استرادہ کو فلپینس کے صدر کے عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا تھا۔ جولائی ۲۰۰۱ میں ملیشیا کی حکومت نے یہ حکم جاری کیا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو سیل فون پر ایس ایم ایس سے طلاق دیتا ہے تو وہ طلاق واقع نہیں ہوگی۔ جبکہ ۲۰۰۴ میں ملیشیا ہی کی ایک عدالت نے فیصلہ سنایا کہ اگر شارٹ میسیج بہت واضح اور غیر مبہم ہو تو ایس ایم ایس کے ذریعے دی گئی طلاق واقع ہو جائے گی۔ ۲۰۰۴ میں میڈرڈ ٹرین دھماکوں کے خلاف احتجاج کے لئے لوگوں کو ایس ایم ایس کئے گئے اور اسے 'ٹیکسٹ میسیج نائٹ' کہا گیا۔

ہندوستان میں بھی ایس ایم ایس کا خوب استعمال ہوتا ہے اور حکومت کے ذرائع کے مطابق جموں و کشمیر اور شمال مشرقی ریاستوں میں سرگرم جنگجو بھی اس سے کافی فائدہ اٹھاتے ہیں۔ وہ اپنے ساتھیوں کو ایس ایم ایس کی مدد سے اپنی حکمت عملی سے واقف کراتے ہیں اور وہ ایس ایم ایس پیغام پر عمل کرتے ہوئے دہشت پسندانہ وارداتیں انجام دیتے ہیں۔ اسی لئے حکومت ایسی ٹیکنالوجی حاصل کرنے کی کوشش کر رہی ہے جو دوسرے ممالک میں دستیاب ہے اور جس کی مدد سے ایس ایم ایس بھیجنے اور وصول کرنے والوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔ وزارت داخلہ نے خفیہ ایجنسیوں کو ہدایت دی ہے کہ اس ٹکنالوجی کے حصول کو یقینی بنائیں۔ ابھی تک صرف ایس ایم ایس بھیجنے والے سیل نمبروں کی نشاندہی ہو رہی ہے' سیل پیغامات کو پڑھنا ابھی ممکن نہیں ہو سکا ہے۔ جن فون کالوں کو ٹیپ کیا جاتا ہے ان سے بھیجے جانے والے پیغامات کو پڑھنا ابھی ناممکن ہے۔ حکومت کے ذرائع کا یہاں تک کہنا ہے کہ جموں و کشمیر اور شمال مشرق میں سرگرم جنگجو پاکستان اور بنگلہ دیش کے sim کارڈ استعمال کرتے ہیں جن کی رسائی ہندوستان کے سرحدی علاقوں تک ہے۔ خفیہ ایجنسیاں ان سیل فون پر نظر رکھ رہی ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ایسے سیل فون سے پیغام رسانی میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ حکومت ایسی ٹکنالوجی حاصل کرنے میں کب تک کامیاب ہو سکے گی یہ تو وقت بتائے گا۔

ریڈیو اور ٹی وی نشریات: آغاز اور ارتقا

عام طور پر ریڈیو کو کسی بھی بات کو پھیلانے، عام کرنے اور لوگوں تک پہنچانے کے مفہوم میں لیا جاتا ہے۔ یعنی اگر کوئی بات زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پھیلانی ہو اور لوگوں کی سماعتوں سے اسے متعارف کرانا ہو تو اسے ریڈیو سے نشر کر دیا جائے۔ ریڈیو نشریات کی ابتداء سب سے پہلے کہاں ہوئی اس پر اختلاف رائے ہے۔ تاہم مجموعی طور پر یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ اس شعبے میں امریکا کو دوسرے ممالک پر برتری حاصل ہے۔ ۱۹۰۶ء میں فسینڈن (Fessenden) نے برنٹ راک ماس کے اپنے نجی تجرباتی اسٹیشن سے کرسمس کی شام کو ایک پروگرام نشر کیا جسے بعض لوگ پہلا ریڈیو پروگرام کہتے ہیں۔

امریکا میں ریڈیو نشریات کا ارتقاء نجی تجارتی بنیادوں پر ہوا اور ابتدا سے ہی اس پر سرکاری کنٹرول نہ ہونے کے برابر تھا، جس کے نتیجے میں ریڈیو نشریات جہاں دوسرے کاروبار کی طرح بازار کے اتار چڑھاؤ کے تابع رہیں وہیں تجارتی مقابلوں اور منافع کے امکانات نے پہلی جنگ عظیم کے فوراً بعد نشریات کی تیز رفتار ترقی کو ممکن بنا دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر جب فوجی پابندیوں میں قدرے کمی آئی تو بہت سے تجرباتی ریڈیو اسٹیشنوں نے کام کرنا شروع کر دیا اور ۱۹۲۰ء تک سامعین کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ریڈیو کے تجارتی امکانات خاصے روشن کر دیے۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء میں مشرقی پٹس برگ میں پہلا باقاعدہ صوتی نشریاتی مرکز (ریڈیو اسٹیشن) قائم کیا گیا، جس نے ۲ر نومبر ۱۹۲۰ء کی شام سے اپنی نشریات کا آغاز کیا۔ اس کے ساتھ ہی نشریاتی دور کا آغاز ہوا۔ اس ریڈیو اسٹیشن کی مقبولیت نے مزید اسٹیشنوں کے قیام کی تحریک پیدا کی۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۹۲۱ء تک امریکا میں ۴۶۴ ریڈیو اسٹیشنوں کو نشریاتی

لائسنس دیے جا چکے تھے۔

۱۹۲۲ء میں صورت حال یہ تھی کہ ریڈیو اسٹیشنوں کی کثرت سے ریڈیو چینل خاصے گنجان ہو چکے تھے اور ان میں مزید گنجائش نکالنی مشکل تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے ایسے تجارتی گروہ بھی موجود تھے جو اپنے پروگرام نشر کرانا چاہتے تھے، لیکن کسی اسٹیشن کے قیام میں سرمایہ لگانے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر امریکن ٹیلی فون اینڈ ٹیلی گراف کمپنی نے اگست ۱۹۲۲ء میں نیویارک میں ڈبلیو۔ ای۔ اے۔ ایف اسٹیشن قائم کیا جو کرایہ پر نشریاتی سہولتیں فراہم کرتا تھا، اسی طرح پرائیویٹ یا Sponsored پروگرام کا آغاز ہوا۔

امریکا کے برعکس برطانیہ میں ابتداء سے ہی نشریات پر برطانوی پوسٹ آفس کا اقتدار قائم رہا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد، دوسرے مغربی ممالک کی طرح، برطانیہ میں بھی نشریات کے تجارتی امکانات ابھرنے شروع ہوئے۔ مارکونی کمپنی نے پہلے آئرلینڈ اور پھر چمس فورڈ میں تجرباتی ریڈیو اسٹیشن قائم کیے۔

اس کے علاوہ متعدد تجارتی کمپنیوں کو تجرباتی نشریات کی اجازت دی گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ یہاں بھی امریکا کی طرح، نشریہ آزاد تجارتی بنیاد پر ترقی کرے گا، لیکن امریکا میں نجی ملکیت والے ریڈیو اسٹیشنوں کی کثرت سے جو انارکی پھیلی تھی اس سے برطانوی حکام باخبر تھے انھوں نے ان کمپنیوں کو ملا کر ایک کمپنی میں ضم کر دینے کا فیصلہ کیا اور اس طرح دسمبر ۱۹۲۲ء میں برٹش براڈ کاسٹنگ کمپنی کا قیام عمل میں آیا۔

زبردست گفت وشنید کے بعد دسمبر ۱۹۲۲ء میں ریڈیو ساز کمپنیاں برٹش براڈ کاسٹنگ کمپنی بنانے پر رضا مند ہوئیں۔ ۱۸؍جنوری ۱۹۲۳ء کو اس کمپنی کو آٹھ نشریاتی اسٹیشن قائم کرنے کی اجازت ملی۔ اس عرصے میں برطانوی نشریات نے زبردست ترقی کی۔ ۱۹۲۴ء کے اواخر تک ریڈیو سیٹ کو جاری کیے جانے والے لائسنسوں کی تعداد دس لاکھ تھی، جو ۱۹۲۶ء تک پندرہ لاکھ سے تجاوز کر گئی۔ ۱۹۲۶ء میں ۹ نشریاتی مراکز اور گیارہ ریلے اسٹیشن کام کر رہے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں لانگ ویو نشریات کے آغاز کے بعد برطانیہ کی ۸۰ فیصد آبادی کو ریڈیو دستیاب ہو گیا۔

اگست ۱۹۲۵ء میں کرافورڈ کمپنی بنائی گئی جس کی سفارش پر جنوری ۱۹۲۷ء میں برٹش براڈ کاسٹنگ

کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا اور تجارتی کمپنی کو ختم کر دیا گیا۔اس طرح برطانیہ میں نشریات کا بنیادی پیٹرن اور مستقبل متعین ہو گیا۔۱۹۵۴ء میں انڈیپنڈ ینٹ ٹیلی ویژن اتھارٹی کے قیام تک برطانیہ میں نشریہ کا کم وبیش یہی پیٹرن رہا اور بی۔بی۔سی کی اجارہ داری قائم رہی۔

۱۹۲۰ء سے۱۹۲۴ء کے دوران دنیا کے متعدد ممالک میں ریڈیو اسٹیشن کھلے۔۱۹۳۰ء تک تقریباً تمام ملکوں میں نشریات کا نظام قائم ہو چکا تھا۔۱۹۲۵ء کے اواخر میں ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد ۶۰۰ تھی جو ۱۹۳۵ء میں ۱۳۰۰ تک پہنچ گئی۔اس وقت دنیا میں پچیس ہزار سے زائد ریڈیو اسٹیشن مصروفِ کار ہیں۔

ہندوستان میں ریڈیو نشریات

فلم کی طرح، ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی اپنی ایجاد کے فوراً بعد ہندوستان پہنچے۔۱۹۲۲ء میں انڈین اسٹیشن اینڈ ایسٹرن ایجنسی لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائرکٹر،ایف۔ای۔روشر نے پہل کی اور حکومت نے اجازت دے دی۔ ریڈیو کلب آف بنگال کے تعاون سے اس نے اپنی نشریات کا آغاز نومبر۱۹۲۳ء میں کیا۔ایسی ہی ایک اور سروس بمبئی ریڈیو کلب کے ایماء پر جون۱۹۲۴ء میں شروع کی گئی۔ان دونوں سروسوں کے لیے ٹرانسمیٹر، مارکونی کمپنی نے عاریتاً فراہم کیا تھا۔اسی زمانے میں کچھ چھوٹے اسٹیشن مدراس،کراچی اور رنگون میں بھی قائم کیے گئے۔

نشریات کے تجربے اس سے قبل بھی ہندوستان میں ہو رہے تھے۔مثلاً ۱۹۲۱ء میں گورنر، سرجارج لائڈ کی درخواست پر ٹائمز آف انڈیا نے بمبئی میں پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف ڈپارٹمنٹ کے تعاون سے موسیقی کا ایک خصوصی پروگرام نشر کیا تھا جسے گورنر نے پونا میں سنا تھا۔

بمبئی اور کلکتہ کی طرح مدراس میں بھی نشریاتی مرکز کے قیام میں مارکونی کمپنی پیش پیش تھی۔۱۶رمئی۱۹۲۴ء کو مدراس میں جس میٹنگ میں مدراس پریسی ڈنسی ریڈیو کلب کا قیام عمل میں آیا اس میں مارکونی کمپنی کا نمائندہ موجود تھا اور اس نے اس میٹنگ سے خطاب بھی کیا تھا۔اس نے کہا تھا کہ ریڈیو نشریات برطانیہ میں بہت منافع بخش ثابت ہوئی ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ

ہندوستان میں کامیاب نہ ہوں۔

اس کلب کی نشریات کا سلسلہ ۱۹۲۷ء تک جاری رہا۔ ۱۹۲۷ء میں مالی دشواریوں کی وجہ سے یہ کلب بند ہو گیا اور اس نے اپنا ٹرانسمیٹر مدراس کارپوریشن کے حوالے کر دیا جس نے یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے با قاعدہ نشریات کا سلسلہ شروع کیا۔ بالآخر ۱۹۳۸ء میں اس کو آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن میں ضم کر دیا گیا۔

۱۹۲۷ء میں ایک پرائیویٹ کمپنی ''انڈین براڈ کاسٹنگ کمپنی'' کو نشریات کی اجازت ملی۔ ۲۳ رجولائی ۱۹۲۷ء کو اس کے بمبئی اسٹیشن کا افتتاح وائسرائے لارڈ ارون نے کیا۔ پانچ ہفتے بعد اس کے کلکتہ اسٹیشن کا افتتاح بنگال کے گورنر اسٹینلے جیکسن نے کیا۔ یہ دونوں اسٹیشن ۱۰۵ کلو واٹ میڈیم ویو پر کام کرتے تھے۔ ۲۷ راگست ۱۹۲۷ کو اسٹیٹسمین نے رنگون سے موصول ہونے والی خبر کے حوالے سے یہ لکھا کہ کلکتہ میں ریڈیو اسٹیشن کے افتتاح کے سلسلے میں ہونے والے سارے پروگرام رنگون میں بخوبی سنے گئے۔

ہندوستان میں ۱۹۲۷ میں لائسنس یافتہ ریڈیو سیٹ ایک ہزار تھے۔ اگلے تین سال میں یہ تعداد سات ہزار کو پہنچ گئی۔ اس آمدنی کے باوجود کمپنی نشریات کے اخراجات کو برداشت نہ کر سکی اور ۱۹۳۰ء میں دو لاکھ روپئے کا خسارہ دے کر بند ہو گئی۔ لیکن اس وقت تک نشریات کا ذوق بہت پھیل چکا تھا۔ چنانچہ عوامی دباؤ میں آ کر حکومت کو اس کی ذمہ داری سنبھالنی پڑی۔ حکومت کے اخراجات پر، کمپنی سے نشریات جاری رکھنے کے لیے کہا گیا۔ انچکیپ کمیٹی نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ ہندوستان میں نشریہ گھاٹے کا سودا ثابت ہوا اس لیے اسے بند کر دینا چاہئے۔ اس رپورٹ کی اشاعت کے بعد احتجاج کا سلسلہ شروع ہو گیا، بالآخر حکومت نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور یکم اپریل ۱۹۳۰ کو اسے اپنے شعبۂ قانون و محنت کے تحت کر دیا۔ دو سال تک یہ سروس تجربے کے طور پر ''انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس'' کے نام سے چلائی گئی پھر اسے مستقل حیثیت دے دی گئی۔ ۱۹۳۳ میں ریڈیو لائسنس کی تعداد ۱۰۸۷۲ تھی۔

۱۹۳۴ سے نشریاتی سروس نے پھیلنا شروع کیا۔ بی۔ بی۔ سی۔ کے لائنل فیلڈن کو پہلا

کنٹرولر آف براڈ کاسٹنگ بنایا گیا اور حکومت نے اس ذریعۂ ترسیل کی ترقی کے لیے بیس لاکھ روپئے منظور کیے۔ دہلی میں بیس کلوواٹ کا ٹرانسمیٹر لگایا گیا، جس نے یکم جنوری ۱۹۳۶ سے کام کرنا شروع کیا۔ اسی سال اس کا نام آل انڈیا ریڈیو پڑا۔ ساتھ ہی ساتھ اردو اور ہندی میں رسالہ آواز کا اجراء ہوا۔ ۱۹۳۹ میں ریڈیو لائسنس کی تعداد ۹۲۷۸۲ تک پہنچ گئی تھی۔

انڈین اسٹیٹ براڈ کاسٹنگ سروس کے افتتاح کے بعد بھی ہندوستان میں نشریہ کو پھیلانے کی متوازی کوششیں جاری رہیں۔ مارکونی کمپنی نے شمال مغربی صوبہ سرحد کے لیے حکومت ہند کو ٹرانسمیٹر اور بڑی تعداد میں کمیونٹی ریڈیو سیٹ عاریتاً دینے کی پیش کش کی۔ یہ نشریہ کو دورافتادہ علاقوں میں لے جانے کی پہلی کوشش تھی۔ اسی سال الہ آباد کے انڈین ایگریکلچرل انسٹی ٹیوٹ نے ''دیہاتی پروگرام'' نشر کرنا شروع کیا اور ایک سال کے بعد دہرہ دون براڈ کاسٹنگ ایسوسی ایشن نے اپنی نشریات کا آغاز کیا مگر دو سال بعد فنڈ کی کمی کی وجہ سے اسے بند ہونا پڑا۔

۱۹۳۶ میں دہلی میں آل انڈیا ریڈیو کے اسٹیشن ڈائرکٹروں کی پہلی کانفرنس ہوئی اسی سال کے آخر میں پہلا شارٹ ویو ٹرانسمیٹر (۱۰ کلوواٹ) دہلی میں نصب کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی پشاور، لاہور، لکھنؤ اور مدراس میں میڈیم ویو کے ٹرانسمیٹر نصب کیے گئے۔

دوسری جنگ عظیم نے ریڈیو نشریات کی اہمیت اور بڑھادی۔ جنگ کی شدت کے ساتھ نشریات میں بھی وسعت ہوتی گئی اور متعدد ہندوستانی زبانوں میں نشریات کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۳۹ میں ''مانیٹرنگ سروس'' شروع ہوئی جو بعد میں آل انڈیا ریڈیو میں ضم ہوگئی۔ ۱۹۴۰ میں جب جرمنی نے متعدد ہندوستانی زبانوں میں اپنی نشریات کا سلسلہ شروع کیا تو بی۔ بی۔ سی۔ کو بھی ہندوستانی زبانوں میں نشریات شروع کرنی پڑی۔ اسی سال اردو کے مایہ ناز ادیب پطرس بخاری آل انڈیا ریڈیو کے ڈائرکٹر جنرل بنائے گئے۔ ۱۹۴۱ میں نشریہ کو شعبۂ اطلاعات و نشریات کے تحت کر دیا گیا۔

آزاد ہندوستان میں ریڈیو نشریات

آزادی کے بعد ہندوستان میں نشریات کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوا۔ تقسیم ہند کے نتیجہ میں ہندوستان کو چھ ریڈیو اسٹیشن اور ٹرانسمیٹر ملے اور پاکستان کو تین۔ ریاستوں کے انضمام کے بعد حیدرآباد، اورنگ آباد، تری وینڈرم، بڑودا اور میسور کے ریڈیو اسٹیشن بھی ہندوستانی نشریاتی نظام کا حصہ بن گئے۔ وزارت اطلاعات ونشریات نے آزادی کے بعد اس طرف خصوصی توجہ دی۔ ۱۹۵۰ تک ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد پچیس ہوگئی جس کی سروس ۱۲ فیصد جغرافیائی علاقہ میں ۲۰ فیصد آبادی کو دستیاب تھی اور ۴۶ میڈیم ویو اور شارٹ ویو ٹرانسمیٹر کام کر رہے تھے۔ ۱۹۶۰ تک آتے آتے یہ سروس ۵۵ فیصد آبادی کو دستیاب ہوگئی۔ یکم اکتوبر ۱۹۷۶ تک ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد ۷۷ ہوگئی جن کی سروس ۶۹ فیصد جغرافیائی خطے پر محیط تھی۔ ۱۹۴۷ میں ریڈیو لائسنس کی تعداد ۲ لاکھ ۷۶ ہزار تھی جو دسمبر ۱۹۷۵ میں ایک کروڑ اڑسٹھ لاکھ تک پہنچ گئی۔ غیر لائسنس یافتہ ریڈیو سیٹ کی تعداد اس کے علاوہ تھی۔

ایف ایم ریڈیو

ایف ایم (Frequency Modulation) ریڈیو کی آمد اور اس کے ارتقا نے ریڈیو کے شعبے کو زبردست ترقی دی ہے۔ ایف ایم نشریات کا آغاز ۱۹۷۷ میں مدراس سے ہوا مگر ۲۱ ویں صدی میں اس نے ایک طویل جست لگائی ہے اور آج بے شمار ایف ایم اسٹیشن قائم ہو گئے ہیں۔ حکومت نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی ہے اور اس کے ذریعہ سیکڑوں ایف ایم ریڈیو اسٹیشنوں کے لائسنس جاری کرنے کے اعلان سے اس صنعت کو زبردست فروغ حاصل ہو رہا ہے۔ حکومت کے اس اعلان کے دائرے میں ۹۱ شہر آئیں گے۔ ابھی تک ان میں سے بیشتر شہروں کو سرکاری ریڈیو خدمات سے ہی مطمئن ہونا پڑ رہا ہے۔

فکّی کی ۲۰۰۶ میں جاری ایک مطالعاتی رپورٹ کے مطابق حکومت نے اس شعبے میں غیر ملکی سرمایہ کاروں کو بھی سرمایہ لگانے کی اجازت دے دی ہے۔ اور اس نے اس سیکٹر میں ۲۰ فیصد

براہ راست غیر ملکی سرمایہ کاری کی بھی اجازت دی ہے۔

ایف ایم کو آج بہت زیادہ مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔ اس کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ یہ عوام سے براہ راست رابطہ قائم کرتا ہے۔ ان کو اپنے قریب لاتا ہے اور خود ان کے قریب پہنچتا ہے۔ اس کی نشریات کے لیے کوئی بندھا ٹکا اصول نہیں ہے بلکہ اس کے پروگرام پیش کرنے والوں کو خاصی آزادی حاصل ہے جس کے سبب وہ سامعین کے بالکل قریب پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے جذبات سے خود کو ہم آہنگ کر لیتے ہیں۔ ان کے پروگراموں میں جتنا تنوع ہے اتنا سرکاری ریڈیو کے پروگراموں میں نہیں ہے۔

مثال کے طور پر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ریڈیو جامعہ ایف ایم۔ 90.4 نے نہ صرف طلبا کو اپنے حلقے میں شامل کر لیا ہے بلکہ اس علاقہ کی جھگیوں میں رہنے والے لوگوں کو بھی خود سے جوڑ لیا ہے۔ ان لوگوں نے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں سوچی ہوگی کہ ایک روز وہ خود ریڈیو پر بولیں گے، اس پر اپنی آواز سنیں گے اور دوسروں کو سنائیں گے، مگر اب خواب کی ان باتوں کو ریڈیو جامعہ ایف ایم نے حقیقت کا روپ دے دیا ہے۔

ریڈیو جامعہ ایم ایف 90.4 مقامی لوگوں کی تفریحی ضرورتوں کی تکمیل کرنے والا پہلا ادارہ بن کر ابھرا ہے۔ جامعہ ریڈیو کے اسٹیشن ماسٹر کا کہنا ہے کہ ان کی کوشش ہے کہ پروگراموں کو پیش کرنے میں ممکنہ حد تک مقامی اشتراک سے کام لیا جائے۔

انھوں نے کہا ''ہم لوگوں کو نہ صرف اپنے اسٹوڈیو میں بلاتے ہیں بلکہ اسٹوڈیو ان تک لے کر بھی جاتے ہیں۔ طلبہ جھگی جھونپڑی والے علاقے میں جاتے ہیں اور تخلیقی ذہانت رکھنے والوں کو تلاش کرتے ہیں اور انھیں برسر موقع صدا بندی کے علاوہ ریڈیو پروگرام میں شامل کرتے ہیں''۔ جھگی میں رہنے والے ایک شخص نے کہا ''ہماری تو خوشی کی انتہا نہیں تھی جب طلبہ کی ایک ٹیم ہمارے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہم جامعہ ریڈیو کے لیے پروگرام ریکارڈ کرنے آئے ہیں۔ ہم سے گانے، بات کرنے یا پھر موسیقی کے کسی آلے سے کھیلنے کی گزارش کی گئی اور ہم بہت محظوظ ہوئے''۔

جامعہ کے اردگرد چائے خانوں اور ڈھابوں میں ریڈیو جامعہ سنا جا سکتا ہے جس میں انھی کی

آوازیں ہوتی ہیں جنھیں اکثر وہاں کے لوگ اپنے قریب سے گزرتے دیکھتے ہیں۔ جامعہ ماس کمیونی کیشن اینڈ ریسرچ سینٹر کے ڈائرکٹر افتخار احمد کہتے ہیں کہ ریڈیو کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ ہم کس حد تک مقامی لوگوں سے مربوط ہوسکتے ہیں اور کس حد تک ہمارے پروگرام ان کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔

فکّی کی رپورٹ کے مطابق ہندوستان کی ریڈیو صنعت آئندہ کچھ برسوں تک ۳۲ فیصد کی شرح سے ترقی کرتی رہے گی۔ اور ۲۰۱۰ تک اس صنعت کا ریونیو ۲۷ کروڑ ڈالر یعنی تقریباً بارہ ارب روپئے تک پہنچ جائے گا۔ یہ مطالعہ فکّی اور مشورہ دینے والی ایک کمپنی پرائس واٹر ہاؤس کوپرس نے مشترکہ طور پر کیا ہے۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سردست ہندوستانی ریڈیو صنعت کو تین ارب روپئے کا ریونیو ہورہا ہے۔

میڈیا میں اشتہاروں کی بھرمار ہوتی ہے اور اگر اشتہارات نہ ملیں تو ریڈیو اور ٹی وی چینلوں کا چلنا مشکل ہو جائے۔ مگر اندرون ملک اشتہارات پر جتنا خرچ کیا جاتا ہے اس کا محض دو فیصد حصہ ہی سردست ریڈیو صنعت کو حاصل ہورہا ہے، البتہ آئندہ اس میں اضافہ کی توقع کی جاسکتی ہے۔ رپورٹ کا کہنا ہے کہ آئندہ پانچ سے دس برسوں میں اشتہاروں کی صنعت میں ریڈیو صنعت کی حصہ داری میں اضافہ ہوگا۔ اس مطالعاتی رپورٹ کے مطابق آئندہ چند برسوں میں اندرون ملک ریڈیو اسٹیشنوں کی تعداد تین سو سے زائد ہو جائے گی۔

رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ۲۰۱۰ تک مجموعی اشتہارات کا پانچ فیصد حصہ ریڈیو صنعت کو حاصل ہوگا تو پھر اس صنعت کی شرح ترقی کم از کم ۳۲ فیصد تک بنی رہے گی۔ تفریح اور میڈیا صنعت میں ریڈیو خدمات کو تسلیم کرنے کا رجحان تیزی سے بڑھتا جارہا ہے اور آج ریڈیو صنعت میں سرمایہ کاری کو پہلے کے مقابلے زیادہ محفوظ سمجھا جارہا ہے اور غیر ملکی میڈیا تنظیمیں ہندوستانی ریڈیو صنعت میں داخل ہونے کی تاک میں ہیں۔ اس صنعت کو اس وقت نمایاں ترقی حاصل ہوئی جب بی بی سی ورلڈ وائڈ نے مڈڈے ملٹی میڈیا کے ایک یونٹ مڈڈے ویسٹ کا بیس فیصد شیئر خرید لیا۔ اس سے دوسری کمپنیوں کو بھی سرمایہ کاری کرنے کا حوصلہ ملا اور اگر

غیر ملکی سرمایہ کاروں نے اس شعبے میں سرگرمی دکھائی تو اس کی ترقی میں مزید اضافہ کے امکانات ہیں۔

ٹیلی ویژن کی ابتداء اور ارتقاء:

لفظ ٹیلی ویژن دو الفاظ کا مرکب ہے۔ ٹیلی (Tele) اور ویژن (Vision) ٹیلی ایک یونانی (Greeek) لفظ ہے جس کے معنی ہیں بہت دور سے اور ویژن لاطینی (Latin) لفظ ہے جو To see سے بنا ہے، اور جس کے معنی دیکھنا یا دکھائی دینا ہے۔ مجموعی طور پر اس کے معنی ہوئے بہت دور کی چیز کو دیکھ لینا۔

ٹیلی ویژن کا بنیادی نظریہ ۱۸۳۹ء میں اس وقت وجود میں آ گیا تھا جب فرانس کے ماہر طبعیات الیگزینڈر ایڈ منڈ بی کوئیرل (Alexandre Edmond Becqurel) نے برق کیمیاوی (Electrochemical) اثرات کی جانکاری حاصل کی۔ لیکن ۱۸۸۴ء میں یہ نظریہ حقیقت میں بدل گیا، جب جرمن سائنسداں پال جی۔ نپکون (Paul G. Nipkon) نے اسکیننگ ڈسک کے ذریعے تصویر کو نشر کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ ۱۹۳۴ء میں مارکونی کمپنی نے ٹی وی۔ کیمرہ ایجاد کیا ۱۹۳۴ اور ۱۹۳۶ء کے دوران برطانیہ میں اس بات پر کافی مباحثہ چلتا رہا کہ عوامی ٹیلی ویژن نشریات کے لیے کون سا طریقہ زیادہ موزوں ہے۔ برڈ کا یا مارکونی کا۔ ۱۹۳۷ء میں برطانیہ کے پوسٹ ماسٹر جنرل نے اعلان کیا کہ مارکونی ہی کا طریقہ عوامی ترسیل کے لیے زیادہ مناسب ہے۔

برطانوی ٹی وی کے لیے ۱۹۳۶ء ایک یادگار سال ہے کیونکہ اسی سال بی بی سی نے دنیا کی پہلی باقاعدہ ٹی وی سروس کا آغاز کیا۔ اسی سال مئی کے مہینے میں بی بی سی نے ایک تاج پوشی کی رسم کو کامیابی سے ٹیلی کاسٹ کیا۔ لیکن یکا یک یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کو بی بی سی ٹیلی ویژن سروس بند کر دی گئی جو جون ۱۹۴۶ء تک بند رہی۔ برطانیہ کے علاوہ دوسرے مغربی ممالک میں بھی اس سمت میں تحقیق و جستجو جاری تھی۔ فرانس، روس اور جرمنی بھی کسی سے پیچھے نہیں تھے مگر بنیادی طور پر اس کے دو مراکز

تھے یعنی برطانیہ اور امریکہ۔

امریکہ میں بھی نپکو ن کے اسکیننگ ڈسک کے طریقہ میں برابر تجربے اور ترقی ہو رہی تھی۔ ۱۹۲۰ء آتے آتے تصویر کافی صاف ہوگئی تھی لیکن اس میں بھر پور کامیابی اس وقت ملی جب مکمل برقی ٹیلی ویژن ایجاد ہوا۔ امریکہ میں یہ سہرا دو لوگوں کے سر بندھا، جس میں سے ایک کا نام تھا Vladimr K.Zorykin یہ روسی نژاد تھا۔ دوسرے کا نام Philofransworth تھا۔ یہ امریکی تھا۔

اس دوران .R. C. A (ایک نشریاتی کمپنی) اپنے طور پر ٹیلی ویژن نشریات کے تجربے کر رہی تھی۔ اس نے نیویارک میں ۱۹۳۰ میں ایک ٹیلی ویژن اسٹیشن W.2.XBS بھی شروع کیا۔ کمپنی نے ۱۹۳۱ء میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر ایک نشریاتی ٹاور نصب کیا۔ امریکہ میں ۱۹۳۵ء میں ٹیلی ویژن نشریات کا دائرۂ عمل صرف ایک میل تھا۔ ۱۹۳۷ء میں امپائر اسٹیٹ بلڈنگ پر لگایا گیا اینٹینا عوام کے استعمال کے لیے کھول دیا گیا اور N.B.C و.R.C.A کمپنیاں ٹیلی ویژن کو عوام میں لے آئیں۔ انہوں نے نیویارک اسٹریٹ پر ایک انتظام کیا کہ ادھر سے گزرنے والے رک کر اس نئی ایجاد کی کرامات کو دیکھ سکیں اس پر ایک ڈراما سوسان اینڈ گاڈ Susan and God پیش کیا گیا۔

امریکہ میں ۱۹۳۹ء میں پہلی بار ورلڈ فیئر میں ٹیلی ویژن سیٹ فروخت کے لیے رکھے گئے تھے۔ یعنی ٹیلی ویژن عوام میں آیا۔ اس سال اس کا دائرۂ عمل بڑھ کر ۱۶۰ میل ہوگیا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۵۰ء کے دوران امریکہ میں ٹیلی ویژن کے سلسلے میں اہم ترقیاں ہوئیں، ان میں سے ایک رنگین ٹیلی کاسٹ کی ابتدا بھی ہے۔

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی ابتدا اور ارتقاء:

ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی ابتداء پندرہ ستمبر ۱۹۵۹ء کو یونیسکو (.U.N.E.S.C.O) کے ایک پائلٹ پروجیکٹ سے ہوئی۔ اس پروجیکٹ کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ یہاں کے پسماندہ طبقے

کی تعلیم وترقی میں ٹیلی ویژن کس حد تک مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ لہٰذا دہلی کے آس پاس بیس منتخبہ بستیوں میں بیس ٹیلی ویژن سیٹ لگائے گئے۔ ہر سیٹ پر قریب قریب ایک سو پچاس سے دو سو افراد تک پروگرام دیکھتے تھے۔ اسے ٹیلی کلب کا نام دیا گیا۔ اس کے لیے یونیسکو نے بیس ہزار ڈالر کی مدد بھی دی تھی۔ اس کے پروگرام ساٹھ منٹ کے ہوتے تھے جنہیں ہفتے میں دو بار پیش کیا جاتا تھا۔ یہ پروگرام تعلیمی، معلوماتی اور تفریحی نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھ کر تیار کیے جاتے تھے۔ اس پروجیکٹ کا اصل تجرباتی پروگرام ۲۳ ستمبر ۱۹۶۰ء سے پیش ہونا شروع ہوا جو ۶ مئی ۱۹۶۱ء تک چلتا رہا۔ پھر ایک خود کفیل ایجنسی نے اس کے اثرات کا جائزہ لیا، جسے مجموعی طور پر مثبت پایا گیا۔

اس پروجیکٹ کی ہمت افزا رپورٹ کی وجہ سے ۱۹۶۱ء میں آل انڈیا ریڈیو (اس وقت ٹی وی اسی کے ماتحت تھا) نے فورڈ فاؤنڈیشن کی مدد سے ایک اور پروجیکٹ اسکول ٹیلی ویژن کے نام سے شروع کیا۔ اس کے لیے دہلی اور نواح دہلی کے چھ سو اسکولوں کو چنا گیا۔ انہیں ٹیلی ویژن سیٹ فراہم کرائے گئے۔ ہر منگل کو دوپہر بعد ایک گھنٹے کا نصاب سے متعلق تعلیمی پروگرام طلباء کو دکھایا جاتا۔ گو کہ ان نصابی پروگراموں کی اہمیت اور مقبولیت دوسرے پروگراموں کی چمک دمک میں ماندسی پڑ گئی مگر نہ صرف یہ کہ ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں یہ پروگرام اولیت کا درجہ رکھتے ہیں بلکہ ٹیلی ویژن سے متعارف کرانے اور اسے مقبول بنانے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ اب تجربات کی کامیابی کی وجہ سے یہاں باقاعدہ ٹیلی ویژن سروس شروع کرنے کے منصوبے کو تقویت ملی۔ چنانچہ ۱۵ اگست ۱۹۶۵ء کو روزانہ ٹیلی ویژن سروس شروع ہوگئی جس کے لیے دہلی میں پانچ سو واٹ کا ٹرانسمیٹر نصب کیا گیا جس کی پہنچ ۲۵ کیلو میٹر تھی۔ وگیان بھون میں اس کا باقاعدہ افتتاح ہندوستان کے پہلے صدر جناب راجیند ر پرشاد نے کیا۔

ابتدا میں اس ٹیلی ویژن سروس کے تحت روزانہ ایک گھنٹے کے پروگرام پیش کیے جاتے تھے۔ عام ناظرین کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان میں مختلف قسم کی چیزیں جیسے خبریں، کمنٹری، موسیقی اور رقص ہوتیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اسپیشل آڈینس یعنی بچے، نوجوانوں اور عورتوں کے لیے مخصوص پروگرام پیش کیے جاتے۔

ٹیلی ویژن کو ہندوستانی سماج کے لیے مفید بنانے کے بنیادی نظریے کے تحت ۱۹۶۷ء میں زراعتی پروگرام کرشی درشن شروع کیا گیا۔ دیہی علاقوں میں ٹیلی ویژن کلب قائم کر کے کمیونٹی سیٹ لگائے گئے تا کہ ان پروگراموں کا فائدہ وہاں کے لوگوں تک پہنچ سکے۔

۱۹۷۲ء میں ممبئی کا ٹیلی ویژن سینٹر ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ یہ سینٹر ہندوستان میں پیشہ ورانہ مہارت کا حامل پہلا سینٹر ہے۔ اس کے لیے ساری مشینیں اور آلات جرمنی نے ہندوستان کو تحفے میں دیں۔ ابتداء میں اس کے پروگرام روزانہ ڈیڑھ گھنٹے کے ہوتے تھے مگر جلد ہی اس کے پروگراموں کو زیادہ دلچسپ بنا کر اوقات میں اضافہ کر دیا گیا۔

۱۹۷۵ء میں ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں وہ اہم موڑ آیا جس نے اس ذریعہ ترسیل کی مقبولیت کو زمین سے اٹھا کر آسمانوں کی بلندی تک پہنچا دیا اور یہ تھا سیٹلائٹ کے استعمال کی ابتدا۔

امریکہ کے ٹیلی ویژن سیٹلائٹ کی مدد سے ۱۹۷۵ء میں .S.I.T.E پروگرام شروع ہوا۔ .S.I.T.E مخفف ہے Satellite Instructional Television Experiment کا۔ یہ ایک ایسا تجرباتی پروگرام تھا جس میں سیٹلائٹ کے ذریعے ان علاقوں میں ٹیلی ویژن پروگراموں کو پہنچانا مقصود تھا جہاں وہ زمینی اسٹیشنوں کے ذریعے نہیں پہنچ پاتے۔ یہ ہندوستان میں سیٹلائٹ کے ذریعے ٹیلی ویژن پروگرام ٹیلی کاسٹ کرنے کا ابتدائی تجربہ تھا۔

۱۹۷۶ء میں ٹیلی ویژن نشریات کو مزید ترقی دینے کی غرض سے اس کا الگ ڈائریکٹوریٹ قائم کیا گیا۔ ابھی تک یہ آل انڈیا ریڈیو کے ساتھ منسلک تھا اور دونوں شعبے ایک ہی ڈائریکٹوریٹ کے تحت کام کرتے تھے۔ ٹیلی ویژن کی تاریخ میں ۱۹۷۶ء اس لیے بھی یاد رکھا جائے گا کہ اس سال ہندوستانی ٹیلی ویژن کو مالی منفعت کے لیے استعمال کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔ لہٰذا شروع میں تجارتی اشتہارات کو ٹیلی کاسٹ کرنے کی ابتداء نو سینٹروں سے ہوئی جن میں دہلی، بنگلور، ممبئی، لکھنؤ، حیدرآباد، جالندھر، کلکتہ، مدراس اور سری نگر شامل تھے۔ ۱۵/ اگست ۱۹۸۲ء کا دن بھی ہندوستانی ٹیلی ویژن کی تاریخ میں بہت اہمیت کا حامل ہے کیونکہ اس دن دور درشن نے رنگین ٹی وی نشریات کی ابتداء کی۔ چنانچہ اس دن

۱۵ اگست کی تقریبات کو لال قلعہ سے براہ راست رنگین نشر کیا گیا۔ اسی سال نومبر میں دور درشن نے نویں ایشیائی کھیلوں کو جو ہندوستان میں منعقد ہو رہے تھے، براہ راست رنگین نشر کیا۔ اس سے پہلے تک براہ راست ٹیلی کاسٹ کا انتظام نہیں کے برابر تھا اور تمام چیزیں ریکارڈ کر کے ہی نشر کی جاتی تھیں۔ ۱۹۸۴ء دوردرشن کا سلور جبلی سال تھا۔ اس سال ہر روز ایک ٹیلی ویژن ٹرانسمیٹر نصب کرنے کا منصوبہ یکم جولائی ۱۹۸۴ء سے چار ماہ تک چلتا رہا، اس منصوبے کے تحت کیے جانے والے ٹرانسمیٹر وں کی مجموعی تعداد ۱۷۲ بتائی جاتی ہے جس سے دور درشن نشریات ہندوستان کی باون فی صد آبادی تک پہنچنے لگیں۔

آج ہندوستانی ٹیلی ویژ ن ''پرسار بھارتی'' کا ایک حصہ ہے۔ پرسار بھارتی ایک ہندوستانی خود اختیاری (Autonomous) براڈ کاسٹنگ کارپوریشن ہے۔ ''پرسار بھارتی ایکٹ آف ۱۹۹۰'' ۱۵ ستمبر ۱۹۹۷ء سے لاگو کیا گیا۔ پرسار بھارتی بورڈ نے آل انڈیا ریڈیو اور دور درشن کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ۲۳ نومبر ۱۹۹۷ء سے سنبھالی۔ پرسار بھارتی کے استحکام سے پہلے دور درشن منسٹری آف انفارمیشن اینڈ براڈ کاسٹنگ کے تحت کام کرتا تھا۔ اس کا ایک ڈائرکٹر جنرل ہوتا تھا جس کے ماتحت کئی ڈپٹی ڈائرکٹر جنرل ہوتے تھے جو الگ الگ شعبوں کے انتظامات کی ذمہ داری نبھاتے تھے۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے ہندوستان میں ٹیلی ویژن کی ابتداء ۱۹۵۹ء میں ہوئی، اس کے پروگرام سب سے پہلے دلّی سے شروع ہوئے، پھر دوسرا شہر بمبئی تھا، جہاں سے ۱۹۷۲ء میں پروگرام ٹیلی کاسٹ ہونا شروع ہوئے۔ ساتویں دہائی کے وسط تک ملک میں صرف سات ٹیلی ویژن سینٹر تھے۔ ٹیلی ویژن کا محکمہ ۱۹۷۶ء میں ریڈیو سے الگ ہوا اور دور درشن کا الگ وجود قائم ہوا۔ ملک گیر (National) پروگرام ۱۹۸۲ء میں شروع ہوئے۔ اس کے بعد سے ٹیلی ویژن کی ترقی کی رفتار تیز ہو گئی خصوصاً پچھلی صدی کی آخری دہائی میں اس نے روز افزوں ترقی کی اور نہ صرف یہ کہ ٹرانسمیٹر وں کی تعداد میں اضافہ ہوا بلکہ ٹرانسمیٹر وں کی طاقت میں اضافہ کر کے ان کی پہنچ کے دائرے کو کافی وسیع کر دیا گیا۔ جدید سہولیات سے لیس نئے اسٹوڈیو قائم کیے گئے۔ پرانے

اسٹوڈیو کی جدید کاری ہوئی، نئے چینل قائم ہوئے۔ پروگراموں کے وقت میں توسیع ہوئی۔ سیٹلا ئٹ سے رابطہ قائم کرنے اور ٹیلی کاسٹ کرنے کے لیے جدید تکنیک اپنائی گئی۔ پروگرام کے موضوع مواد اور پیش کش کا معیار بلند ہوا۔

ڈی۔ڈی۔1 نیشنل پروگرام ۱۵/اگست ۱۹۸۲ء سے شروع ہوئے۔ڈی۔ڈی۔2 میٹرو بطور ایک تفریحی چینل کے ۱۹۹۳ء میں اس وقت وجود میں آیا جب دہلی، کلکتہ، ممبئی اور مدراس کے چار زیادہ توانائی والے ٹرانسمیٹر ایک سیٹلا ئٹ کے ذریعے منسلک کر دیئے گئے۔ میٹرو چینل کا بنیادی مقصد شہری آبادی کو تفریحی مواد فراہم کرانا ہے۔ کچھ ہی دنوں کے اندر یہ ارضی (Terresterial) طریقے ۵۶ شہروں تک اپنے پروگرام پہنچانے لگا۔اب اس کے پروگراموں کو ارضی اور سیٹلا ئٹ دونوں طریقوں سے ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے اب اس کی ٹیلی کاسٹ کو اٹھارہ گھنٹوں سے بڑھا کر چوبیس گھنٹے روزانہ کر دیا گیا ہے۔

۱۴/مارچ ۱۹۹۵ء کو دوردرشن نے اپنا عالمی چینل A.S.I.A.3. A.T-1 سیٹلا ئٹ کے ذریعے شروع کیا۔ ابتداء میں یہ ہفتے میں پانچ روز صرف تین گھنٹے روزانہ ٹیلی کاسٹ کرتا تھا۔ ۱۹۹۶ء میں جب دوردرشن نے P.A.S-4 سے ایک ٹرانسپونڈر حاصل کرلیا تو یہ ٹیلی کاسٹ روزانہ چار گھنٹے ہوگئی۔اس کی مزید توسیع اٹھارہ گھنٹے روزانہ نومبر ۱۹۹۶ء میں ہوئی۔مزید یہ کہ انٹرنیشنل چینل نے چوبیس گھنٹے کی سروس ۲۷/دسمبر ۱۹۹۹ء سے شروع کر دی ہے جس میں ہر روز آٹھ گھنٹے کے نئے پروگرام ہوتے ہیں جنھیں دوبارہ ٹیلی کاسٹ کیا جاتا ہے۔

۱۵/اگست ۱۹۹۹ء کو دوردرشن نے ایک نیا چوبیس گھنٹے کا سیٹلا ئٹ چینل ڈی۔ڈی۔ نیوز کے نام سے شروع کیا جو روزانہ تیرہ بولیٹن مع شہ سرخیوں کے ٹیلی کاسٹ کرتا ہے۔

اب ۱۵/اگت ۲۰۰۶ء سے دوردرشن کا اردو چینل شروع کیا گیا ہے جو سردست سات گھنٹے کے پروگرام پیش کرتا ہے۔اعلان کے مطابق اس کو جلد ہی چوبیس گھنٹے کا کر دیا جائے گا۔

(ابلاغیات ''پروفیسر شاہد حسین'' سے ماخوذ اور روزنامہ اخبارات سے استفادہ)

(۴)

اردو منظر نامہ

الیکٹرانک میڈیا اور اُردو

ہندوستان میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو زبان میں بہت گہرا ربط ہے، دونوں میں بڑی گہری شناسائی ہے اور دونوں ایک دوسرے کو آگے بڑھنے اور پروان چڑھنے میں مدد کرتے ہیں۔ بالخصوص اردو زبان کے الیکٹرانک میڈیا پر بہت احسانات ہیں۔اردو زبان شروع سے ہی اسے سنوارتی اور نکھارتی رہی ہے۔اسے اس زبان کا مرہون منت اور احسان مند ہونا چاہئے کہ اس نے میڈیا کے حسن میں چار چاند لگانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔اگر ہم باریک بینی سے غور کریں تو پائیں گے کہ جب بھی الیکٹرانک میڈیا کی دوشیزہ کا حسن مرجھانے لگا ہے تو اس نے اپنے چہرے پر اردو کا غازہ ملا ہے۔اپنی پیشانی پر اردو کا ٹیکہ آویزاں کیا ہے، اپنے ہونٹوں پر اس کی سرخی سجائی ہے، زلفوں میں اس زبان کا گجرا باندھا ہے، بازوؤں پر اس کے بازو بند اور کنگن چڑھائے ہیں، انگلیوں میں اس کی انگشتری پہنی ہے اور اپنے سراپا کو اردو کے خوبصورت اور حسین لباس میں لپیٹ کر لوگوں کو اپنے حسن کا دیوانہ بنایا ہے۔

کچھ لوگ کہتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا نے اردو کو سہارا دیا ہے اور اس کے فروغ میں اہم رول ادا کیا ہے، مگر میں کہتا ہوں کہ اردو کو کسی سہارے کی ضرورت نہیں اس نے خود دوسروں کو سہارا دیا ہے اور جب بھی الیکٹرانک میڈیا کو ضرورت پڑی ہے، اردو نے اس کی رگوں میں اپنا خون دوڑایا ہے اور اس کے چہرے کے زرد ہوتے رنگ کو حسن کی تمازت میں تبدیل کیا ہے۔ ہاں ایک حد تک آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ میڈیا نے اردو زبان کے الفاظ کو اپنا کر جہاں ایک طرف خود کو زندگی کی حرارت دی ہے وہیں دوسری طرف اس نے اس زبان کے حسن سے لوگوں کو آشنا کیا ہے۔ جہاں فلم، ریڈیو، ٹی وی، اور دیگر ذرائع ترسیل نے اردو کے حسین الفاظ اور اس کے اسلوب کا سہارا لے کر دور دراز تک

رسائی حاصل کی ہے وہیں ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس نے ان خطوں اور علاقوں میں بھی اردو کے الفاظ کو رائج کیا ہے جو اردو کے علاقے نہیں ہیں۔ تاہم (البتہ اس میں چینلوں کا زیادہ رول نہیں ہے) میں یہ یکطرفہ دعوا تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوں کہ الیکٹرانک میڈیا سے اردو کا فروغ زیادہ ہوا ہے اور اردو سے الیکٹرانک میڈیا کا فروغ نہیں ہوا ہے یا کم ہوا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الیکٹرانک میڈیا سے اردو کو جتنا فروغ حاصل ہوا ہے، الیکٹرانک میڈیا کو اردو سے اس سے کہیں زیادہ فروغ حاصل ہوا ہے۔ ہندوستان میں ریڈیو نشریات کا باقاعدہ اور باضابطہ آغاز ۱۹۳۰ء میں ہوا اور ٹی وی کا ۱۹۶۵ء میں ہوا۔ پہلی متکلم یا بولتی ہوئی فلم عالم آرا ۱۹۳۱ء میں بنی اور ٹی وی نیوز کی عمر تو ابھی بہت کم ہے۔ یہ ابھی اپنے سنِ بلوغ کو بھی نہیں پہنچی ہے۔ ریڈیو نشریات کے آغاز کے وقت اور غیر متکلم فلموں کے دور میں اور اس کے بعد بھی ملک میں اردو کا سکّہ چلتا تھا۔ کوئی بھی تقریر، کوئی بھی مضمون، کوئی بھی فلم اردو کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ تمام تر ذرائع ترسیل اردو زبان کے محتاج تھے۔ چونکہ اردو ہی بولی سمجھی اور پڑھی جاتی تھی اس لیے مذکورہ تمام ذرائع ترسیل اردو ہی کا دامن تھام کر آگے بڑھتے تھے۔

ریڈیو اور ٹی وی نشریات

جب ریڈیو نشریات کا آغاز ہوا تو اردو میں خبریں پڑھی جانے لگیں۔ تقریریں ہونے لگیں، اپیلیں جاری کی جانے لگیں، اطلاعات دی جانے لگیں اور دیگر معلومات بہم پہنچائی جانے لگیں۔ رفتہ رفتہ ریڈیو پروگراموں میں تنوع آنے لگا اور پھر ڈرامے شروع ہوئے، مشاعرے ہونے لگے، مزاحیہ فیچرس پیش کیے جانے لگے اور اردو خبروں کا وقفہ بڑھایا گیا۔ آل انڈیا ریڈیو کے ایکسٹرنل سروس ڈویژن میں اردو سروس شروع ہوئی، دوسرے اسٹیشنوں سے بھی اردو پروگرام نشر کیے جانے لگے۔ اور پھر یوں ہوا کہ اردو کے بیشمار پروگرام آنے لگے۔ یہ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ اردو کا ایک بڑا حلقہ ملک میں موجود تھا۔ اگر اس حلقے تک رسائی حاصل کرنی تھی تو اردو کے پروگرام بھی ضروری تھے اور اس کی آسان اور عام فہم زبان کا سہارا بھی ضروری تھا۔ ریڈیو نشریات کو

اردو کے انتہائی جید اور قدآور ادیبوں اور قلمکاروں کی خدمات حاصل رہیں۔ شہرت یافتہ ادیب سید پطرس بخاری کو آل انڈیا ریڈیو کا پہلا اسٹیشن ڈائرکٹر اور ان کے بھائی سید ذوالفقار بخاری کو اسسٹنٹ اسٹیشن ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ کیوں؟ اس لیے کہ عوام تک پہنچنا ہے تو شیریں وشگفتہ زبان کا سہارا لینا پڑے گا۔ ایسی زبان میں لوگوں سے مکالمہ کرنا ہوگا جو نہ صرف یہ کہ آسانی سے سمجھ میں آسکے بلکہ جس کی شیرینی اور حلاوت سامعین کے دل ودماغ میں براہ راست اپنا گھر بنا سکے۔ بقول شہنشاہ جذبات دلیپ کمار ''جولوگ اردو زبان سے ناواقف ہیں وہ بھی اس کی لوچ اور اس کی کھنک کے دیوانے ہیں''۔ اس لوچ اور اس کھنک نے ریڈیو پروگراموں کو مقبول بنایا اور پھر ان پروگراموں کے توسط سے اردو کو بھی فائدہ پہنچا۔

ان حقائق کے باوجود میں یہ اعتراف اور اظہار بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ریڈیو نے اردو ادب کے دامن کو مالا مال کرنے میں کسی نہ کسی حد تک ضرور رول ادا کیا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو اردو کے بیشتر ادیب وقلمکار ریڈیو سے وابستہ رہے ہیں اور انھوں نے ادب میں نئے نئے تجربے کیے ہیں۔ چونکہ ریڈیو کی زبان عام فہم اور عوامی زبان رہی ہے اس لیے اردو ادیبوں نے عام فہم سادہ اور آسان زبان میں نئی نئی تخلیقات پیش کی ہیں اور نیا اسلوب اختیار کیا ہے۔ سید پطرس بخاری، سید ذوالفقار بخاری، شاہد احمد دہلوی، اسرار الحق مجاز، آغا اشرف، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، سید امتیاز علی تاج، آغا حشر کاشمیری، فضل حق قریشی، شوکت تھانوی، کرشن چندر، اوپندر ناتھ اشک، ریوتی سرن شرما، سید انصار ناصری، عظیم بیگ چغتائی، خواجہ حسن نظامی، قیصر قلندر، سلام مچھلی شہری، کمال احمد صدیقی، محمود ہاشمی، رفعت سروش، زبیر رضوی، عابد سہیل، اقبال مجید اور بیشمار ایسے نام ہیں جنھوں نے ریڈیو کے توسط سے اردو ادب کے دامن کو عظیم تخلیقات سے مالا مال کیا ہے۔ ریڈیو نے ایک نیا اسلوب پیدا کیا ہے اور متعدد ادیبوں نے اس اسلوب کو اپنایا ہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے نشر ہونے والی اردو تخلیقات پر مشتمل ''آواز'' نامی ایک رسالہ شائع کیا جاتا تھا جو اب بند ہو گیا ہے۔ وہ رسالہ اردو ادب میں یقیناً اہمیت کا حامل تھا اور اردو سروس سے نشر ہونے والے ادب سے لوگ رسالہ کی شکل میں بھی روشناس ہوتے تھے۔ جن شخصیتوں کا ابھی ذکر

کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی بہت سے قلمکار ہیں جنھوں نے مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ریڈیو کے توسط سے انھیں عام کیا ہے۔ آج بھی اردو مجلس اور خاص کر آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس سے ادبی وثقافتی پروگراموں کے نشر کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔ سمینار ہوں، مشاعرے ہوں، قوالیاں ہوں، ادبی تقریبات ہوں، مباحثے ہوں، عرس ہوں یا اس قسم کی دیگر تقریبات ہوں ریڈیو نیوز ریل کی شکل میں نشر ہو رہی ہیں اور ادب کا حصہ بن رہی ہیں۔ آج بھی بہت اچھے ریڈیو ٹاک لکھے جا رہے ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرے اور تجزیے نشر ہو رہے ہیں۔ یہ سب اردو کا دامن بھر رہے ہیں اور ہمیں یہ کہنے میں کوئی ندامت نہیں ہونی چاہئے کہ ان ریڈیائی نشریات نے اردو ادب کو اور بھی گراں قدر بنا دیا ہے۔

تاہم ٹیلی ویژن کا زمانہ آتے آتے اردو روبہ زوال ہو گئی۔ سماج اور سرکاری دربار میں اس کی وہ قدر و منزلت نہیں رہ گئی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ٹیلی ویژن پروگراموں کو اردو زبان کے خوبصورت لفظوں اور محاورں سے سجایا جانے لگا۔ اردو پروگرام گرچہ بہت کم بن رہے تھے مگر جو دوسرے پروگرام بن رہے تھے ان میں بھی اردو الفاظ وتراکیب اور تشبیہات وتلمیحات کا استعمال ہونے لگا۔ چونکہ اسے بھی اردو حلقے تک پہنچنا تھا اور اپنی زبان کو سہل اور شیریں بنا کر عوام الناس تک رسائی حاصل کرنی تھی، اس لیے ٹی وی نے بھی اردو کے خزینوں سے اپنا دامن بھرا اور اس طرح جہاں ایک طرف اس نے اردو سے فائدہ اٹھایا وہیں دوسری طرف اس سے اردو کو بھی فائدہ پہنچا۔ آج جبکہ کم وبیش ساڑھے تین سو ٹی وی چینل اور ۳۶ نیوز چینل ہیں اردو کے الفاظ کثرت سے استعمال ہو رہے ہیں۔ اور متعدد سیریلوں کے اردو نام رکھے جا رہے ہیں تاکہ لوگ آسانی سے سمجھ سکیں۔ دور درشن پر انجم عثمانی کے پروگرام بزم کو بھی کافی اہمیت حاصل ہے اور اسے اردو ادب میں ایک اضافہ کہا جا سکتا ہے۔

فلم اور اردو

فلموں کے بارے میں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کی زبان اردو ہوتی ہے، مگر ان کو ہندی کا

سرٹی فیکٹ دیا جاتا ہے۔ اگر فلمسازوں کے دل کی بات پوچھیں تو وہ اردو کے ہی سرٹی فیکٹ لینا چاہتے ہیں مگر مجبوراً ہندی کا سرٹی فیکٹ لیتے ہیں۔ ابھی حال میں فلم اور اردو کے رشتے کے موضوع پر ممبئی میں منعقدہ ایک مباحثے میں شرکاء نے بتایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ماضی میں فلم فیئر ایوارڈ دینے والوں نے یہ شرط لگا دی تھی کہ صرف انہی فلموں کو ایوارڈ کے لیے نامزد کیا جائے گا جو ہندی کی ہوں گی۔ لہٰذا یہ لوگ فلم بناتے ہیں اردو میں اور سرٹی فیکٹ لیتے ہیں ہندی کا۔ تاہم وہ فلمیں زیادہ مقبول ہوتی ہیں جو اردو میں بنتی ہیں جن کے مکالمے اردو الفاظ سے مزین ہوتے ہیں اور جن کے نغمے اردو میں لکھے جاتے ہیں۔ آج کے فلمی نغموں کو سنیں تو ایسا لگتا ہے جیسے شرفاء کی محفل میں کوئی اجڈ اور گنوار آ گھسا ہے اور شرافت و شائستگی کے ماحول میں طوفان بدتمیزی برپا کر رہا ہے۔ ان بے ہنگم شور وغل اور ہنگاموں کے درمیان اگر کوئی اردو کا نغمہ گونج اٹھے تو ایسا لگتا ہے جیسے خزاں کے موسم میں بہار کا خوشگوار جھونکا آ گیا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ فلموں نے اردو نغموں اور مکالموں کے ذریعے اردو کو ایک نئی شناخت عطا کی ہے اور فلموں کی ضرورت کے مطابق نغمے لکھے گئے ہیں اور زبان و بیان میں نئے نئے تجربے کیے گئے ہیں۔ غزلوں اور نغموں کو فلمی دھنوں پر تو گایا ہی گیا ہے، نظموں کو بھی نئے انداز و آہنگ دیے گئے ہیں۔ آج کی تک بند شاعری کے دور میں بھی کبھی کبھار کوئی اچھی غزل کسی فلم میں سننے کو مل جاتی ہے تو طبیعت شاداں و فرحاں ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ طوفان انگیز نغموں اور بھدے مکالموں میں بھی اردو موجود ہے۔ گرچہ اس کی شائستگی کو تار تار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن اس کے باوجود اردو الفاظ کا استعمال فلمی دنیا کی مجبوری بنی ہوئی ہے۔ فلمی دنیا سے وابستہ لوگوں کا کہنا ہے کہ آج فلموں کی زبان بدل رہی ہے، ڈائیلاگ بدل رہے ہیں، نغمے بدل رہے ہیں اور پیش کش کے انداز بدل رہے ہیں۔ بعض لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ فلموں کی کوئی زبان نہیں ہوتی بلکہ کردار اپنی زبان بولتے ہیں۔ اس دعوے سے انکار نہیں مگر سوال یہ ہے کہ پہلے کی فلموں میں بھی ہر طرح کے کردار ہوا کرتے تھے، وہ کیوں اردو میں بات کرتے تھے اور اردو میں گانے گاتے تھے؟ زبان بدلنے کا دعوا فلم شطرنج کے کھلاڑی اور دل

والے دلہنیا لے جائیں گے، کے اسکرپٹ رائٹر جاوید صدیقی کا ہے۔لیکن وہ بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ فلموں میں نغموں کی زبان کو اردو کہا جا سکتا ہے۔ جاوید صدیقی جہاں یہ کہتے ہیں کہ فلم ''دل مانگے مور'' کے مکالمے انھوں نے آدھے انگریزی اور آدھے اردو میں لکھے ہیں، کیونکہ اس فلم کا یہی تقاضا تھا اور یہ کہ زمانے کے ساتھ ساتھ زبان بھی بدل رہی ہے، وہیں وہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ ''فلموں میں اردو آج بھی زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہے گی۔ کیونکہ اردو رابطے کی زبان ہے، عام فہم زبان ہے، جذبات کی زبان ہے اور سب سے خاص بات یہ کہ محبت کی زبان ہے''۔فلم ''بھگت سنگھ''سمیت کئی فلموں کے اسکرپٹ رائٹر پیوش مشرا بھی فلموں میں اردو زبان کی موجودگی کا اعتراف کرتے ہیں اور جہاں وہ یہ کہتے ہیں کہ فلموں کی زبان ہندوستانی ہے اور ہندوستانی ہی رہے گی وہیں وہ یہ بھی کہنے پر مجبور ہیں کہ فلموں کی زبان میں اردو کی چمک دمک برقرار رہے گی۔اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو اور فلمیں ایک دوسرے کے لازم وملزوم ہیں۔فلموں نے اگر اردو کے دامن کو وسیع کیا ہے تو اردو نے فلموں کو مقبولیت ومحبوبیت کے ساتویں آسمان پر پہنچایا ہے۔ مجروح سلطان پوری نے اپنی زندگی کی آخری فلموں میں بھی زبان کے ساتھ کوئی سمجھوتہ نہیں کیا اور اس پھوہڑ پن کو اپنے مضمون میں نہیں آنے دیا جو اردو شاعری کی شاندار اور توانا روایت پر بدنما داغ بن کر رہ گیا ہے۔زبان سے سمجھوتہ کیے بغیر مقبول نغمے لکھنے کی یہ ایک عمدہ مثال ہے۔

نیوز چینل اور اردو

اب کچھ گفتگو موجودہ دور میں الیکٹرانک میڈیا کے اہم ستون یعنی ٹی وی نیوز کی کر لی جائے۔ کہتے ہیں کہ جب کوئی انقلاب آتا ہے تو بہت سی چیزوں کے ساتھ ساتھ زبان بھی متاثر ہوتی ہے۔موجودہ زمانہ الیکٹرانک میڈیا کے انقلاب کا زمانہ ہے اور اس انقلاب نے سب سے زیادہ اگر کسی چیز کو متاثر کیا ہے تو وہ زبان ہے۔آج ٹی وی چینلوں کی زبان ایک کھچڑی زبان بن گئی ہے۔ نیوز چینلوں نے تو زبان کو بری طرح بگاڑ دیا ہے۔

آج نئے نئے محاورے بن رہے ہیں، نئے نئے اسالیب تخلیق پا رہے ہیں اور ترسیل و

ابلاغ کے نئے نئے انداز سامنے آرہے ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا کی یہ نئی زبان کمیونی کیشن کی زبان تو ہے مگر ادب کی روح سے خالی ہے۔ ادبی چاشنی کا خاتمہ ہو گیا ہے اور یہاں تک کہ گرامر کا بھی تیا پانچہ ہو گیا ہے۔ مقفع اور مسجع زبان تو پہلے ہی ختم ہو گئی تھی، اب عام بول چال کی زبان میں بھی بہت سی خامیاں درآئی ہیں اور معمولی سا لسانی شعور رکھنے والا شخص بھی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کی موجودہ زبان نے معیاری زبان کا جنازہ نکال دیا ہے۔

یہ وہ زبان ہے جو ابھی ابتدائی مرحلے میں ہے، لیکن اس سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے اور سب سے زیادہ نقصان اردو کو پہنچ رہا ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے الفاظ کی بھر مار ہے اور اپنی خبروں اور رپورٹوں کو عام فہم اور دلچسپ بنانے کے لئے اردو کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ان کی شکل وصورت بگاڑ دی جاتی ہے۔

آج الیکٹرانک میڈیا اور نیوز چینلوں کی جو زبان ہے اس میں ہندی بھی ہے انگریزی بھی ہے اردو بھی ہے اور مقامی زبانوں کا رنگ بھی ہے۔ اور کبھی کبھی یہ زبان انتہائی درجہ بگڑ جاتی ہے۔ خاص طور پر جب نیوز چینلوں کے رپورٹر کسی سے سوال کرتے ہیں یا لائیو رپورٹنگ کرتے ہیں تو ان کی زبان کا بگاڑ کہاں تک جائے گا اس کا اندازہ ہی نہیں لگایا جا سکتا۔

دراصل نیوز چینلوں کے مالکوں کو اس کے لئے وقت نہیں ہے اور اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کہ وہ زبان پر توجہ دیں۔ ان کو مقابلے کے بازار میں زندہ رہنا ہے تو اپنے ادارے کی معاشی پوزیشن کو مضبوط کرنا ہوگا۔ معیشت کسی بھی ادارہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے اور اگر ریڑھ کی ہڈی کمزور ہوگی تو کمر جھک جائے گی۔ کمر کو سیدھا رکھنے کے لئے مالکوں کو سرمایہ کی طرف بھاگنا پڑتا ہے اور سرمایہ کی حصولیابی کے ذرائع یعنی اشتہارات پر توجہ دی جاتی ہے۔ لیکن ان اشتہارات میں بھی زبان پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔ ان میں ایک نئی زبان استعمال ہو رہی ہے ایسی زبان جو ہماری عام بول چال کی زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں بھی ہندی، انگریزی، اردو اور مقامی زبانوں کے الفاظ ہیں اور اس پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی کہ ان کا استعمال کیسے کیا جا رہا ہے۔

اشتہاروں میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان کی مدد سے جو پیغام دینے کی کوشش کی جا رہی ہے اس میں ہم کہاں تک کامیاب ہیں۔ اگر آپ ٹی وی اشتہاروں پر غور کریں تو آپ کو ایسے بے شمار الفاظ ملیں گے جن کو آپ عام لوگوں میں بولنا بھی پسند نہیں کریں گے۔ ٹی وی چینلوں میں اشتہارات کے شعبے تو ہیں اور ان میں لوگوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دی جاتی ہیں، لیکن زبان کی درستی کا کوئی شعبہ نہیں ہے۔ اس کی انھیں ضرورت بھی نہیں ہے۔ زبان کی درستی سے پیسے نہیں آئیں گے۔ پیسے آئیں گے اشتہاروں سے۔ لہٰذا زبان پر توجہ دینا وقت اور صلاحیتوں کی بربادی مانا جاتا ہے۔

نیوز چینلوں میں چند ایک کو چھوڑ کر بیشتر کے نیوز ریڈروں اور رپورٹروں کا تلفظ بہت خراب ہے۔ بعض اوقات تو ایسا لگتا ہے جیسے کوئی ناخواندہ اور جاہل شخص خبریں پڑھ رہا ہے۔ خبروں کی پیشکش میں جنس اور جذبات کو زیادہ ترجیح دی جاتی ہے۔ زبان اور معیار کو نہیں۔ ادب کس چڑیا کا نام ہے یہ نیوز چینلوں کو نہیں معلوم۔ اس سلسلے میں ہم نے لسانیات کے بعض ماہرین سے گفتگو کی تو انھوں نے بہت دکھ کے ساتھ کہا کہ نیوز چینلوں نے معیاری زبان کا جنازہ نکال دیا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ کچھ چینلوں نے تو زبان خراب کرنے کا جیسے بیڑا ہی اٹھالیا ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ دیگر بہت سے شعبوں کے قیام کے ساتھ ساتھ زبان اور تلفظ کی درستی کا بھی شعبہ قائم ہونا چاہئے، جو خبروں اور رپورٹوں کے پیش کئے جانے سے قبل ان کی زبان ٹھیک کرے اور اس کے ساتھ نیوز ریڈروں اور رپورٹروں کو تلفظ کی درستی کی ٹریننگ بھی دے۔ ان کی بھرتی کے وقت جہاں بہت سی صلاحیتوں اور خوبیوں کو ضروری قرار دیا جاتا ہے وہیں ان میں یہ خوبی بھی تلاش کی جانی چاہئے کہ ان کی زبان اچھی ہو اور ان کا تلفظ ٹھیک ہو۔ اگر ان میں بہت زیادہ بگاڑ ہو تو ان میں اصلاح کی جائے اور ان کی تربیت کی جائے۔ تاہم بعض چینل ایسے ہیں جن کے نیوز ریڈروں کا تلفظ قدرے بہتر ہے اور جن کی زبان ٹھیک ہے۔ تلفظ کی اہمیت سے کوئی بھی انکار نہیں کرسکتا۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جو نیوز ریڈر اردو سے واقف ہیں ان کی زبان صاف ستھری اور تلفظ قدرے ٹھیک ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج نیوز چینلوں میں مسلم لڑکے اور لڑکیوں کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا تلفظ درست ہوتا ہے، بالخصوص ان لوگوں کے مقابلے میں جو اردو سے

ناواقف ہیں۔

جیسا کہ ذکر کیا گیا کہ الیکٹرانک میڈیا میں اردو کے الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں مگر ان کی شکل بگاڑ دی جاتی ہے یا اردو سے ناواقفیت کی بنا پر الفاظ بگڑ جاتے ہیں۔ آج کل ایک جملہ کثرت سے استعمال ہو رہا ہے کہ ''فلاں چیز کی قواعد شروع ہو گئی ہے''۔ اس جملے میں قواعد کا غلط طریقے سے استعمال کر کے ''قواعد'' کا برسر عام قتل کر دیا گیا ہے۔ قواعد کا مفہوم کیا ہے اور اسے کس مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے اس کا ان لوگوں کو ذرا بھی علم نہیں ہے۔ قہر برپانا، فلاں کے چلتے اور فلاں معاملے کو لے کر جیسے الفاظ خوب استعمال ہو رہے ہیں۔ اب بارش کو برسات کہا جانے لگا ہے۔ آج کے رپورٹر کہتے ہیں کہ دہلی میں برسات ہو رہی ہے۔ بارش بند ہو جانے کو کہتے ہیں کہ برسات بند ہو گئی ہے۔ انھوں نے برسات اور بارش کی تمیز ہی ختم کر دی ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کہ لفظ بوڑھے اور بڑھاپے کی تمیز ختم ہو جائے۔ خلافت کو مخالفت کے معنی میں استعمال کرنا تو بہت پرانا معاملہ ہے۔ لفظوں کی جمع الجمع بھی خوب بنائی جاتی ہے جیسے جذباتوں، خیالاتوں، علماؤں وغیرہ۔ یہ محض چند نمونے ہیں ورنہ اگر آپ ایسے الفاظ کی فہرست سازی کریں تو ایک لغت تیار ہو جائے گی۔

نیوز چینلوں کے اثرات بد

الیکٹرانک میڈیا کی اس بگڑی ہوئی زبان کا اثر عام بول چال کی زبان پر بھی پڑ رہا ہے اور پرنٹ میڈیا کی زبان پر بھی اور اردو کے اخبارات بھی اس سے بچ نہیں پائے ہیں۔ بیشتر اردو اخباروں کی خبریں پڑھتے وقت ایسا لگتا ہے جیسے خبر سازوں نے نیوز چینل دیکھ کر خبر بنائی ہے۔ وہی سرخی، وہی زبان، وہی انداز اور وہی غیر معیاری پن۔ اب تو اردو کے اخباروں میں ایسی سرخیاں بھی نظر آتی ہیں ''امریکہ صدام حسین کے فراق میں'' ہمارے اردو صحافیوں کو شاید اب یہ بھی نہیں معلوم کہ فراق کا مطلب کیا ہوتا ہے اور اسے کہاں اور کیسے استعمال کیا جانا چاہئے۔ اسی طرح ''فلاں کے چلتے'' اور ''فلاں کے ذریعے'' اور ''فلاں کو لے کر'' جیسے الفاظ کا استعمال

اخباروں میں تو عام بات ہے۔ بعض اردو اخباروں کی سرخیاں دیکھ کر تو کبھی کبھی انتہائی حیرت ہوتی ہے کہ آخر اردو زبان کا کیا ہوگا۔ کیا عوام تک اپنی بات پہنچانے کے لئے زبان کا گلا گھونٹنا ضروری ہے۔ بعض اوقات تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے اردو کے صحافیوں کا گنجینہ الفاظ بالکل خالی ہوگیا ہے۔ ان کے ترکشوں میں غیروں کے تیر آ گئے ہیں۔ ہمارے صحافی یا تو زبان کی نزاکتوں سے واقف نہیں رہ گئے یا وہ محنت کر کے متبادل الفاظ ڈھونڈنا نہیں چاہتے یا پھر جان بوجھ کر زبان کوخراب کرنے والے گروہ میں شامل ہو گئے ہیں۔

ہندی اخبارات میں زبان کی بگاڑ پر اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا کہ اردو اخباروں کی خراب ہوتی زبان پر ہوتا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اردو صحافیوں کو اس جانب متوجہ کیا جائے اور ان کو یہ بتایا جائے کہ اردو زبان کا حلیہ بگاڑنے کا قصور وار صرف الیکٹرانک میڈیا نہیں ہو رہا ہے آپ بھی ہو رہے ہیں اور یہ آپ کی ذمہ داری ہے کہ آپ صحیح اور درست اردو استعمال کریں اور جذبات کی نمائندگی کو زبان کے معیار پر ترجیح نہ دیں۔ آپ صحیح زبان کے استعمال کے ساتھ بھی جذبات کی نمائندگی کر سکتے ہیں۔ جذبات پیش کرنے کے لئے زبان کا قتل ضروری نہیں ہے۔ بلکہ آپ بہتر زبان استعمال کر کے بہتر انداز میں لوگوں کے مسائل اٹھا سکتے ہیں۔ اردو صحافیوں کو یہ مشورہ دیا جانا چاہئے کہ وہ اپنے دل ودماغ پر الیکٹرانک میڈیا کو حاوی نہ ہونے دیں اور اس کی زبان اور اس کے انداز کو معیار نہ بنائیں۔ اردو اخبارات کا اپنا معیار رہا ہے اور یہ بہت بلند رہا ہے۔ ہمارے بزرگ صحافیوں نے معیاری زبان سے کبھی بھی سمجھوتہ نہیں کیا اور آج بھی ایسے متعدد اخبار اور صحافی موجود ہیں جو زبان سے سمجھوتہ نہیں کرتے، جو معیار کو برقرار رکھتے ہوئے عوامی مسائل کو اٹھاتے ہیں اور حالات حاضرہ پر تبصرے کرتے ہیں اور روز مرہ کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ آنے والا مورخ جب الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی تاریخ رقم کرے تو ہمیں اردو زبان کے بگاڑ کا ذمہ دار قرار دے دے۔ جہاں تک الیکٹرانک میڈیا کا سوال ہے تو وہ اپنا راستہ خود طے کرے، اپنی زبان خود بنائے اور اپنی گرامر خود تخلیق کرے۔ کوئی کیا کر سکتا ہے۔ مگر اردو والوں کو ان کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہئے بلکہ الیکٹرانک میڈیا کو اپنے نقش قدم پر چلانا چاہئے۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا میں اچھی اردو استعمال کی جائے یا کم از کم اردو کو بگاڑ کر نہ استعمال کیا جائے تو ہمیں چاہئے کہ ہم اردو کی بنیادی تعلیم سے واقف یا اردو زبان کا بنیادی علم رکھنے والے طلباء کو آگے بڑھائیں اور ایسے زیادہ سے زیادہ طلباء کو الیکٹرانک میڈیا میں داخل ہونے کی ترغیب دیں اور کوشش کر کے ان کی تقرری نیوز چینلوں میں کروائیں۔ ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اردو کے فروغ کا جائزہ لینے کے بجائے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ اس کے بگاڑ کا جائزہ لینے کی ضرورت پڑ جائے اور ہم کو مجبوراً یہ کہنا پڑے کہ الیکٹرانک میڈیا نے جہاں پہلے اردو زبان کو فروغ دیا وہیں وہ اب اردو کو تباہ و برباد کرنے کی مہم چلا رہا ہے۔

اردو پریس اور جذباتیت

قومی پریس پر عموماً یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ وہ مسلم مسائل کے تئیں غیر سنجیدہ اور غیر ذمہ دار ہے۔ وہ مسلم مسائل کو یا تو اٹھاتا ہی نہیں ہے یا اٹھاتا ہے تو ان کی رنگ آمیزی کر دیتا ہے۔ ایسی رنگ آمیزی جس کی مدد سے اسلام اور مسلمانوں کی شکل وصورت بدرنگ ہو جائے اور ان کی شبیہ داغدار جائے۔ وہ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے معاملات کو توڑ مروڑ کر پیش کرتا ہے اور حقائق سے عملاً اور عمداً روگردانی کرتا ہے۔ گویا قومی پریس اسلام، مسلمانوں اور مسلم مسائل کے تئیں بے ایمانی سے کام لیتا ہے۔ ان الزامات میں بہت حد تک صداقت ہے اور قومی پریس سے وابستہ افراد اس کی تردید نہیں کر سکتے۔ ایسا کرنے کے پس پردہ ان کے مقاصد اور عزائم خواہ کچھ بھی ہوں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قومی پریس مسلمانوں کے صرف انہی معاملات کو اٹھاتا ہے اور لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے جو جذباتی ہوں یا جن کی مدد سے مسلمانوں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی جا سکے۔ لیکن اس صداقت کے علی الرغم کیا ہم نے کبھی اس پر غور کیا کہ اردو صحافت میں غیر ذمہ داری کے جراثیم کہاں تک سرایت کر گئے ہیں، جذباتیت کا درجہ حرارت کہاں تک چڑھا ہوا ہے اور کیا اردو صحافی یا اردو اخبارات جذباتیت اور فرقہ واریت کے الزام سے مبرا ہیں۔ کیا ہم نے کبھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا کہ ہم غیر ذمہ داری کے دلدل میں کہاں تک دھنسے ہوئے ہیں اور ہمارے دامن پر کتنی چھینٹیں اور کتنے داغ ہیں۔

شاید ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اپنے دامن کو دیکھنے کی ہم نے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں کی اور شائد ہمارے اندر اس کی جرأت بھی نہیں ہے۔ دوسروں پر الزام عائد کرنا تو بہت آسان ہے، لیکن اپنے آپ کو الزامات سے پاک وصاف رکھنا بہت مشکل ہے۔ اگر ہم اردو اخبارات کا جائزہ لیں اور ایماندارانہ جائزہ لیں تو شاید ہمیں اپنے اوپر ندامت محسوس ہو۔ ممکن ہے کہ اِس وقت کے اخبارات

میں سنسنی خیزی کا عنصر کم ہو گیا ہو لیکن اگر آپ آج سے تیس چالیس برس پہلے کے اخبارات اٹھا کر دیکھیں تو حقیقت کچھ اور ہی نظر آئے گی۔ عام حالات میں بھی سنسنی خیزی سے کام لیا جاتا ہے اور خاص حالات میں بھی۔ خاص حالات میں تو معاملہ کریلہ نیم چڑھا ہو جاتا ہے۔ ایسی زبان استعمال کی جاتی ہے جس سے قارئین کو بے وقوف بنانا آسان ہو۔ عام طور پر اردو اخبارات کے قاری کم تعلیم یافتہ یا نیم خواندہ ہوتے ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان اردو اخبارات کم پڑھتے ہیں۔ اس پر اکثر و بیشتر بحث و مباحثہ ہوتا رہتا ہے۔ نیم خواندہ مسلمان ہی اردو اخبارات پڑھتے ہیں بالخصوص گاؤں اور قصبوں کے قارئین اسی طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ (دہلی جیسے شہروں میں اتنی خراب صورت حال نہیں ہے۔ یہاں بہت سے تعلیم یافتہ مسلمان بھی اردو اخبارات کے قاری ہیں)۔ ناخواندہ لوگ بھی ان اخبارات کے قاری ہوتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ گاؤں اور قصبوں کی چوپالوں پر اور چائے خانوں میں جب رنگ برنگے ہفت روزہ اخبارات پہنچتے ہیں تو ایک شخص ان کو پڑھتا ہے اور وہاں موجود دوسرے لوگ سنتے ہیں۔ حالانکہ یہ صورتحال اب پہلے جیسی نہیں رہی، مگر اب بھی کسی حد تک برقرار ہے۔ چونکہ کم تعلیم یافتہ یا نیم خواندہ اور ناخواندہ لوگوں کو جذباتیت اور سنسنی خیزی کے طوفان میں بہا لے جانا نسبتاً آسان ہوتا ہے، لہٰذا ان کو اِسی ڈنڈے سے ہانکا جاتا ہے۔ یہ اخبارات جو کچھ لکھتے ہیں ان کے قاری ان کو کسی صحیفہ کے مشمولات سمجھ کر ان پر فوری طور پر یقین کر لیتے ہیں اور ان سے اپنی عقیدت بھی وابستہ کر لیتے ہیں۔

ان اخبارات کا عام طور پر یہ رویہ ہوتا ہے کہ یہ کسی بھی معاملہ کو فوراً مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔ خواہ روزگار کا معاملہ ہو، تعلیم کا معاملہ ہو، ریزرویشن کا معاملہ ہو، ملازمتوں کا معاملہ ہو یا پھر عراق امریکہ جنگ ہو، اسرائیل فلسطین کشمکش ہو یا پھر ایسا ہی کوئی دوسرا معاملہ ہو۔ اگر اندرون ملک کا معاملہ ہو تو ہم فوری طور پر اسے فرقہ سے جوڑ دیتے ہیں اور اگر بین الاقوامی معاملہ ہو تو اسے مذہب اور اسلام سے جوڑ دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر یہ شکایت عموماً کی جاتی ہے کہ مسلمانوں کو اس لئے ملازمتیں نہیں دی جاتی ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس الزام میں کسی حد تک صداقت ہے لیکن کیا کبھی ہم اردو صحافیوں نے مسلمانوں کو یہ بتانے کی بھی زحمت گوارا کی ہے کہ آئی اے ایس اور دیگر اعلا امتحانوں میں

مسلمانوں کی شمولیت کتنی فیصد ہوتی ہے۔ کیا ہم نے کبھی مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ فلاں محکمہ میں بھرتی ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے، مسلمان وہاں قسمت آزمائی کریں۔ کیا کبھی ہم نے مسلمانوں کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھیں اور اپنا حق لینے کے لئے ہر محاذ پر لڑائی لڑیں۔ کیا ہم نے مسلم طلبا کے سامنے ان کورسز کا خاکہ پیش کیا یا ان کی تفصیلات بتائیں جن میں انھیں قسمت آزمائی کرنی چاہئے۔ کیا اردو اخبارات کے صحافیوں نے آئی اے ایس جیسے باوقار مقابلوں کی تیاری کی غرض سے مسلم طلبا کے لئے کوئی کوچنگ شروع کی۔ ایسا ہم نے کیا ہی نہیں اور شاید ہم کرنا بھی نہیں چاہتے، کیونکہ اس سے اخبارات کی سیل نہیں بڑھتی۔ اخبارات کی سیل تو جذباتی نعرے لگانے سے بڑھتی ہے۔ یہ بتانے سے بڑھتی ہے کہ اسلام خطرے میں ہے۔ یہ بتانے سے بڑھتی ہے کہ قربانی دینے کا وقت آ گیا ہے اور اگر مسلمان اسلام کو بچانا چاہتے ہیں تو انھیں سڑکوں پر آنا ہوگا۔ اخبارات کی سیل رنگ برنگے اور لہولہان ٹائٹل سے بڑھتی ہے۔ ایسے ٹائٹل سے جس پر تلوار بنی ہوئی ہو اور اس سے خون ٹپک رہا ہو۔ ایک دستار بند باریش شخص تلوار لئے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو اور ایسا لگ رہا ہو کہ وہ بس آنِ واحد میں پوری دنیا کو فتح کر کے اسلام کے قدموں میں ڈال دے گا۔ جب عراق امریکہ جنگ ہو رہی تھی تو اردو کے بعض اخبارات اسے اسلام اور کفر کی لڑائی بنا کر پیش کر رہے تھے اور اسے سرزمین کربلا پر ایک اور معرکہ قرار دے رہے تھے۔ ان اخبارات نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ اسلام اور کفر کی نہیں بلکہ تیل کے ذخائر پر قبضہ کرنے کی جنگ ہے، اپنی سیل بڑھانے کے لئے اسے صلیبی جنگ قرار دے دیا اور یہ تاثر پیش کیا گیا کہ اگر مسلمانوں نے اور اسلامی حکومتوں نے صدام حسین کا ساتھ نہیں دیا تو روئے زمین سے اسلام کا خاتمہ ہو جائے گا۔ یہ تسلیم کہ عراق امریکہ جنگ یا اسرائیل فلسطین کشمکش میں مسلم مخالف طاقتوں کے اندر یہ جذبہ کارفرما ہے کہ یہ مسلمان ہیں لہٰذا ان کو تباہ و برباد کر دو لیکن معاملہ صرف اتنا ہی نہیں ہے بلکہ اصل معاملہ تیل اور زمین کا ہے۔ لیکن ہم نے اسے اسلام اور کفر کی جنگ بنانے کے علاوہ اس کو اور کوئی نام نہیں دیا، کیونکہ کوئی اور نام دینے سے سنسنی خیزی ختم ہو جائے گی، جذباتیت نہیں رہے گی اور اس طرح اخبارات کی سیل پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔

تاہم ۱۹۹۲ میں بابری مسجد انہدام کے بعد مسلمانوں کی سوچ میں بہت حد تک تبدیلی آئی ہے

اور اب ان جذباتی اخبارات کے قارئین کی تعداد میں بھی بہت حد تک کمی آئی ہے۔ اب بیشتر مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ابھی تک جذباتیت کا انجکشن لگا کر انھیں مدہوش کر کے ان کی جیبوں سے پیسے نکالے جاتے رہے ہیں۔ اب مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ تعلیم کی طرف راغب ہوا ہے اور اب وہ اخبارات کی سنسنی خیز سرخیوں اور جذباتیت سے پُر زبان کا پہلے جیسا گرویدہ نہیں رہ گیا ہے۔ وہ طبقہ یہ سمجھ گیا ہے کہ اسے اس خوراک کی ضرورت نہیں ہے جو اسے غنودگی کی کیفیت میں مبتلا کر دے یا پھر اس کے اندر اتنا اشتعال بھر دے کہ وہ تلوار لے کر سڑک پر نکل آنے کو بے چین ہو جائے۔ اسے سنجیدگی کے ساتھ سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنے والی تحریر چاہئے۔ اسے ایسی تحریر چاہئے جو اسے تخریبی راستے پر نہیں بلکہ تعمیری راستے پر گامزن کرے۔ جو اسے منزل سے بھٹکانے کے بجائے منزل پر پہنچنے میں مدد دے۔ یہی وجہ ہے کہ اب سنسنی خیز اور جذباتی زبان کے خریداروں کی کمی ہوگئی ہے اور بے وقوف بنانے والے اخبارات کی سرکولیشن کم ہوتی جارہی ہے، لیکن اب بھی کچھ ایسے اخبار اور قاری موجود ہیں جو منفی تحریروں کے دلدادہ ہیں۔ دراصل ان کی عادت اس قدر خراب ہوگئی ہے کہ انھیں غیر جذباتی یا تعمیری تحریریں جلد پسند نہیں آتیں۔ ان کے مزاج کا ذائقہ ان اخباروں نے اس قدر خراب کر دیا ہے کہ وہ شاید تعمیری زبان سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں۔ ایسے لوگوں کا ذہن بدلنے کے لئے کافی جدوجہد کرنی ہوگی اور ان کے مزاج کو بدلنے کی سنجیدہ کوشش کرنی ہوگی۔ اگر ہم اردو والے اس محاذ پر کوئی ٹھوس کوشش کرتے ہیں تو یہ یقیناً نہ صرف اردو صحافت کے نقطہ نظر سے بہت مفید ہوگا بلکہ قارئین کے تعلق سے بھی ایک گراں قدر خدمت ہوگی۔

جذباتیت کے اسباب:

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اردو پریس کی سوچ میں اس عنصر کا غلبہ کیوں ہوا اور بیشتر اردو اخبارات جذباتیت کے سہارے اپنی اشاعت میں اضافہ پر کیوں مجبور ہوئے۔ بنیادی طور پر اس کے دو اسباب ہو سکتے ہیں۔ پہلی بات یہ کہ اردو صحافت کی پیدائش جن حالات میں ہوئی وہ ملک میں انگریزوں کے خلاف جدوجہد کا دور رہا اور اردو پریس نے آزادی کی جنگ میں بڑھ چڑھ کر حصہ

لیا۔اس وقت یہ حالات کا تقاضا تھا کہ اردو کے قارئین کے سامنے پر جوش تحریریں پیش کی جائیں اور ان کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف جاری ملک گیر جنگ میں شدت آجائے۔ یہ اخبارات اس وقت انتہائی کامیاب رہے اور انھوں نے پر جوش اداریوں اور ہنگامہ خیز مضامین کی بدولت اردوداں طبقہ میں ایسی کیفیت پیدا کردی کہ وہ میدان جنگ میں کود پڑے۔وہ اردو اخبارات کا انتظار کرتے تھے،اوران کو پڑھ پڑھ کر اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے۔ان دنوں اخبارات کے قاری صرف مسلمان ہی نہیں ہوا کرتے بلکہ اردو زبان تمام ہندوستانیوں کی زبان تھی۔ یہ سلسلہ حصول آزادی تک جاری رہا۔

رفتہ رفتہ اردو کے قارئین کا حلقہ سمٹنے لگا اور دھیرے دھرے اردو صرف مسلمانوں کی زبان بننے لگی۔آزادی کے بعد اس سلسلے میں تیزی آگئی۔(اس کے بہت سے اسباب ہیں جن پر اس مضمون میں اظہار خیال نہیں کیا جاسکتا۔)اور اب صورت حال یہ ہے کہ چند فیصد غیر مسلم اردو کے قارئین ہیں ورنہ اردو کے اخبارات ورسائل صرف کچھ مسلم گھرانوں تک محدود ہو کر رہ گئے ہیں۔ بہر حال اردو اخبارات میں جوشیلی تحریروں کا جو سلسلہ جنگ آزادی میں شروع ہوا تھا وہ حصول آزادی کے بعد بھی برقرار رہا۔ اردو صحافت میں آزادی کے بعد یوں تو بہت سی تبدیلیاں آئیں مگر انداز بیان میں جو شدت اور حدت تھی اس میں بہت زیادہ کمی نہیں آئی۔ چونکہ اب سامنے کا دشمن انگریز نہیں ہے،وہ تو چلا گیا مگر اردو پریس نے ایک نادیدہ دشمن کھڑا کردیا۔ یہ دشمن کبھی حکومت کی شکل میں موجود ہوتا ہے تو کبھی مسلم دشمن تنظیموں کی شکل میں اور نہیں کچھ تو گروہی اور مسلکی مخالفین کو دشمن کی جگہ پر کھڑا کردیا جاتا ہے۔(حکومت اور مسلم دشمن تنظیموں کی مسلم دشمنی پر الگ سے اظہار خیال کرنے کی ضرورت ہے۔)اس طرح اردو صحافت کی پیدائش کے وقت اور اس کے بعد حصول آزادی تک اسلوب نگارش اور انداز بیان میں جو تیکھا پن تھا وہ بعد میں بھی موجود رہا ختم نہیں ہوا،البتہ اس کی شکل تھوڑی بہت ضرور بدل گئی۔

اس کی دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ چونکہ مسلمان ہی اردو اخبارات کے مجموعی قاری ہیں اور مسلمانوں کی جذباتیت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔لہٰذا اردو پریس کو اس سے بھی حوصلہ ملا۔ نہ صرف ہندوستان اور پاکستان بلکہ پوری دنیا کے مسلمان جذباتی واقع ہوئے ہیں اور وہ جذباتی انداز میں سوچتے اور ردعمل ظاہر کرتے ہیں۔لہٰذا اردو اخبارات کے لئے اس جذباتی طرز فکر نے کھاد کا کام کیا۔ ہندوستانی مسلمانوں

میں ایسے بہت کم ہوں گے جو جذباتیت کے بجائے دور اندیشی سے کام لیتے ہوں اور کم خواندہ نیم خواندہ یا ناخواندہ مسلمانوں میں تو ان کی تعداد اور بھی کم ہے۔ انھیں وہی تحریریں پسند آتی ہیں جن کو پڑھ کر ان کا خون جوش مارنے لگے اور وہ نہتے ہی دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے سڑکوں پر نکل آئیں۔ اگر ان کے سامنے سنجیدہ اور تعمیری تحریریں پیش کی جائیں تو اس میں ان کو مزا نہیں آتا اور ان کو یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ فلاں اخبار کی سرخیوں میں مزا نہیں ہے اور فلاں اخبار کی تحریریں بڑی جوشیلی ہوتی ہیں۔ جبکہ سنجیدہ او رتعمیری انداز بیان اختیار کرنے والے کو وہ پھسپھسا اخبار اور پھسپھسی تحریر بتاتے ہیں۔ اس لئے آزادی کے بعد بھی اردو اخبارات نے اسی انداز فکر اور اسلوب تحریر کو اختیار کیا جو ان کے قارئین کو اور خود ان کو بھی سوٹ کرتا ہو۔ ان اخبارات نے دونوں طرح کی تحریریں لکھ کر یہ دیکھ لیا کہ مالی منفعت کس میں زیادہ ہے اور کن موضوعات پر اور کس انداز میں لکھنے پر سرکولیشن میں اضافہ ہوتا ہے۔ اگر اسلام اور کفر کی جنگ کا ہوّا کھڑا کرنے، صدام حسین۔ دوسرا صلاح الدین ایوبی کا نعرہ لگانے اور چند برسوں میں پوری دنیا پر اسلام کا غلبہ ہو جانے کا مژدہ سنانے سے اخبارات کی اشاعت میں اضافہ ہو رہا ہے تو یہی سہی۔ پھر تو کچھ اخباروں نے یہی روش اختیار کر لی، حالانکہ ان کے مدیران ذی احترام یہ بات بہت اچھی طرح جانتے اور سمجھتے ہیں کہ ان کی تحریروں کی جذباتیت مسلمانوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ اس کے باوجود وہ مجبور ہیں کہ ایسی تحریریں پیش کریں۔ یا پھر اپنا اخبار بند کر دیں۔ جو لوگ ایسے اخبارات کے مدیروں سے واقف ہیں وہ یہ گواہی دیں گے کہ ان کی تحریر اور کردار میں زمین آسمان کا تضاد ہے وہ اپنے قارئین کو جن باتوں کی تلقین کرتے ہیں ان سے خود کوسوں دور ہیں اور وہ یہ بات بھی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ وہ اپنے قارئین کو بے وقوف بنا رہے ہیں، لیکن اخبار بیچنا ہے تو یہ حربے اختیار کرنے ہی پڑیں گے۔

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اردو قارئین کے مزاج اور اردو پریس کے مخصوص طرز نگارش نے ایک دوسرے کے لئے کھاد کا کام کیا۔ قارئین نے ایسے اخباروں کی اشاعت میں اضافہ کیا اور ان اخبارات نے قارئین کی جذباتیت میں شدت پیدا کی، لیکن اب جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے اس جذباتیت میں کمی آ رہی ہے اور بالخصوص ۶ دسمبر ۹۲ کے بعد ایسے اخبارات کی اشاعت میں کمی واقع ہوئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ قارئین کے مزاج میں تعمیری انداز پیدا کیا جائے اور ان میں مثبت بامعنی اور مقصدیت سے پُر تحریریں پڑھنے کی عادت ڈالی جائے، تا کہ اردو پریس جذباتیت کے الزام سے پاک وصاف ہو سکے۔

اردو صحافت کے مسائل پر طائرانہ نظر

مختلف مسائل کے انبار میں دبی ہم عصر اردو صحافت کی داستان نہ تو رزمیہ ہے نہ ہی طربیہ، ہاں اسے حزنیہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔ صحافت زبان سے جڑی ہوتی ہے۔ زبان ترقی یافتہ ہو تو صحافت بھی ترقی یافتہ ہوگی اور اگر زبان روبہ زوال ہے تو صحافت کا معیار بھی پست ہوگا۔ یوں تو اردو صحافت مختلف مسائل کے جلو میں ہے، لیکن سب سے بڑا مسئلہ اور چیلنج اردو زبان کی بقا اور تحفظ کا ہے۔ مجھے معاف فرمائیں مگر میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اس وقت گرچہ بیشتر ملکوں میں اردو مشاعرے ہو رہے ہیں اور کئی ملکوں سے اردو کے رسائل و جرائد بھی نکل رہے ہیں مگر ہندوستان میں اردو زبان روبہ زوال ہے، لہٰذا ہم عصر اردو صحافت کا معیار بھی گرتا جا رہا ہے۔ اردو صحافت کو درپیش دیگر مسائل ضمنی ہیں اور اردو کی بقا اور تحفظ سے ہی جڑے ہوئے ہیں۔

آج اردو کی بنیادی تعلیم کی طرف لوگوں کی توجہ کم ہے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد میں دن بہ دن کمی آتی جا رہی ہے۔ البتہ اسلامی مدارس و مکاتب میں آج بھی اردو پہلے کی طرح زندہ ہے اور اگر یہ کہا جائے تو شائد غلط نہ ہوگا کہ اردو کا چراغ جلائے رکھنے میں ان کا بڑا ہاتھ ہے۔ آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا کر دیکھئے تو اردو تعلیم حاصل کرنے والے طلبا کی اکثریت مدارس و مکاتب سے فارغ التحصیل طلبا پر مشتمل ہوگی۔ اگر ہمارا بیشتر مذہبی سرمایہ اردو میں منتقل نہ ہوا ہوتا تو اس محاذ پر بھی اردو کمزور رہتی۔ جب اردو پڑھنے والے نہیں ہوں گے تو اردو اخبارات کو کون خریدے گا اور اردو اخبارات کن لوگوں کے لئے نکالے جائیں گے۔ یوں بھی ہم اردو والے انگریزی اخبارات کا مطالعہ اپنی شان سمجھتے ہیں اور اردو اخبارات خریدنا کسر شان۔ چونکہ بنیادی سطح سے اور باضابطہ طور پر اردو کی تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی کمی ہوتی جا رہی ہے لہٰذا اس کا

اثر ہم عصر اردو صحافت پر بھی پڑ رہا ہے۔ کم از کم دہلی سے شائع ہونے والے اردو اخبارات کے بارے میں میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ان میں کام کرنے والے ورکنگ جرنلسٹوں یا کارکن صحافیوں کی جونئی کھیپ ہے وہ اردو زبان کی نزاکتوں سے بہت کم واقف ہے اور عربی و فارسی کی شد بد تو معاف فرمائیں بالکل بھی نہیں ہے۔ اور جو صحافی مدارس و مکاتب سے آئے ہیں ان میں سے اکثریت انگریزی زبان کی باریکیوں سے ناواقف ہے۔ اس کا نتیجہ اس شکل میں برآمد ہو رہا ہے کہ بیشتر اخبارات کی زبان بہت خراب ہو گئی ہے، ان کا معیار پست ہو گیا ہے اور خبروں، رپورٹوں اور مضامین میں وہ الفاظ زیادہ آنے لگے ہیں جن کو ہندی الیکٹرانک میڈیا نے گھڑا ہے اور جو اردو قطعاً نہیں ہیں۔ ان الفاظ کے غیر ضروری استعمال سے اردو کا رنگ غائب ہوتا جا رہا ہے اور ہندی کا ملمع چڑھتا جا رہا ہے۔ زبان بوجھل ہو رہی ہے اور بامحاورہ زبان تو تقریباً عنقا ہو چکی ہے۔

اردو اخبارات کو درپیش مسائل میں دوسرا بڑا مسئلہ سرمایہ کا ہے اور اس کا تعلق بھی زبان سے جڑا ہوا ہے۔ آج کوئی بھی بڑا صنعتی گھرانہ (ایک کو چھوڑ کر) اردو اخبار نکالنے میں دلچسپی نہیں رکھتا اور نہ ہی اردو زبان سے واقف امراء اور سرمایہ دار اردو صحافت میں سرمایہ کاری کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ سوچتے ہیں کہ جب ان اخبارات کے پڑھنے والے ہی نہیں ہیں اور ان کو کچھ ریٹرن ملنے والا ہی نہیں ہے تو پھر وہ پیسہ کیوں لگائیں۔ اردو اخبارات کے قاری نچلے اور درمیانہ طبقے کے ہیں اور اعلیٰ طبقہ اس طرف توجہ نہیں دیتا۔ چونکہ ریڈرشپ کم ہے اس لئے اشتہارات کی ایجنسیاں بھی اس طرف متوجہ نہیں ہوتیں۔ پرائیویٹ اشتہار دہندگان بھی اردو اخبارات کو سنجیدگی سے نہیں لیتے۔ پچھلے دنوں ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ پراپرٹی کا کام کرنے والی ایک نجی کمپنی نے اپنا اردو زبان میں تیار کیا ہوا اشتہار انگریزی روزنامہ ہندوستان ٹائمس میں چھپوایا اور اس کا خاطر خواہ رسپانس بھی نظر آیا۔ کمپنی کے مالک نے بتایا کہ ان کا ہدف مسلمان تھے مگر چونکہ تعلیم یافتہ مسلمان اردو اخبارات کم پڑھتے ہیں، لہٰذا انہیں مجبور ہو کر انگریزی اخبار میں اردو کا اشتہار دینا پڑا۔ اس کا فائدہ اس کمپنی کو یوں ہوا کہ وہ اشتہار قارئین کو نمایاں طور پر نظر آیا اور جس طبقہ کو اشتہار میں نشانہ بنایا گیا تھا اس نے بھی مثبت ردعمل ظاہر کیا (یعنی لوگوں نے اردو کا اشتہار انگریزی اخبار میں تو پڑھنا پسند کیا مگر وہ

اردو کے اخبار پڑھنا پسند نہیں کرتے)۔ گویا اردو اخبارات تجارت کے نقطۂ نظر سے بھی کم مفید ہیں ایسے میں ان کو اشتہارات کون دے گا۔ سرکاری پالیسی اور سرکاری کوٹہ کے تحت ان کو جو اشتہارات ملتے ہیں ان میں اردو اخبارات کی اپنی تاجرانہ صلاحیتوں کا کچھ بہت زیادہ عمل دخل نہیں ہوتا۔

جدید ترین ٹکنالوجی سے استفادہ کا معاملہ بھی اردو اخبارات کے مسائل میں سے ایک ہے۔ یوں تو ایسے کئی اخبارات مل جائیں گے جہاں انٹرنیٹ وغیرہ لگے ہوں مگر کیا وہ اس سے بھرپور استفادہ کر پاتے ہیں؟ میرا اپنا خیال ہے کہ شائد نہیں۔ ویسے بھی اردو کے بڑے اخبارات کم ہیں، چھوٹے زیادہ ہیں اور وہ جدید ترین ٹکنالوجی کی نعمتوں سے مستفید ہونے کی صلاحیت اپنے اندر کم پاتے ہیں۔ یعنی اردو اخبارات جدید ترین ٹکنالوجی سے حصولیابی اور ترسیل دونوں شعبوں میں کمزور ہیں۔ دیگر زبانوں کے اخبارات اگر آپ نیٹ پر دیکھ رہے ہیں اور کوئی مضمون آپ ڈاؤن لوڈ کر کے پرنٹ کرنا چاہیں تو بہت آسانی سے کر سکتے ہیں لیکن اردو اخبارات سے پرنٹ کرنے میں اتنی آسانی نہیں ہے۔ اگر آپ کے پاس وہی پروگرام نہیں ہے جو اس اخبار میں ہے تو آپ کے لئے دشواری ہوگی۔ بالخصوص نستعلیق تحریر کو پرنٹ کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ وہ گرافکس میں بدل جاتی ہے۔ گویا اردو سے متعلق تکنالوجی کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔ اس وقت کئی ملکوں میں اردو کی ویب سائٹس موجود ہیں۔ ان سے بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے، مگر اس کے لئے بھی تربیت یافتہ کارکنوں کی ضرورت ہوگی۔ جدید ٹکنالوجی سے عدم استفادہ کا ایک سبب معلومات کی کمی بھی ہے۔ معلومات کی کمی سرمایہ کی کمی سے جڑی ہوئی ہے اور سرمایہ کی کمی اردو زبان کی زوال پذیری سے وابستہ ہے۔

اردو اخبارات میں اسٹاف کی بھی کمی رہتی ہے اور مالک و مدیر حسب ضرورت اسٹاف نہیں رکھ پاتے۔ یا رکھتے ہیں تو ان کو معقول معاوضہ نہیں دے پاتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ آج کی برق رفتار زندگی کا ساتھ دینے کے لئے تربیت یافتہ رپورٹرس اور نمائندے رکھے جائیں۔ ابھی گذشتہ دنوں دہلی کے دو سنیما ہالوں میں بم دھماکے ہوئے۔ روزنامہ قومی آواز کے ایک رپورٹر نے فائر آفس فون کر کے معلومات حاصل کرنی چاہیں تو فائر آفیسر نے برجستہ جواب دیا کہ ہم سے کیا

پوچھتے ہیں جائے واردات پر جائیے۔ آپ کے یہاں رپورٹر نہیں ہیں کیا؟

آنجہانی وزیراعظم راجیو گاندھی نے خبر رساں ایجنسی یو۔این۔آئی کے اردو یونٹ کا خواب دیکھا تھا اور دوسرے سابق وزیراعظم نرسمہا راؤ نے اس خواب کو عملی جامہ پہنایا، جس کے نتیجے میں آج ملک بھر کے کم و بیش پچاس اردو اخبارات یو۔این۔آئی اردو سے استفادہ کر رہے ہیں۔ حکومت نے یو۔این۔آئی اردو کی مشین لگانے کے لئے اردو کونسل کے ذریعے سبسڈی دی ہے۔ صرف نصف چارج اخبارات کو ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس کے باوجود متعدد اردو اخبارات نصف معاوضہ بھی ادا نہیں کر پاتے۔ جبکہ اس سروس کا سب سے زیادہ فائدہ چھوٹے اخبارات ہی اٹھاتے ہیں۔ حالانکہ یو۔این۔آئی اردو سروس بھی انٹرنیٹ کے دور کی تیز رفتار بھاگ دوڑ کا پوری طرح ساتھ نہیں دے پاتی، لیکن پھر بھی اس نے اردو اخبارات کو بڑی حد تک سنبھال رکھا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ انگریزی کی مشینیں بھی لگائی جائیں اور ان سے بھرپور استفادہ بھی کیا جائے۔ بامحاورہ ترجمہ کی صلاحیت والے مترجمین رکھے جائیں اور ان کو پہلے اس کی تربیت دی جائے۔

اردو اخبارات کا ایک مسئلہ لیٹ نائیٹ شفٹ کا بھی ہے۔ بہت کم اخبارات ایسے ہیں جو نو دس بجے کے بعد کی خبریں لیتے ہیں۔ بیشتر اخبارات میں لیٹ نائیٹ شفٹ کا تصور ہی نہیں ہے، جس کی وجہ سے رات میں نو دس بجے کے بعد کے واقعات ان میں نظر نہیں آتے۔ روزنامہ قومی آواز میں پہلے صبح کے تین بجے تک شفٹ ہوا کرتی تھی۔ مگر اب وہاں بھی ایک بجے تک یا زیادہ سے زیادہ دو بجے تک اردو مشین پر آئی ہوئی خبریں لی جاتی ہیں۔

میں یہاں اردو اخبارات میں چلی آرہی ایک ناپسندیدہ روایت کا بھی ذکر کرنا چاہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ ایڈیٹر حضرات صحافیوں کی کوئی سکنڈ لائن نہیں بناتے۔ وہ ماتحت صحافیوں کو Promote نہیں کرتے۔ تمام تر شعبے اپنے ہاتھوں میں رکھتے ہیں اور مدیر ہونے کی حیثیت سے زیادہ تر فائدہ خود ہی اٹھانا چاہتے ہیں۔ ادبی جریدہ بیسویں صدی کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ جب خوشتر گرامی اس کے ایڈیٹر ہوا کرتے تھے تو انھوں نے لاتعداد ادباء و شعراء کو Promote کیا اور بیسویں صدی کی سرپرستی کے طفیل میں انتہائی بلند قامت شاعروں اور افسانہ نگاروں کی کھیپ در کھیپ تیار ہوگئی۔ اگر اردو

اخبارات کے مدیر بھی یہ روش اختیار کریں تو اردو اخبارات کو کافی فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

اردو مدیر دو طرح کے ہوتے ہیں۔ایک تعلیم یافتہ اور دوسرے کم تعلیم یافتہ یا ناخواندہ یا اردو سے بالکل ہی نابلد۔ دوسری قبیل کے مدیر چونکہ دوسری اور بالخصوص خفیہ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں لہٰذا وہ اپنے اخبار سے زیادہ مالی فائدہ اٹھاتے ہیں۔۱۹۹۰ کے آس پاس دہلی سے ایک اردو ہفت روزہ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ شائع ہوا تھا۔ وہ روزنامہ اخبار کے سائز پر نکلتا تھا۔ انہی دنوں عراق امریکہ جنگ چھڑ گئی تھی اور اس اخبار نے جذباتیت کا سہارا لے کر اردو صحافت میں ایک طوفان برپا کر دیا۔اس وقت اس کی اشاعت ایک لاکھ کے آس پاس پہنچ گئی تھی۔ میں جو بات بتانے جا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ اس کے مدیر اردو سے بالکل ہی کورے تھے۔صرف موٹی موٹی سرخیاں اٹک اٹک کر پڑھ سکتے تھے۔لکھنا ایک حرف بھی نہیں جانتے تھے۔ میں بھی اس اخبار سے وابستہ تھا اور ہم لوگ مضمون لکھ لینے کے بعد بآواز بلند پڑھ کر سناتے تھے اور مدیر محترم اس میں زبانی اصلاح کیا کرتے تھے۔ایسے ایڈیٹر بذات خود اردو صحافت کے لئے مسئلہ ہیں۔

اردو صحافت کا ایک مسئلہ تربیت کا بھی ہے۔آج اردو صحافیوں کو تربیت دینے کا جے این یو، دہلی یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی کے شعبہ صحافت کو چھوڑ کر کوئی مرکز یا انسٹی ٹیوٹ نہیں ہے جہاں سے وہ سیکھ کر نکلیں اور پھر اردو اخبارات میں کام کریں۔خاص طور پر کام کرنے والے صحافیوں کی تربیت کا کوئی مرکز نہیں ہے۔ اگر صحافیوں کو تربیت دینے والا کوئی سرکاری ادارہ نہیں ہے تو پرائیویٹ ادارہ ہی بنایا جانا چاہئے۔

سوال یہ ہے کہ ان مسائل کا حل کیا ہے اور اردو صحافت کو لاحق ان امراض کا علاج کیا ہے؟ بنیادی بات یہ ہے کہ اب وہ زمانہ لد گیا جب اردو صحافت مشن ہوا کرتی تھی۔مشن کا انجام ہم بھگت رہے ہیں۔ہمیں اپنی یہ ذہنیت بدلنی ہوگی اور اردو صحافت کی پیشانی پر چسپاں مشن کا پرکشش لیبل کھرچ کر پھینکنا ہوگا اور وہاں بزنس کا لیبل چسپاں کرنا ہوگا۔اسے تجارتی نقطۂ نظر سے مفید اور کارآمد بنانا ہوگا۔اس میں پیشہ ورانہ تبدیلیاں لانی ہوں گی اور اسے منافع بخش صحافت بنانا ہوگا۔ اردو صحافت کی مشینری کے فرسودہ پرزے بدلنے ہوں گے اور اس میں جدید ترین پرزے اور

آلات فٹ کرنے ہوں گے۔ اب یہ نہیں چلے گا کہ صحافت مالکوں اور مدیروں کے لئے تو بزنس ہو اور کارکنوں کے لئے مشن ہو۔ دن بھر سخت محنت و مشقت کرنے کے بعد شام کے وقت صحافیوں کو جزاک اللہ کہہ کر رخصت کر دیا جائے اور اگر کارکن اپنی محنت کا کچھ معاوضہ مانگیں تو یہ کہہ کر زبان بند کرا دی جائے کہ آپ اردو کی خدمت کر رہے ہیں۔ اب اردو صحافت کو خدمت نہیں راست تجارت بنانے کی ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ یا تو کوآپریٹیو بنیاد پر ایسے ادارے قائم کئے جائیں جو اردو صحافت کی کفالت کر سکیں یا پھر شیئرز کی بنیاد پر صحافت کی گاڑی کو تجارت کی پٹری پر ڈالا جائے۔ ساتھ ہی ان مالکوں اور مدیروں کی ذہنیت بدلی جائے جو خود تو آم کھاتے ہیں مگر کارکنوں کو چھلکے اور گٹھلیاں بھی دینا گوارا نہیں کرتے۔

اب سوال یہ ہے کہ اردو اخبارات اپنی کمیونٹی کے لئے کیا کر سکتے ہیں اور اس کی ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کیا کچھ خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ سب سے پہلے تو اس کی وضاحت ہونی چاہئے کہ کمیونٹی سے کیا مراد ہے۔ اردو کمیونٹی یا مسلم کمیونٹی۔ عموماً مسلم کمیونٹی ہی اردو کمیونٹی ہے۔ لہٰذا اخبارات کو چاہئے کہ وہ اس کمیونٹی کی امنگوں، آرزوؤں اور خواہشوں کی غیر جذباتی نمائندگی کریں۔ اس کمیونٹی کی امنگیں کیا ہیں؟ باعزت زندگی، مذہب کا تحفظ اور روزگار کی گارنٹی وغیرہ۔ اس سلسلے میں اردو اخبارات اہم رول ادا کر سکتے ہیں۔ اگر یہ چاہیں تو اپنی آواز میں تاثیر پیدا کر سکتے ہیں۔ گوانٹانامو بے میں قرآن شریف کی بے حرمتی کے واقعہ پر پوری دنیا کے مسلمانوں اور اردو اخبارات نے بیک آواز احتجاج کیا۔ گویا مذہب کے معاملے میں تمام سرحدیں منہدم ہو جاتی ہیں اور پوری دنیا کی مسلم کمیونٹی ایک ہو جاتی ہے۔ اردو اخبارات اس صورت حال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس کمیونٹی کو ایجوکیٹ بھی کر سکتے ہیں۔ مجموعی طور پر اردو اخبارات کسی حد تک رو بہ زوال کمیونٹی کے رو بہ زوال اخبارات ہیں۔ دونوں کو ایک دوسرے کے مسائل اور ضرورتوں کو سمجھنا ہوگا اور انھیں حل کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کرنی ہوگی۔ جب تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے دونوں کے مسائل حل نہیں ہوں گے، خاص طور پر اردو صحافت کے مسائل۔

قصہ درد سناتے ہیں کہ......

صحافی تو صحافی ہوتا ہے خواہ وہ کسی بھی زبان سے وابستہ کیوں نہ ہو۔ زبان کی بنیاد پر صحافیوں کے مقام کی نہ تو زمرہ بندی کی جانی چاہئے اور نہ ہی کسی ایک زبان کے صحافیوں کو دوسری زبان کے صحافیوں پر فوقیت اور برتری دی جانی چاہئے، کیونکہ بہر حال ہر زبان کا سچا اور حق پرست صحافی اپنی ڈیوٹی انجام دیتا ہے اور صحافت کے اصولوں اور قواعد کو اپنا رہنما بنائے رکھتا ہے۔ طالع آزما، مفاد پرست، خودغرض اور صحافتی قدروں کو پامال اور ملیامیٹ کرنے والے صحافی ہر زبان میں مل جائیں گے۔ کسی میں کم تو کسی میں زیادہ۔

لیکن اردو صحافیوں کی یہ بڑی بدنصیبی ہے کہ خود اردو والے ہی ان کو قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے اور انگریزی، ہندی اور دیگر زبانوں کے صحافیوں کے مقابلے میں ان کو کمزور اور بے صلاحیت سمجھنے کی غلطی کرتے ہیں جب کہ سچائی یہ ہے کہ صحافتی صلاحیتوں کے معاملے میں اردو کے صحافی دیگر زبانوں کے صحافیوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہیں۔ اردو ادارے بھی اپنی زبان کے صحافیوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور اگر جائز اسباب کی بنا پر کوئی اخبار نسبتاً کمزور نظر آتا ہے تو وجوہات کی تلاش و جستجو کے بجائے بے جا تنقید اور تنقیص شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ اگر دیکھا جائے تو دو شعبے ایسے ہیں جن کی بدولت اردو بحیثیت زبان زندہ ہے اور ان میں ایک شعبہ اردو اخبارات و رسائل یا اردو صحافت کا ہے۔ دوسرا شعبہ اسلامی مکاتب و مدارس کا ہے جہاں ابتدائی اور پرائمری سطح پر ہی اردو کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے اور جب تک یہ دونوں شعبے قائم ہیں اردو کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا خواب کسی بھی قیمت پر شرمندہ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

اسلامی مکاتب و مدارس سے نکلے طلباء آگے چل کر کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں اور وہیں وہ اردو اسکالر اور پروفیسر بنتے ہیں۔ (پہلے ایسا کم ہوتا تھا مگر اب زیادہ تر ایسا ہی ہو رہا ہے کیونکہ سرکاری اسکولوں اور گھروں سے اردو تقریباً ختم ہوتی جا رہی ہے)انہی لوگوں میں سے کچھ اردو اخبارات کی راہ پکڑ لیتے ہیں۔ استاذ کی حیثیت سے تقرر نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہونے والے اردو اسٹوڈینٹس کی زندگی کی گاڑی خوشحالی کی پٹری پر دوڑنے لگتی ہے جبکہ اردو صحافت کے بطور پیشہ اختیار کرنے والے مصائب و مشکلات کے دلدل میں کس طرح دھنستے چلے جاتے ہیں، اس پر ایک اردو صحافی ہی روشنی ڈال سکتا ہے۔ لیکن قربان جایئے اردو اداروں اور اکیڈمیوں کی ''کرم فرمائیوں'' پر کہ انہیں اردو صحافیوں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اردو اخبارات و رسائل میں اپنی خبریں اور نگارشات چھپوانے کے مشتاق اس طبقہ کو کبھی یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ اردو صحافیوں کے مسائل پر نظر کرم کرے اور ان کو حل کرنے کے لیے کوئی لائحہ عمل ترتیب دے یا اس سلسلہ میں متعلقہ سرکاری اداروں اور اخبارات و رسائل کے مالکوں اور مدیروں سے رجوع کرے۔

پچھلے دنوں دہلی اردو اکیڈمی کو اردو صحافیوں پر آخر ترس آ ہی گیا۔ اس نے دوسری بار اردو زبان کے ان سپاہیوں کو یاد کرنے کی رسم ادائی کر ڈالی جنہوں نے زبان کے محاذ جنگ پر اپنا سب کچھ قربان کر کے اردو کی لٹتی پٹتی آبرو کو بچایا ہے اور ان سپاہیوں کی نئی نسل آج بھی اس محاذ پر پورے دم خم کے ساتھ نہ صرف ڈٹی ہوئی ہے بلکہ اپنا خون جگر پلا پلا کر اس زبان کو مرنے سے بچانے کی انتھک کوشش بھی کر رہی ہے۔

اردو صحافیوں کی یہ برادری صحافت سمینار کرنے پر اردو اکیڈمی کے ارباب بست و کشاد کی احسان مند ہے۔ اس سمینار میں بہت سے لوگوں نے جن میں صحافی حضرات بھی تھے، اپنے مقالے پڑھے اور اردو اخبارات کے ملک گیر گوشوں پر روشنی ڈالی۔ اردو اخبارات کے ملک گیر سرکولیشن کا ڈاٹا پیش کیا گیا، ریاست وار اخباروں کی اشاعت بتائی گئی، پرنٹ میڈیا کی جدید کاری کے خدو خال ابھارے گئے ،اردو اخبارات کا معیار طے کیے جانے کی بات کی گئی

،اخبارارت کو درپیش مالی مشکلات کا احاطہ کیا گیا،ان کی خریداری اور اشتہارات میں تیزی سے آتے زوال کو ختم کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ چند اچھے مقالے بھی پڑھے گئے اور کچھ مقالے محض رسماً پیش کیے گئے۔

آج اردو صحافت زوال پذیر ہے وہ بے شمار مسائل کے گرداب میں ہے اور دشواریوں کے سیلاب بلاخیز میں تنکے کی مانند بہی چلی جارہی ہے۔ بلاشبہ اردو اخبارات کی فروخت اب بہت حد تک کم ہوگئی ہے اور سرکاری اشتہارات بھی صرف انہی اخبارات کے کشکول کا مقدر بننے لگے ہیں جو سرکاری دربار کی حاشیہ برداری کے فن میں طاق ہوں۔ خود دار، غیرت مند، دیانت دار اور اصولوں کی خاطر مر مٹنے والا صحافی کل بھی محتاجوں کی لائن میں کھڑا تھا اور آج بھی اس سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔

اس دوروزہ سمینار میں ایک بات بار بار کھٹکتی رہی اور ذہن ودل میں نشتر لگاتی رہی کہ مدیرانِ اخبار اور مقالہ نگارانِ سمینار اردو صحافت کو درپیش مسائل کو اجاگر تو کرتے ہیں مگر وہ ان لوگوں کی بات کیوں نہیں کرتے جن کو کارکن صحافی یا ورکنگ جرنلسٹ کہا جاتا ہے۔ان کے مسائل کیوں نہیں اٹھائے جاتے جو سب ایڈیٹر کی حیثیت سے اپنی پوری زندگی گزار دیتے ہیں اور پل پل جیتے اور پل پل مرتے ہیں۔ یہ اردو صحافت کا اصل محروم طبقہ ہے لیکن اس کی محرومیاں نہ تو گنائی جاتی ہیں اور نہ ہی ان کو دور کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اس طبقہ کو انگریزی میں ''گھوسٹ رائٹر'' کہتے ہیں یہ اداریہ بھی لکھتا ہے، مضمون بھی لکھتا ہے، ترجمہ بھی کرتا ہے، پروف ریڈنگ بھی کرتا ہے اور اگر چھوٹے اخبار میں ہے تو بسا اوقات پوسٹنگ بھی کرتا ہے اور اشتہارات کے لیے بھاگ دوڑ بھی کرتا ہے۔ اگر اخبار کا ایڈیٹر جو عام طور پر مالک ہی ہوتا ہے، شہر یا ملک سے باہر ہے تو جب تک اس کی واپسی نہیں ہو جاتی دفتر ہی میں اس کا بستر لگ جاتا ہے اور وہ سب ایڈیٹر کے ساتھ ساتھ ایڈیٹر اور پرنٹر و پبلیشر کے فرائض بھی انجام دینے لگتا ہے۔لیکن ان صحافیوں کے مسائل پر غور کرنے کے لیے نہ تو سمینار ہوتا ہے اور نہ کانفرنس ہوتی ہے، نہ کوئی نشست برپا کی جاتی ہے اور نہ ہی کسی مالک یا مدیر کو اس سے کوئی

دلچسپی ہوتی ہے۔ اگر ملک کے دو تین بڑے اخبارات کو اس زمرے سے الگ کر دیا جائے تو ان کارکن صحافیوں کی نہ تو کوئی یونین ہے نہ انجمن ہے اور نہ کوئی ایسا پلیٹ فارم ہے جہاں سے ان کی آواز بلند کی جاسکے۔ اخبارت ورسائل کی ترقی کی بات بڑے شد ومد کے ساتھ کی جاتی ہے لیکن کیا کسی نے اس پہلو پر بھی غور کیا ہے کہ اس طبقہ کو نظر انداز کر کے کیا اردو صحافت ترقی کی منزلیں طے کرسکتی ہے۔

اردو اخبارات میں عموماً اخبار کا مالک ہی اخبار کا ایڈیٹر بھی ہوتا ہے اور پرنٹ لائن میں ایڈیٹر کی حیثیت سے اس کا نام بھی چھپتا ہے۔ سب ایڈیٹر اپنا خونِ جگر نچوڑ نچوڑ کر اخبار کی پالیسی کی خار دار راہداریوں سے گزر کر اور ذہن ودماغ میں مالک ومدیر کے غیظ وغضب کا دھڑکا لیے ہوئے اداریے، مضامین اور رپورٹیں قلم بند کرتا ہے اور جب اخبار چھپ کر مارکیٹ میں آتا ہے تو ستائشوں کے سارے پھول مدیر نما مالکوں کے آنگن میں برستے ہیں اور اردو اخبار کی کامیابی کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے اور اکیڈمیوں کے ایوارڈ بھی اسی کے کشکول کی زینت بن جاتے ہیں۔ در اصل یہ برقعہ پوش ایڈیٹر ہوتے ہیں، جن کے وجود کا نقش اخبار کے صفحات پر تو کہیں نظر نہیں آتا مگر سرکاری دربار میں ان کے علاوہ اور کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ البتہ بعض ایسے حساس مدیر ضرور مل جائیں گے جو اپنے کارکن صحافیوں کے درد کو سمجھتے ہوں مگر ان کی تعداد کا شمار کرنا ہو تو ایک ہاتھ کی انگلیاں بھی فاضل پڑ جائیں۔

اردو کے ایک بزرگ صحافی نے جنہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی ایام کلکتہ میں اخباروں کے دفاتر میں گزار دیے، اس سمینار میں اپنا مقالہ پڑھا تھا، ایک روز برسبیل تذکرہ کہنے لگے کہ ''اردو صحافیوں کی نئی نسل کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے کہ اردو صحافت کی خدمت کرتے کرتے ہم لوگ موم بتی کی طرح جل گئے۔'' ان کا یہ جملہ بلاشبہ کلیجے میں تیر کی طرح لگنے والا ہے اور ان کی اس بات پر یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ بھی نہیں ہے، لیکن اگر میں یہ کہوں تو شاید ان کو اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی یقین نہ آئے کہ اردو کا کارکن صحافی آج بھی موم بتی کی طرح جل رہا ہے اور سسک سسک کر جی رہا ہے۔ (ایسے بہت سارے لوگ ہیں جن کے نام گنائے جاسکتے ہیں)۔

انہی بزرگ صحافی کا دوسرا جملہ یہ بھی تھا کہ ''چالیس روپے سے میری تنخواہ شروع ہوئی اور ۳۰ سال تک خدمت انجام دینے کے بعد ۲۷۰ روپے ماہانہ میری معراج تھی۔'' اگر میں یہ کہوں کہ آج بھی اسی شرح سے مشاہرے مل رہے ہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ اگر تنخواہوں میں اضافہ ہوا ہے تو مہنگائی بھی سیکڑوں گنا بڑھ گئی ہے اور انسانی ضرورتوں نے بھی اپنا دامن وسیع کرلیا ہے۔ آج کچھ اخبار ایسے ضرور ہیں جہاں مشاہرہ قدرے بہتر ہے مگر آٹھ گھنٹے اور بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی بھی انجام دینی پڑتی ہے اور بندشوں اور پابندیوں کا تکلیف دہ کمبل بھی اوڑھے رہنا پڑتا ہے۔ ان اخبارت کے کارکن صحافی اگر کمبل کو خود سے الگ کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے، کیونکہ اس صورت میں ان کو سڑک پر آجانے کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔

اردو کی اہم اور قابل ذکر ویب سائٹس

ذرائع ابلاغ میں اب اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ بھی شامل ہو گیا ہے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے آپ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پوری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔ آج انٹرنیٹ کی شاہراہ اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ آپ کوئی بھی چیز تلاش کریں وہ انٹرنیٹ پر مل جائے گی۔ یہ شاہراہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ ہمارے بیڈ روم سے بھی گزر رہی ہے۔

اس وقت دنیا بھر میں جہاں بہت سی چیزیں انٹرنیٹ پر ڈالی جا رہی ہیں وہیں اردو بھی آن لائن ہو گئی ہے اور دنیا بھر میں موجود اردو کے دیوانے الگ الگ ویب سائٹ بنا کر اردو سے متعلق معلومات اور اطلاعات انٹرنیٹ پر ڈال رہے ہیں۔ ایک اطلاع کے مطابق دنیا بھر میں اردو کی کئی سو ویب سائٹ موجود ہیں اور کمپیوٹر اسکرین پر ان کی آئی ڈی ٹائپ کر کے وہاں تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔

اردو ویب سائٹ میں بہت تنوع ہے۔ وہاں آپ کو صرف شاعری ہی نہیں ملے گی بلکہ ڈکشنری جیسی معلومات افزاء چیزیں بھی موجود ہیں۔ شعراء، ادباء اور قلمکاروں کی ڈائرکٹری موجود ہے جس کی مدد سے آپ انٹرنیٹ پر موجود شعراء کے بارے میں تفصیلات حاصل کر سکتے ہیں۔ ہندوستانی شعراء وادباء کے بارے میں جان سکتے ہیں، پاکستانی شعراء وادباء کے بارے میں جان سکتے ہیں اور دیگر ملکوں کے اردو قلمکاروں سے آپ واقف ہو سکتے ہیں۔ آپ کو مشاعرہ سے دلچسپی ہے تو آپ مشاعرہ کی ویب سائٹ پر چلے جائیے اور اپنے پسندیدہ شاعر کا کلام اسی کی آواز میں، جو اس نے مشاعرہ میں پڑھا ہے، سن لیجئے۔ موجودہ شعراء کی ویب سائٹ بھی موجود ہے اور علامہ اقبال و فیض احمد فیض جیسے مرحوم شعراء بھی انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ انٹرنیٹ پر ایک اردو الیکٹرانک

لائبریری میگزین بھی ہے اور اردو اخبارات بھی آن لائن ہیں۔ ہندوستان، پاکستان اور دیگر ملکوں کے اخبارات آپ انٹرنیٹ پر پڑھ سکتے ہیں۔ گویا پورا جہانِ اردو انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ اگر انٹر نیٹ پر موجود اردو مواد کو یکجا کر کے شائع کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لئے لاکھوں صفحات درکار ہوں گے۔ اب تو اردو کے رسالے بھی آن لائن ہو گئے ہیں اور اردو ستان ڈاٹ کام پر اردو کا مکمل مزاحیہ ناول بھی موجود ہے۔ جس تیزی کے ساتھ اردو دوست حضرات اردو سے متعلق تفصیلات انٹرنیٹ پر ڈال رہے ہیں، اگر یہی سلسلہ جاری رہا تو بہت جلد پوری اردو دنیا آن لائن ہو جائے گی اور آپ کو کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ آپ کو جو چیز چاہئے وہ انٹرنیٹ سے حاصل کر لیجئے۔

یہاں اردو کی بعض اہم ویب سائٹ کی تفصیلات پیش کی جا رہی ہیں۔ اس کے لئے ہم نے سب سے پہلے آن لائن ہونے والے اردو رسالہ جدید ادب سے استفادہ کیا ہے۔ یہ پہلے پاکستان سے شائع ہوتا تھا اب جرمنی سے شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مدیر حیدر قریشی ہیں۔ جدید ادب میں نذر خلیق (پاکستان) نے بعض اہم ویب سائٹ کی تفصیلات قسط وار شائع کی ہیں۔ اس کے علاوہ انٹرنیٹ کی مدد سے ہم نے مزید اردو ویب سائٹ کی آئی ڈی حاصل کی ہے۔ اس مضمون کے آخر میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

کتاب کی اپنی اہمیت ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اس کمپیوٹر ٹیکنالوجی کے دور میں انٹرنیٹ پر ویب سائٹ کے قیام کے بعد اور الیکٹرانک بکس (سی ڈی) کے اجراء کے بعد انٹرنیٹ پر ویب سائٹ کے قارئین کا ایک بہت بڑا حلقہ پیدا ہو چکا ہے۔ کمپیوٹر سے منسلک افراد کا رجحان سی ڈی بکس کی طرف بڑھتا جا رہا ہے۔ آئزک عظیموف جیسے افسانہ نگار نے اپنی ۱۹۵۷ء کے زمانے کی ایک اہم کہانی The Fun They Had میں، یعنی کمپیوٹر کے ابتدائی ایام ہی میں نہ صرف اس کی افادیت کا احساس دلایا تھا بلکہ آنے والے وقت میں کتاب کو کمپیوٹر سے پیش آنے والے مسائل کی نشاندہی بھی کی تھی۔

بہر حال اس وقت اس بحث سے غرض نہیں ہے کہ کتاب اور انٹرنیٹ میں کس کی اہمیت زیادہ

ہے۔ دونوں ہی علم کے حصول کے اچھے ذرائع ہیں۔ کتاب سے ہماری صدیوں کی رفاقت ہے اور کمپیوٹر تو ابھی نومولود ہے اور اس سے ہماری دوستی کی عمر بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ کمپیوٹر کی ہے۔ اردو دنیا عام صورت حال کے مطابق جیسے دیگر جدید علوم میں مغربی دنیا سے کافی پیچھے ہے، انٹرنیٹ کے معاملے میں اتنی پیچھے نہیں ہے۔ مختصر سے وقت میں اردو سے دلچسپی اور محبت رکھنے والے افراد کی ایک بڑی تعداد نے اردو ویب سائٹ کو قائم کر کے اردو کی ایک نئی دنیا بسا دی ہے۔ چونکہ ہمارے یہاں ابھی تک اردو رسائل و کتب کے قارئین اور انٹرنیٹ کے قارئین کے درمیان مربوط رابطہ کی کوئی صورت نہیں بن سکی ہے، اس لئے میں ادبی دنیا کے تمام قارئین اور لکھنے والوں کو نہ صرف اردو کی اہم ویب سائٹ سے متعارف کرانا چاہتا ہوں بلکہ انہیں ان کی تخلیقات کے ساتھ ویب سائٹ تک پہنچانے میں بھی مؤثر کام کرنا چاہتا ہوں۔ اس لئے چند ویب سائٹ کا تعارف کرا دینا ضروری سمجھتا ہوں۔

www.urdudost.com ہندوستان کے صوبہ مغربی بنگال کے شہر ۲۴ پرگنہ میں یہ ویب سائٹ قائم ہے۔ اس میں عام قارئین کی تفریح کے لئے عوامی دلچسپی کے کئی سلسلے بھی ہیں، لیکن اس کی ادبی طور پر سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ یہ ویب سائٹ ایک وقت میں چار ادبی رسائل باقاعدگی کے ساتھ پیش کر رہی ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور اہم ادبی رسالہ ''کائنات'' ہے جو گذشتہ چار برسوں سے باقاعدگی سے بطور ماہانہ جاری ہے۔ اس ادبی ماہنامہ کو پہلے ہر مہینے کے بعد تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح پرانے شمارے انٹرنیٹ پر نہیں مل سکتے تھے لیکن اب اس کے مدیر نے آئندہ ہر سابقہ شمارے کو مستقل طور پر انٹرنیٹ پر رکھنے کا اعلان کیا ہے اور اگست ۲۰۰۳ء سے سابقہ شمارے وہاں فائل میں موجود ہیں اور انہوں نے سابقہ تمام شماروں کو بھی پھر سے آن لائن کرنے کا اعلان کیا ہے۔ اس کے دوش بدوش اس ویب سائٹ کی جانب سے یہ اعلان کیا جا چکا ہے کہ ہر تین شماروں کو یکجا کر کے کتابی صورت میں پیش کیا جائے گا۔ اس عمل سے لازمی طور پر کتاب اور انٹرنیٹ کا باہمی تعلق بہتر اور مضبوط ہوگا۔ اردو دوست ڈاٹ کام کی جانب سے مزید ''اردو ورلڈ'' ادبی خبرنامہ اور ''ادبی البم'' ادیبوں کی تصاویر پر مشتمل تصویری ماہنامہ دو رسالے

با قاعدگی سے چھپ رہے ہیں۔اسی ویب سائٹ کا چوتھا رسالہ سہ ماہی ''اردو ماہیا'' ہے جو صرف ماہیے کی صنف پر مشتمل رسالہ ہے اور گذشتہ تین سال سے با قاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ پہلا سوا سال مکمل ہونے پر اس کے پانچ شمارے کتابی صورت میں شائع کئے گئے تھے اور اب پانچ شماروں کی سی ڈی بھی ریلیز کی گئی ہے۔ان سارے امور کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے اردو دوست ڈاٹ کام کے پاس دنیا بھر میں پھیلے ہوئے دوستوں کی ٹیم ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس سارے اہم کام کا سارا بوجھ بنیادی طور پر خورشید اقبال نے اٹھایا ہوا ہے۔ان کی محنت اور لگن کے باعث ایسا ممکن ہو سکا کہ شمالی ۲۴ پرگنہ میں بیٹھ کر وہ اتنے عرصے سے اتنا اہم کام نہایت خاموشی کے ساتھ اور اردو کی خدمت کے جذبے کے ساتھ کئے چلے جا رہے ہیں۔اس سائٹ پر مذکورہ چیزوں کے علاوہ اردو ادبی کوئز،مباحثہ،اردو بک شاپ،اردو وال پیپر،اردو اسکرین سیوئر،اسلام،اردو ویب ڈائرکٹری (اس پر بعض اردو ویب سائٹ بھی موجود ہیں) وغیرہ متعدد شعبے موجود ہیں۔

www.urdustan.com اس ویب سائٹ کو امریکہ میں ایک اردو دوست کاشف الہدیٰ نے قائم کیا ہے۔اس سائٹ کا زیادہ تر کام صحافتی سطح پر ہو رہا ہے یا پھر اردو بولنے والوں کے لئے محفل سجائی جاتی ہے،لیکن اس ویب سائٹ کا کمال یہ ہے کہ اس وقت انٹرنیٹ پر جتنی چھوٹی بڑی ویب سائٹ ہیں ان میں سے اسے سب سے پہلی ویب سائٹ ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ایسے وقت میں جب انٹرنیٹ پر رومن اردو کو رائج کیا جا رہا تھا،اردو رسم الخط میں اردو کی ویب سائٹ قائم کر دینا اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔اردوستان سے پہلے ایک اور صاحب عمران خان نے اردو رسم الخط کی ویب سائٹ بنائی تھے۔اردو ویب ڈاٹ کام کے نام سے اردو فونٹ کے ساتھ پہلی ویب سائٹ ۱۹۹۷ میں بنی تھی جو جلد ہی بند ہو گئی۔اس کے ایک ماہ کے وقفہ سے اردو ستان قائم ہوئی۔وہ سائٹ چند ماہ کے بعد بند ہو گئی اور اب تاریخی اعتبار سے اردوستان ڈاٹ کام اردو کی موجودہ ویب سائٹ میں سب سے پہلی ویب سائٹ ہے۔ادبی طور پر اس ویب سائٹ پر ہر ماہ ایک اہم نظم کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے۔اردو ماہیا کا ایک سیکشن بھی سائٹ پر قائم ہے۔تاہم اس ویب سائٹ کا بنیادی مقصد ادب سے زیادہ اردو زبان کے ساتھ قارئین کو جوڑے رکھنا

ہے۔اسی حوالے سے اس ویب سائٹ نے اپنے محدود وسائل میں پندرہ روزہ ریڈیو کا اجراء بھی کیا ہے جسے اسی سائٹ پر سنا جا سکتا ہے۔اردوستان پر دینی مضامین اور سماجی حوالے سے اہم میٹر بھی موجود ہے۔اس کے ڈسکشن فورم میں اردو سے منسلک اردوستانیوں کی محفلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔تاہم ادبی طور پر ان کا معیار بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔اس کے باوجود یہ بڑی بات ہے کہ کاشف الہدیٰ نے امریکہ میں رہ کر اپنے مخصوص قارئین کے ساتھ اردو کی ایک دنیا آباد رکھی ہوئی ہے۔

www.jadeedadab.com

رسالہ جدید ادب (ایڈیٹر۔حیدر قریشی)

جدید ادب پہلے دور میں خانپور (پاکستان) سے جاری ہوا تھا۔اکتوبر ۱۹۷۸ میں اس کا پہلا شمارہ شائع ہوا اور ۱۹۸۶ میں آخری شمارہ نکلا۔یہ ادبی رسالہ ۸۰ صفحات سے لے کر ۵۰۰ صفحات کی ضخامت تک کا شائع ہوا۔اس ادبی رسالہ نے بہت جلد اپنا ادبی تشخص قائم کر لیا۔۱۹۹۹ میں جدید ادب کا دوبارہ اجراء جرمنی سے ہوا۔لیکن دو شماروں کے بعد اس کی اشاعت معطل ہو گئی۔تین سال کے بعد پھر اس کا اجراء ہوا۔ابتداء میں پروگرام یہ ہے کہ ہر چھ ماہ پر اس کا شمارہ شائع کیا جائے اور کتابی صورت کے ساتھ اس کا ہر شمارہ انٹرنیٹ پر بھی آن لائن موجود رہے۔انٹرنیٹ کے اس دور میں بعض ادبی رسائل کو انٹرنیٹ پر پیش کرنے کی کاوش تو کی گئی ہے لیکن یہ کاوش جزوی پیشکش تک محدود رہی ہے۔جدید ادب پہلا ادبی رسالہ ہے جو نہ صرف کتابی صورت میں شائع ہوا بلکہ انٹرنیٹ پر بھی آن لائن دستیاب ہے۔(اب اردو دوست ڈاٹ کام کی جانب سے بھی چار رسالے آن لائن کر دئے گئے ہیں)۔

www.alqamaronline.com اسلام آباد پاکستان میں قائم کی گئی اس جنرل ویب سائٹ میں بھی زیادہ زور صحافتی پیش کش پر ہے۔تاہم اس ویب سائٹ پر اردو ادب کا خاطر خواہ اور معیاری مواد بھی مل جاتا ہے۔اس کے شعر و ادب کے سیکشن میں شاعری،افسانوں، خاکوں، تحقیقی مضامین ،ادبی انٹرویو وغیرہ کا بہت سا معیاری میٹر موجود ہے۔اس سیکشن میں ابھی بہت سے اضافوں کی ضرورت ہے۔اس ویب سائٹ کو اسلام آباد کے نوجوان جرنلسٹ ہارون عباس

نے قائم کیا ہے اور انہی کی ہمت سے یہ سائٹ عمدگی سے اپنا کام کر رہی ہے۔

www.urduclassic.com کراچی سے محمد حسین کی قائم کردہ یہ ایک جنرل ویب سائٹ ہے۔ اس میں ایک سوشل میگزین کی طرح کا مواد شامل کیا گیا ہے جس سے اردو کے عام قاری کی سائٹ سے دلچسپی قائم ہوتی ہے۔ اردو کلاسک پر ایک مختصر سا سیکشن ''اردو ادب'' کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ مختصر ہونے کے باوجود یہ سیکشن اپنے انتخاب کے لحاظ سے بہت معیاری ہے۔

urdu_adab.tripod.com/urduadab/ اردو ادب ویب سائٹ کنیڈا سے فیصل فارانی کی قائم کردہ ایک مختصر لیکن خالص ادبی ویب سائٹ ہے۔ اس میں اہم شعراء اور افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا ایک اہم انتخاب دیا گیا ہے۔ فیصل فارانی کی ذاتی دلچسپی اور ادبی ذوق کے باعث یہ سائٹ معروف نہ ہونے کے باوجود ایک اہم ادبی ویب سائٹ ہے۔

www.urduword.com/home/index.cgi اردو ورڈ ڈاٹ کام اس لحاظ سے بہت کلیدی اور اہم ویب سائٹ ہے کہ اس میں انگلش اردو لغت پیش کی گئی ہے۔ آپ انگلش کا کوئی لفظ لکھ کر اس کا ترجمہ مانگیں اسی وقت آپ کو اردو نسخ رسم الخط میں اور رومن اردو میں اس کا ترجمہ مل جائے گا۔ مصطفیٰ علی نے اپنے محدود وسائل کے ساتھ یہ بہت اہم اور مفید عام لغت تیار کی ہے۔ اگر چہ اردو سے انگلش اور اردو سے اردو لغت کا اسی معیار کا کام ہونا ابھی باقی ہے تاہم انگلش اردو ڈکشنری کی حد تک یہ بہت اہم ویب سائٹ ہے۔ دوسری مطلوبہ لغات کی ویب سائٹ تیار کرنے کے لئے اس کے ماڈل سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

www.kitaabghar.com یہ اردو کی ایک بالکل نئی لیکن بہت اہم ویب سائٹ ہے۔ اس پر اردو کی کتابیں مکمل طور پر آن لائن کی جا رہی ہیں۔ کئی اہم ادباء کی کتب یہاں دستیاب ہیں اور مزید ادباء کی کتب بھی آن لائن کی جا رہی ہیں۔ اس طرح یہ اردو کتابوں کی سب سے پہلی آن لائن لائبریری بن چکی ہے۔ اس کے کرتا دھرتا کاشف الہدیٰ اور حسن علی ہیں۔ جبکہ حیدر قریشی کا تعاون بھی اس سائٹ کو حاصل ہے۔ وہ تمام شاعر اور ادیب جو اپنی کتب اس ویب سائٹ پر دینا

چاہتے ہیں براہِ راست ان تین ای میل ایڈریسز میں سے کسی پر یا سب پر رابطہ کر کے انٹرنیٹ کی دنیا میں شامل ہو سکتے ہیں۔

کاشف الہدیٰ (امریکہ) : webustaad@urdustan.com

حسن علی (لاہور) : webeditor@urdustan.com

حیدر قریشی (جرمنی) : HQG7860000@aol.com

www.urdupoint.com اردو پوائنٹ اردو کی جنرل ویب سائٹ ہے۔ اس کا زیادہ تر انداز صحافیانہ ہے، لیکن اس میں جو شعری اور دوسرا ادبی حصہ ہے، اس کا ایک بڑا حصہ ادبی اعتبار کا حامل ہے۔ جہاں تک اردو پوائنٹ کے صحافتی حصے کا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ویب سائٹ پاکستان کی انٹرنیٹ صحافت میں اپنی منفرد خصوصیات کی حامل ہے۔ لاہور کے علی چودھری اس ویب سائٹ کے کرتا دھرتا ہیں۔

sherosukhan.tripod.com کینیڈا میں مقیم سردار علی کی یہ ویب سائٹ اپنی پیش کش کے اعتبار سے بڑی جاذب نظر ہے۔ کینیڈا کی مقامی ادبی رپورٹوں سے لے کر اردو رائٹرز ایٹ یاہو گروپس کی سرگرمیوں تک کو اپنی سائٹ پر سردار علی بہت عمدگی سے پیش کرتے ہیں۔ ادبی تحریروں کے انتخاب میں انھوں نے اپنے معیار کو بتدریج بہتر بنایا ہے۔ اچھی تحریروں کو پیش کرنے میں وہ اتنا اچھا انداز اختیار کرتے ہیں کہ جن کی تحریریں وہاں سجائی جاتی ہیں وہ بھی اپنی تحریروں کے پیش کش کے انداز کو دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔

urdu_adab.tripod.com کینیڈا سے فیصل فارانی نے ایک ویب سائٹ اردو ادب کے نام سے قائم کی ہے۔ اس کے لئے انھوں نے کسی خاص معیار یا طریقہ کار کا تعین نہیں کیا۔ بس بیٹھ کر سوچا کہ اردو ادب کا ایک معیاری حصہ ویب سائٹ پر پیش کیا جائے اور پھر جو کچھ اپنے طور پر جمع کر پائے اسے سائٹ پر پیش کر دیا۔ اس لحاظ سے یہ خالصتاً ادبی ویب سائٹ ہے۔ جتنا میٹر اس ویب سائٹ پر پیش کیا گیا ہے بلاشبہ ادب کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

www.urdunet.com دہلی میں اصغر انصاری کی یہ ویب سائٹ اردو کی ایک بڑی

جنرل ویب سائٹ ہے۔اس پر سیاست اور صحافت کا رنگ غالب ہے۔اس کا ادبی دنیا کا سیکشن اپنی جگہ اردو کی ایک ادبی دنیا بسائے ہوئے ہے۔ادبی دنیا میں شاعری کی کئی اصناف کو کھپایا گیا ہے۔نثر میں افسانوں میں ناول، ڈرامہ اور دوسری اصناف کے لئے بھی جگہ بنائی گئی ہے۔ادیبوں کی ڈائرکٹری بھی زیر تکمیل ہے۔ابھی تک اس میں دوسو کے قریب شاعروں اور ادیبوں کے کوائف فراہم کئے گئے ہیں۔اگر آپ اردو ویب سائٹس کے مزید پتے چاہتے ہیں تو اس ویب سائٹ کی ڈائرکٹری پر جا کر حاصل کر سکتے ہیں۔

groups.yahoo.com/group/urdu_writers یاہو گروپس میں خالصتاً اردو کا یہ پہلا گروپ قائم کیا گیا ہے۔اس کے مالک کاشف الہدی اور ماڈریٹر حیدر قریشی ہیں۔اس پر دنیا بھر سے اردو شعرا اور ادباء اپنی اہم تخلیقات اور ادبی سرگرمیوں کی خبریں اور رپورٹیں بھیجتے ہیں۔اس سائٹ سے ریلیز کئے جانے والے میٹر سے اس وقت تین اہم ویب سائٹ اردو دوست، اردوستان اور شعروادب براہ راست استفادہ کر رہی ہیں۔یہاں ان پیج فائل سے اور گف فائل سے اردو میں خبریں اور رپورٹیں جاری کی جاتی ہیں۔اس سائبر ادبی حلقہ کی رکنیت کے حصول کے لئے اس ایڈریس پر ایک سادہ ای میل بھیج کر رکنیت حاصل کی جاسکتی ہے۔

www.urdupages.com یہ اس لحاظ سے ادبی ویب سائٹ تو نہیں ہے کہ اسے ادبی ویب سائٹ کے ذکر میں شامل کیا جائے۔لیکن جیسے اردو لغت کی ویب سائٹ کو اس حصہ میں شمار کیا جا چکا ہے اسی طرح اس سائٹ کو بھی شمار کیا جانا چاہئے۔یہ خالص ٹیکنیکل نوعیت کی ویب سائٹ ہے جہاں شرکت کرنے والوں کو اردو پروگرام کے بارے میں تربیت دی جاتی ہے۔اردو پروگرام کو فروغ دینے والی کوئی بھی اردو ویب سائٹ ایک رنگ میں ادبی خدمت ہی انجام دے رہی ہے۔انگلینڈ میں قائم عرفان نواز کی یہ ویب سائٹ اردو پروگرام سیکھنے والوں کے لئے ایک رہنما کا فریضہ انجام دے رہی ہے۔اردو پروگرام سے منسلک اردو شاعر اور ادیب کسی ٹیکنیکل مسئلہ کی صورت میں اس ویب سائٹ اردو پیجز سے رجوع کر سکتے ہیں۔

کوشش کی گئی ہے کہ ایسی ساری ویب سائٹ کا تعارف ہو جائے جو اردو کی کسی اچھے رنگ

میں خدمت کر رہی ہیں۔ بعض کا ادبی معیار کمزور تھا لیکن اردو کی خدمت کا پہلو بہتر تھا لہٰذا ان کا تعارف کرا دیا گیا ہے۔ کمزور ادبی معیار کی ویب سائٹ کو دیکھ کر مزید معیاری ادبی ویب سائٹ کا رجحان بڑھ سکے گا۔

www.urdunagar.com فرانس میں قائم اردو کی اردونگر ڈاٹ کام عاکف غنی کی فنی صلاحیتوں اور اردو سے محبت کا ثبوت ہے۔ اس سائٹ پر فرانس کی کمیونٹی نیوز کے ساتھ دنیا بھر کی دستیاب ادبی خبریں بھی شامل کی جاتی ہیں۔ ادیبوں کے انٹرویو، مضامین، کالم اور دلچسپی کے دیگر سلسلے اس سائٹ پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اگر چہ اس سائٹ پر کچھ کچا پکا مواد بھی ملتا ہے لیکن گوپی چند نارنگ، اکبر حمیدی اور حیدر قریشی جیسے ادیبوں کی تحریروں سے اس کے معیاری پہلو کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

www.urdumanzil.com دبئی میں قائم کی گئی اردو کی یہ ویب سائٹ صغیر احمد جعفری اور ان کی اہلیہ صبیحہ صبا کی اردو سے وابستگی کا مظہر ہے۔ اس سائٹ پر اردو کے کئی شعرا کا کلام پیش کرنے کے ساتھ ادیبوں کی ایک ڈائرکٹری بھی دی گئی ہے، جس میں وقتاً فوقتاً نئے اضافے کئے جاتے ہیں۔ یہ پاکستانی شعرا سے متعلق ویب سائٹ ہے۔

www.haroof.com ملتان سے مرتضیٰ اشعر نے ایک ویب سائٹ حروف ڈاٹ کام کے نام سے شروع کی ہے۔ اس سائٹ کا ادبی انتخاب نسبتاً کافی بہتر ہے۔ شاعری، افسانے اور بعض دیگر اصناف میں مرتضیٰ اشعر نے ایک معیار کو ملحوظ رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ادیبوں کے ای میل ایڈریسز پر مبنی ایک ڈائرکٹری بھی اس میں دی گئی ہے۔ پنجاب (پاکستان) سے سرائیکی بیلٹ سے اردو کی یہ پہلی ویب سائٹ قرار دی جا سکتی ہے۔ ادبی حصوں کے علاوہ اس کے بہت سے دوسرے شعبے بھی ہیں جن میں دیگر قارئین کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔

(۵)

جدید گوشہ

میڈیا کا مثبت و منفی چہرہ

ایک تازہ تناظر

جس طرح ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اچھا دوسرا برا، ایک مثبت دوسرا منفی اسی طرح میڈیا کے بھی دو پہلو ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ آج میڈیا ایک بہت طاقتور Tool بن گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جمہوریت کی عظیم الشان عمارت جن چار ستونوں پر ٹکی ہوئی ہے ان میں ایک میڈیا بھی ہے۔ ان چاروں میں سے اگر کوئی ایک بھی ستون کمزور پڑ جائے یا اس میں کجی آ جائے تو جمہوریت کی عمارت کی دیوار بھی کج ہو جاتی ہے اور اس کے کمزور ہوتے ہوتے منہدم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اس وقت یہ چوتھا ستون بہت کمزور ہو گیا ہے تو بیجا نہ ہوگا۔ باقی جو تین ستون ہیں وہ ہیں مقنّنہ، منتظمہ اور عدلیہ۔ مقنّنہ یعنی پارلیمنٹ، منتظمہ یعنی ایڈمنسٹریشن اور ہماری عدالتیں۔ ہم یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ باقی تینوں ستون بھی کمزور ہو گئے ہیں لیکن یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ حکومت کے زیر اثر ہیں۔ عدلیہ سے کچھ امیدیں وابستہ ہیں اور وہ مختلف مواقع پر یہ ثابت کرتی رہتی ہے کہ اس کی ریڑھ کی ہڈی اب بھی مضبوط ہے، گلی نہیں ہے۔

ہاں میڈیا کی ریڑھ کی ہڈی بڑی حد تک ضرور گل گئی ہے۔ اس پر حکومت اس طرح اثر انداز ہو گئی ہے یا حاوی ہو گئی ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ جیسے اس نے اس پابندی کو ہی آزادی سمجھ لیا ہے۔ خاص طور پر سماجی ایشوز اور سماجی سروکاروں کے معاملے میں الیکٹرانک میڈیا کا جو رویہ ہے وہ انتہائی افسوسناک ہے۔ لیکن ہم اس پر بعد میں آئیں گے۔ پہلے یہ دیکھ لیتے ہیں کہ کیا میڈیا کا

کوئی مثبت کیرکٹر بھی ہے یا نہیں۔ یا جو کچھ ہے وہ منفی ہی ہے۔ بے انتہا خرابیوں کے باوجود ہم یہ ضرور کہنا چاہیں گے کہ میڈیا میں اب بھی ایسے بہت سے لوگ موجود ہیں جو اس کے مثبت کردار کے محافظ ہیں اور جو میڈیا کی آبرو ہیں اور جن کی رپورٹیں اس بات کی ضامن ہیں کہ جب تک ایسے لوگ موجود رہیں گے میڈیا کا مثبت کردار بھی باقی رہے گا۔ میڈیا بہت سے معاملات میں عوام کو بیدار کرنے کا کام کرتا ہے۔ مثال کے طور پر کرونا وبا کے دوران لیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا دونوں پلیٹ فارموں پر اس سلسلے میں بہت اچھی رپورٹیں پیش کی گئیں۔ لوگوں کو باخبر کیا گیا اور ان کو حکومتوں کی جاری کردہ تدابیر کے علاوہ ڈاکٹروں کے ذریعے بتائی جانے والی ایسی تدابیر سے بھی روبرو کرایا گیا جن کو اپنا کر وہ اس ہلاکت خیز وبا سے خود کو محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

جب بھی ملک میں کوئی اہم واقعہ پیش آتا ہے تو الیکٹرانک میڈیا بہت زیادہ الرٹ ہو جاتا ہے اور اس واقعہ کے پل پل اور لمحے لمحے کی خبر سے عوام کو آگاہ کرتا رہتا ہے اور انھیں بیدار بھی کرتا ہے اور ان کی رہنمائی بھی کرتا ہے۔ اب بھی چند ایسے نیوز چینل موجود ہیں جو دوسرے نیوز چینلوں کی آپا دھاپی میں شامل نہیں ہیں اور جو اب بھی اپنے کردار کو بچائے ہوئے ہیں۔ ان چینلوں پر جذباتی ایشوز پر بحث کرانے کے بجائے تعمیری ایشوز پر گفتگو ہوتی ہے اور متعلقہ موضوع کا علم رکھنے والوں کو بلا کر ان سے بات چیت کی جاتی ہے۔ ان نیوز چینلوں پر عوام سے تعلق رکھنے والے حقیقی مسائل اٹھائے جاتے ہیں اور ان کو حل کرنے کے راستے بھی بتائے جاتے ہیں۔ ایسی صحافت کرنے والے صحافیوں کو ان کی تعمیری صحافت کی وجہ سے ایوارڈز بھی دیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر این ڈی ٹی وی انڈیا کے رویش کمار کی مثبت رپورٹنگ کی وجہ سے ان کو ایک باوقار ریمن میگسیسے ایوارڈ تفویض کیا گیا۔

اسی طرح این ڈی ٹی وی ٹوینٹی فور سیون کی سابق اینکر ندھی راز دان کو کٹھوعہ کی ایک آٹھ سالہ بچی کی عصمت دری اور قتل کے واقعہ کی مثبت اور تعمیری رپورٹنگ پر انٹرنیشنل پریس انسٹی ٹیوٹ ایوارڈ حاصل ہوا۔ ایوارڈ لینے کے موقع پر انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ واقعہ صرف ایک آٹھ سالہ بچی کے ریپ اور قتل کی کرائم اسٹوری نہیں تھی بلکہ ایک بچی کے خلاف ایک خوفناک واردات

تھی جس کے بعد ہم نے فرقہ واریت کا بھیانک چہرہ دیکھا۔ ریاستی حکومت کے بعض وزرا نے ملزموں کے حق میں نکالی جانے والی ریلیوں میں شرکت کی۔ ہم نے اس اسٹوری کو از ابتدا تا انتہا پیش کیا اور بالآخر انصاف ہوا اور کلیدی ملزموں کو جیل بھیجا گیا۔ یہ ایوارڈ ایسے وقت میں دیا گیا ہے جب میڈیا کی آزادی کو زبردست چیلنجز لاحق ہیں۔ انھوں نے اپنی تقریر میں یہ بتانے کی کوشش کی کہ اگر میڈیا کسی دباؤ کے بغیر اور مثبت انداز میں کام کرے تو اس کے بہتر نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

میں این ڈی ٹی وی ہی سے ایک اور مثال دینا چاہوں گا۔ این ڈی ٹی وی کے مالک اور سینئر انگریزی صحافی پرنے رائے ۲۰۱۷ء کے یو پی اسمبلی انتخابات کی فیلڈ کوریج کر رہے تھے۔ انھوں نے الہ آباد کے نزدیک نچلی ذات کے ہندوؤں کے ایک گاؤں کا اپنی ٹیم کے ساتھ دورہ کیا۔ وہ ایک غریب گاؤں میں پہنچے اور ایک گھر کے سامنے ایک پچیس تیس سال کی خاتون سے بات کرنے لگے۔ وہ بہت جھجک رہی تھی۔ وہ جب بھی مائک اس خاتون کے سامنے کر کے کوئی سوال کرتے تو وہیں دروازے میں کھڑی ایک کم عمر لڑکی جواب دینے لگتی۔ وہ مائک اس کے سامنے کر دیتے۔ پھر خاتون کے سامنے مائک کر کے سوال پوچھتے اور پھر وہ جھجکتی اور لڑکی فراٹے سے جواب دینے لگتی۔ جب دو تین بار ایسا ہوا تو ان کے صحافی دماغ نے تاڑ لیا کہ اس لڑکی میں کچھ بات ضرور ہے، اسی سے گفتگو کرنی چاہیے۔ وہ خاتون اس لڑکی کی بھابھی تھی۔ اب ان کی پوری توجہ اس لڑکی کی جانب مبذول ہوگئی۔ انھوں نے اس کے گھر کی اقتصادی حالت اور دیگر بہت سے معاملات پر اس سے گفتگو کی۔ وہ کھل کر بات کرتی رہی۔ پھر اس نے اپنی غریبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ہم لوگ بڑے لوگوں کے کھیت کاٹتے ہیں (یعنی فصل کاٹتے ہیں) تو کچھ پیسے مل جاتے ہیں اور گزارہ چل جاتا ہے۔ لیکن اب جانور اتنے زیادہ ہو گئے ہیں کہ وہی کھیت چر لیتے ہیں ہم لوگوں کو کاٹنے کو اب کوئی نہیں دیتا۔ اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ اب ہم لوگ بھی جانور بن جائیں تو کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔ اس کے بعد لڑکی نے کہا کہ وہ اب کھیت میں جائے گی اور وہاں سے بورے میں بھوسہ بھر کر لائے گی۔ پرنے رائے نے پوچھا کہ کھیت کتنی دور ہے۔ اس نے بتایا ڈیڑھ دو کلو میٹر۔ انھوں نے کہا ہم بھی ساتھ چلیں گے۔ اب آگے آگے لڑکی اور پیچھے پیچھے مائک لیے ہوئے

پوری ٹیم کے ساتھ پرنے رائے۔ کھیت کھیت اور مینڈ مینڈ چلتے ہوئے وہ مقررہ جگہ پر پہنچے۔ وہاں دو تین عورتیں ملیں ان سے بھی انھوں نے بات کی۔ پھر لڑکی بورے میں بھوسہ بھر کر سر پر رکھ کر واپس آئی۔ پھر پرنے رائے اور ان کی ٹیم اس کے پیچھے پیچھے۔ وہ آتے اور جاتے وقت بھی اس سے باتیں کرتے رہے۔ اس کے گھر، علاقے، اسکول، ٹیچرس اور اس کے مستقبل کے بارے میں، گویا انھوں نے کوئی بات چھوڑی نہیں جو پوچھی نہ ہو۔ اور لڑکی ہر سوال کا بڑی بیباکی کے ساتھ اور مہذب انداز میں جواب دیتی رہی۔ واپسی پر وہ پھر اس کے گھر کے اندر گئے اور چوپائے دیکھنے کے لیے اس کی گھاری میں گئے۔ پھر اجازت لے کر واپس چلے گئے۔ اس لڑکی کی عمر گیارہ سال تھی۔ وہ درجہ سات کی طالبہ تھی۔ اس کا نام سونینا تھا۔ انھوں نے ایک انٹرو بنایا کہ کس طرح ایک غریب گھر کی لڑکی اپنی زندگی، مستقبل، اپنے اہداف اور مقامی حالات وواقعات کے بارے میں بہت واضح وژن رکھتی ہے اور پھر ایڈٹ کر کے نصف گھنٹے کی اسٹوری ''سونینا کی کہانی'' کے نام سے یوٹیوب پر پوسٹ کر دی۔ پرنے رائے کو اس اسٹوری پر انٹرنیشنل ایوارڈ ملا۔ میں سمجھتا ہوں کہ مثبت رپورٹنگ کی یہ ایک انتہائی عمدہ مثال ہے۔

میں ایک مثال سی اے اے کے خلاف پورے ملک میں جاری احتجاجوں کی رپورٹنگ کے سلسلے میں بھی دینا چاہوں گا۔ یوں تو بیشتر چینل اس معاملے میں حکومت کی پالیسی کے تحت رپورٹنگ کرتے رہے ہیں لیکن چند ایک ایسے چینل بھی تھے جنھوں نے مثبت رپورٹنگ کی۔ انھوں نے شاہین باغ میں خواتین کا دھرنا ہو یا پھر دوسرے شہروں میں ہو، ان کو ملک دشمنی کے طور پر پیش نہیں کیا اور یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہاں پاکستان نواز یا دہشت گرد بیٹھے ہوئے ہیں۔ بلکہ انھوں نے خواتین کے پاس جا جا کر ان سے گھنٹوں گھنٹوں باتیں کیں اور ان کی باتوں کو توڑے مروڑے اور مسخ کیے بغیر ناظرین کے سامنے جوں کا توں اور لائیو پیش کیا اور یہ بتایا کہ یہ لوگ ایک غیر آئینی قانون کی مخالفت کر رہے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ شاہین باغ میں خواتین کے دھرنے کی کامیابی میں ایسے چینلوں کا بھی ہاتھ ہے، ان کا بھی کردار ہے۔

نیوز چینلوں کی مانند بہت سے اخبارات بھی سماجی مسائل کے تئیں مثبت کردار ادا کرتے

ہیں۔جس طرح سی اے اے مخالف احتجاج کے دوران کئی نیوز چینلوں نے مثبت رپورٹنگ کی اور دہلی میں بھڑ کے فسادات کے تعلق سے مثبت کردار ادا کیا اسی طرح اخبارات نے بھی ان دونوں ایشوز پر مثبت رول ادا کیا۔اخبارات میں ایسی مبنی بر حقیقت رپورٹیں شائع ہوئیں جن کی امید بہت کم تھی۔ اخبارات نے اداریے لکھے اور فساد سے قبل بعض سیاسی رہنماؤں کے اشتعال انگیز بیانات اور پھر فسادات کے دوران پولیس وانتظامیہ کی ناکارکردگی کی گرفت بھی کی۔ان اخباروں نے کچھ بدنام اخباروں کی مانند منفی رول ادا نہیں کیا اور اپنی رپورٹنگ سے فساد کو مزید بھڑکانے کی کوشش نہیں کی۔متعدد ہندی اور انگریزی روزناموں میں مسلمانوں کی جانب سے ہندوؤں اور ہندوؤں کی جانب سے مسلمانوں کو پناہ دینے کی خبریں نمایاں انداز میں شائع کی گئیں اور ایک دوسرے کی مدد کے رجحان کی حوصلہ افزائی کی گئی۔بعض بڑے صحافیوں نے بھی حقیقت پر مبنی تجزیے پیش کیے اور کچھ چھوٹے اور متوسط صحافیوں نے بھی اچھا رول نبھایا۔حالانکہ تمام اخبارات کا یہ رویہ نہیں رہا۔ بہت سے اخباروں نے منفی رپورٹنگ کی۔لیکن بہر حال ایسے اخبارات بھی دیکھے گئے جنھوں نے اپنے فرائض کو بخوبی ادا کیا۔ایسے اخباروں میں دی ہندو، ٹائمس آف انڈیا، ہندوستان ٹائمس ،انڈین ایکسپریس اور نو بھارت ٹائمس قابل ذکر ہیں۔

اس حوالے سے سوشل میڈیا کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ پرنٹ والیکٹرانک میڈیا جن اہم ایشوز کو چھپا جاتا ہے سوشل میڈیا ان کو واشگاف کر دیتا ہے۔سیاست دانوں کی بہت سی کارستانیاں جو پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا نہیں دکھاتا سوشل میڈیا پر بے نقاب ہو جاتی ہیں۔حکومت کی ایسی بہت سی باتیں جو عوام کے سامنے آنی چاہئیں مگر نہیں آپاتیں سوشل میڈیا ان کو سامنے لے آتا ہے۔حالانکہ اس کا غلط اور منفی استعمال بھی ہوتا ہے اور اس کے توسط سے بہت سی فرضی خبریں اور افواہیں پھیلا کر ماحول کو خراب کرنے یا بعض طبقات اور کچھ لوگوں کو بدنام کرنے کی کوشش بھی کی جاتی ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سوشل میڈیا کا ایک مثبت کردار بھی ہے اور بہت مضبوط کردار ہے۔دہلی فسادات کے تعلق سے سوشل میڈیا کے توسط سے جہاں افواہ بازی کی گئی وہیں اس پر حقائق بھی بیان کیے گئے۔متعدد یو

ٹیوب چینلوں پر متاثرین کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات بیان کیے گئے، فساد کی سازشوں کی پرتیں کھولی گئیں اور فسادیوں اور شرپسندوں کے ساتھ ساتھ پولیس اور انتظامیہ کی بھی قلعی اتاری گئی۔ یوٹیوب چینلوں پر جو حقائق پیش کیے گئے اس کی وجہ سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔

لیکن یہ چند مستثنیات ہیں۔ سوشل میڈیا کے علاوہ کچھ خاص چینل اور اخبار ہی ہیں جو صحافت کی روح کو زندہ رکھے ہوئے ہیں اور جو مسلمانوں کے معاملات کو منفی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ جب مسلمانوں کا کوئی معاملہ درپیش ہوتا ہے تو میڈیا منفی طرز فکر سے کام لینے لگتا ہے۔ وہ ایسی چیزوں کو اچھالتا ہے جن سے مسلمانوں اور ان کے مذہب کی بدنامی ہو۔ ہندوستانی مسلمانوں کو جان بوجھ کر ایک ہمسایہ ملک سے جوڑنے کی کوشش کی جاتی ہے اور ان پر دہشت گردی کے الزامات عاید کیے جاتے ہیں۔ اس طرز فکر کا مقصد ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ماحول سازی کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر کسی ایک مسلمان نے غلطی سے بھی کوئی اشتعال انگیز بیان دے دیا تو اس کی آڑ میں پورے ملک کے مسلمانوں کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔ سی اے اے، این پی آر اور مجوزہ این آر سی کے خلاف احتجاجی مظاہروں میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ برادران وطن بھی بڑی تعداد میں شامل رہے ہے۔ لیکن ان مظاہروں کی آڑ میں مسلمانوں کو ملک دشمن اور غدار ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے۔ اگر شاہین باغ کے احتجاج میں کوئی ایسا نعرہ ایک بار ہی سہی لگ گیا جو میڈیا کو اشتعال انگیزی کرنے میں سوٹ کرتا ہو تو بار بار اس کو ہائی لائٹ کیا جاتا رہا ہے۔ میڈیا مستقل یہ بتاتا رہا ہے کہ شاہین باغ میں ''جناّ والی آزادی'' کا نعرہ لگایا جا رہا ہے۔ حالانکہ وہ ''جینے والی آزادی'' کا نعرہ تھا۔ وہ یہ بتاتا رہا ہے کہ وزیر اعظم اور وزیر داخلہ کو مارنے کی باتیں کی جا رہی ہیں۔ حالانکہ یہ ثابت نہیں ہو سکا۔ ایسی افواہوں کو ہائی لائٹ کرنے میں ٹائمس ناؤ، ری پبلک، ریپبلک بھارت، نیوز نیشن، ٹی وی نائن بھارت ورش، انڈیا ٹی وی، زی ٹی وی اور ایسے بعض دوسرے نیوز چینل پیش پیش رہے ہیں۔

جب ایک فرضی ویڈیو کی بنیاد پر یہ الزام عاید کیا گیا کہ شاہین باغ میں خواتین پانچ پانچ سو

روپے لے کر دھرنے پر بیٹھ رہی ہیں تو اسے میڈیا نے یوں ہائی لائٹ کیا جیسے اس کو شاہین باغ کے خلاف بہت بڑا ہتھیار مل گیا ہو۔ لیکن جب یہ ویڈیو فرضی پایا گیا تو اسے فرضی بتا کر شاہین باغ کی خواتین کی اس الزام سے گلوخلاصی کرانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ شاہین باغ میں حب الوطنی کا جو مظاہرہ ہوتا رہا ہے، اتحاد بین المذاہب کی مثال پیش کی جاتی رہی ہے اور آئین کی تمہید کو بار بار پڑھ کر اس کا وقار بلند کیا جاتا رہا ہے لیکن میڈیا نے اس کو دکھانے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں کی۔ جب مظاہرین نے کسی ایمبولینس کو جانے کا راستہ دیا یا کسی ہندو بھائی کی ارتھی کے گزرنے کے لیے بیری کیڈنگ ہٹائی تو میڈیا نے اس پر بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن وہ یہ بات بڑی شد و مد کے ساتھ بتاتا رہا ہے کہ مظاہرین نے ایک اہم شاہراہ کو بند کر کے پوری دہلی کو یرغمال بنا لیا ہے۔ دہشت گردی کے معاملات میں بھی یہی ہوتا ہے کہ جب کوئی مسلمان فرضی طریقے سے پکڑا جاتا ہے تو اسے بہت بڑا اور خونخوار دہشت گرد بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اس کی آڑ میں تمام مسلمانوں کو بدنام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جب اسی شخص کو عدالتیں بری کر دیتی ہیں اور اس پر عاید تمام الزامات جھوٹے اور بے بنیاد ثابت ہو جاتے ہیں تو میڈیا اس خبر کو نہیں دکھاتا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ میڈیا میں متعصب ذہنوں کی بڑی کارفرمائی ہے۔ ایک خاص مکتب فکر کے حامل افراد کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا گیا ہے اور میڈیا اس محاذ کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ آج صورت حال یہ ہے کہ پورے ملک میں کئی سو نیوز چینل ہیں اور تقریباً تمام چینلوں پر پرائم ٹائم میں کسی نہ کسی اہم مسئلے پر پینل ڈبیٹ یا اجتماعی مباحثہ ہوتا ہے۔ ان مباحثوں میں اینکر کا رول غیر جانبدارانہ نہیں رہ پاتا۔ وہ ایک فریق بن جاتا ہے اور مسلم مخالف پینلسٹ کے لیے ماحول سازگار کرتا رہتا ہے اور بوقت ضرورت ان کی مدد بھی کرتا ہے۔ ان اینکروں کی چال میں مسلم پینلسٹ پھنس جاتے ہیں۔ بلکہ بہت سارے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مسلم پینلسٹ جان بوجھ کر اینکروں کے آلہ کار بنتے ہیں۔ ان سے ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جو مسلمانوں کے خلاف ہوں اور وہ ان کے کوئی ٹھوس جواب نہیں دے پاتے۔ اگر غلطی سے انھوں نے کسی ایسے مسلمان کو بلا لیا ہے جو صحیح اور ٹھوس جواب دے سکے تو یا تو اسے بولنے نہیں دیا جاتا یا

پھر اس کے جواب کو بیچ ہی میں کاٹ دیا جاتا ہے۔ لیکن جو نام نہاد مسلمان عام مسلمانوں اور اسلام کے خلاف زبان درازی کریں انھیں خوب مواقع دیے جاتے ہیں۔

قارئین اس بات سے واقف ہوں گے کہ کس طرح ہندوؤں کے ایک طبقے کو مسلمانوں کے خلاف ورغلانے کے لیے بعض ہندو لڑکیوں کی مسلم نوجوانوں سے شادی کو لو جہاد کا نام دیا گیا۔ اس معاملے میں یہاں تک دروغ گوئی کی گئی کہ ایک سازش کے تحت خلیج سے پیسے آتے ہیں اور ہندو لڑکیوں کو محبت کے جال میں پھانس کر ان سے شادی کرنے اور پھر ان کا مذہب تبدیل کرانے کے لیے ایک ایک مسلم نوجوان کو دس دس لاکھ روپے دیے جاتے ہیں۔ جب کیرالہ کی ایک ۲۴ سالہ طالبہ اکھیلا نے اسلام کا مطالعہ کیا اور پھر قبول اسلام کرنے کے بعد اپنا نام ہادیہ رکھا اور ایک مسلم نوجوان شافعین جہاں سے شادی کی تو لو جہاد کے پروپیگنڈے کی دھار تیز ہوگئی۔ چونکہ اس قسم کے واقعات کیرالہ میں زیادہ ہوئے تھے اس لیے سپریم کورٹ کے حکم پر این آئی اے نے ۸۹ بین المذاہب شادیوں کی ایک فہرست بنائی اور ان میں سے گیارہ کی تحقیقات کی تو اسے لو جہاد کا کوئی ثبوت ہی نہیں ملا۔ ایسے میں میڈیا پر یہ ذمہ داری عاید ہوتی تھی کہ وہ ان خبروں کو بھی اسی طرح پیش کرتا جس طرح اس نے نام نہاد لو جہاد کو پیش کیا تھا یا ہادیہ کی شادی کو ایک جبریہ شادی بتایا تھا۔ لیکن الیکٹرانک میڈیا نے اس خبر کو ہضم کر لیا۔ یہی صورت حال ماب لنچنگ میں بھی نظر آئی۔ گائے لے جاتے ہوئے جب کسی مسلمان کو ایک مشتعل بھیڑ نے پیٹ پیٹ کر ہلاک کر دیا تو حملہ آوروں کو بچانے کی کوشش میں مسلمانوں کو ہی گائے کا اسمگلر بتایا جانے لگا۔ متعدد واقعات میں یہی ہوا اور تمام مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے والے قصائی کے روپ میں پیش کیا جانے لگا۔ یہ تو مسلمانوں سے متعلق چند مثالیں تھیں ورنہ میڈیا بیشتر معاملات میں منفی طرز فکر سے کام لیتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ معاشرے پر میڈیا کے اس مثبت اور منفی کردار کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس کا جائزہ لینے کے لیے کچھ واقعات پر ایک سرسری نظر ڈالنی ہوگی۔ پہلے مثبت اثرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ چونکہ میڈیا کا کردار مثبت کم اور منفی زیادہ ہے اس لیے اس کے اثرات بھی زیادہ تر منفی ہی پڑتے ہیں۔ ایک بار پھر میں شاہین باغ کی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔ بعض

میڈیا چینلوں اور اخباروں کی مثبت رپورٹنگ اور پھر اس کی مثبت عالمی رپورٹنگ کا نتیجہ یوں برآمد ہوا کہ دوسرے بہت سے شہروں میں بھی شاہین باغ بن گئے جہاں عورتیں آئین مخالف قانون کی مخالفت کرنے لگیں۔ اس طرح پورے ملک میں دو سو سے زائد مقامات پر شاہین باغ بن گئے۔ میڈیا نے پورے ملک میں نکلنے والے مارچوں کو بھی خوب دکھایا۔ ایسے کئی مارچوں میں لاکھوں لاکھ افراد موجود تھے۔ اس رپورٹنگ کی وجہ سے سی اے اے کے خلاف عوام میں ایک بیداری پیدا ہوئی اور جن مقامات پر کوئی احتجاجی پروگرام نہیں ہوا وہاں بھی ہونے لگا۔ اسی طرح جب پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں دہلی فسادات میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانب سے ایک دوسرے کی مدد کرنے کی خبریں پیش کی گئیں تو ان کا اچھا اثر ہوا اور دونوں فرقوں میں کسی حد تک اعتماد کی بحالی میں مدد ملی۔

لیکن جس طرح کسی مثبت چیز کا اثر کم اور منفی چیز کا اثر زیادہ پڑتا ہے اسی طرح میڈیا کے منفی کردار کا اثر بھی معاشرے پر زیادہ پڑتا ہے۔ جب میڈیا میں ماب لنچنگ کے واقعات بڑے پیمانے پر دکھائے جانے لگے اور ان میں مسلمانوں کو ویلن کے طور پر پیش کیا جانے لگا تو ایسے واقعات میں بے تحاشہ اضافہ ہو گیا۔ میڈیا میں آنے کے لالچ میں لوگ اپنی غلط کاریوں کی خود ویڈیو بنانے لگے اور نیوز چینلوں کو بھیجنے لگے۔ اس کا مقصد خود کو ٹی وی اسکرین پر پہنچانا تھا۔ جب ایک چینل نے ایک ویڈیو کو بار بار دکھایا تو دوسرے چینل بھی اس کو دکھانے لگے اور اس طرح وہ شخص خود کو ایک ہیرو تصور کرنے لگا۔ حالانکہ اس نے کام ویلن کا کیا تھا۔ آپ کو راجستھان کے شمبھو ریگر کا بدترین واقعہ یاد ہوگا جس نے ایک کلہاڑی سے ایک مسلمان کو ہلاک کیا تھا اور اپنے کمسن بھتیجے سے اس کی ویڈیو بنوائی تھی۔ اس ویڈیو کو جب بہت سے چینلوں پر دکھایا گیا تو کٹر اور متعصب اور مسلمانوں سے دشمنی کے جذبات رکھنے والے ایک حلقے میں بھی اسے ایک ہیرو سمجھا جانے لگا۔ یہاں تک کہ جب وہ جیل چلا گیا تو اس کے لیے چندہ اکٹھا کیا گیا اور اسے ایک الیکشن میں اتارنے کی تیاری تک کر لی گئی۔ اسی طرح جب ایک مرکزی وزیر نے جھارکھنڈ میں ماب لنچنگ کے مجرموں کا جیل سے ضمانت پر رہا ہونے کے بعد ہار پہنا کر استقبال کیا تو میڈیا میں اسے خوب ہائی

لائٹ کیا گیا۔ اسی طرح بلند شہر کے انسپکٹر سبودھ کمار کے قتل میں ملوث ایک تنظیم کے ایک عہدے دار کا جیل سے رہائی کے بعد ہار پھول پہنا کر استقبال کیا گیا۔ اس واقعہ کو بھی میڈیا میں خوب ہائی لائٹ کیا گیا۔ ایسے واقعات اگر نیوز چینلوں پر نہ دکھائے جائیں تو مجرمانہ ذہنیت کے لوگوں میں اس قسم کے واقعات میں ملوث ہونے کا حوصلہ پیدا نہ ہو۔

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ معاشرے پر میڈیا کے مثبت و منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس بات کا احساس میڈیا کو بھی ہونا چاہیے۔ اگر اسے اس کا احساس ہو جائے کہ اس کے اینکر اور رپورٹر نوجوانوں کے لیے رول ماڈل بن جاتے ہیں اور پھر میڈیا اپنے رویے میں مثبت تبدیلی پیدا کرے تو معاشرے کی بڑی خدمت ہوگی۔ حالانکہ میڈیا معاشرے کا آئینہ ہوتا ہے۔ معاشرے میں جو کچھ ہوتا ہے میڈیا وہی دکھاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ سماجی مسائل میں اس کا زاویۂ نظر عام طور پر حقیقت پر مبنی نہیں ہوتا۔

میڈیا اور مسلمانوں کا رشتہ

مسلمان ہمیشہ کئی محاذوں پر اور کئی معاندین کے ساتھ برسر پیکار رہے ہیں۔ اکیسویں صدی میں ان کا ایک اور مخالف پیدا ہو گیا جو بے حد طاقتور ہے۔ یہ نیا مخالف الیکٹرانک میڈیا ہے۔ پرنٹ میڈیا تو پہلے سے ہی مسلمانوں کے ساتھ وہی کھیل کھیلتا آ رہا ہے جو اب الیکٹرانک میڈیا کھیل رہا ہے۔ پرنٹ میڈیا کا دائرہ اثر کچھ ذرا محدود ہے لیکن الیکٹرانک میڈیا کا لامحدود ہے۔ وہ کبھی دانستہ اور کبھی نادانستہ ایک تیر سے کئی شکار کرتا ہے اور شکار ہمیشہ مسلمان ہی بنتے ہیں۔ اور دوسری طرف اس کے ساتھ مسلمانوں کے رویے اور سلوک کا یہ عالم ہے کہ وہ علی الاعلان اس کو اپنا دشمن قرار دیتے ہیں اور اگر کبھی اتفاقیہ طور پر بھی اس کا سامنا ہو جائے تو ایسے کترا کے گزر جانے میں عافیت سمجھتے ہیں جیسے وہ ان کے لیے اچھوت ہو۔ اگر ہم یہ کہیں کہ مسلمانوں اور میڈیا کے باہمی رشتے کی داستان بڑی دلخراش بھی ہے اور عبرت انگیز بھی، تو شاید غلط نہیں ہوگا۔

اس بات سے قطع نظر کہ میڈیا مسلمانوں اور اسلام کے تعلق سے کس زاویۂ نگاہ کو مرغوب خاطر رکھتا ہے، ہمیں سب سے پہلے اس سوال پر غور کرنا چاہیے کہ کیا میڈیا کے ساتھ ہمارا رویہ اور ہماری سوچ حقائق پر مبنی ہے۔ کیا ہمیں اس تعلق سے اپنے نقطۂ نظر پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے اور کیا یہ وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم اس کے قریب جائیں جسے ہم اپنا دشمن سمجھے بیٹھے ہیں اور اس کے ساتھ وفاداری بشرطِ استواری کا معاملہ کریں۔ یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ڈائیلاگ یا مکالمے کی بڑی اہمیت ہے اور اس میں بڑی طاقت بھی ہے۔ آج موجودہ عالمی تناظر میں اگر چہ ڈائیلاگ کی وہ بین الاقوامی مہم جو ماضی قریب میں بڑی شد و مد کے ساتھ اٹھی تھی، کچھ کمزور پڑ گئی

ہے، تاہم اس کی اہمیت سے کوئی بھی ذی شعور فرد انکار نہیں کر سکتا۔ کچھ لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ میڈیا ہم سے دور بھاگتا ہے اور وہ ہم سے مذاکرات کے حق میں نہیں ہے تو ہم ہی کیوں اس کی خوشامد کریں۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا اطلاق ہر جگہ نہیں ہو سکتا۔

اگر مسلمان میڈیا سے دوستی کر لیں یا وہ میڈیا کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کریں تو وہ اس سے بہت سے کام نکالے جا سکتے ہیں۔ میڈیا میں اپنی بات رکھنے کے کئی پہلو ہیں۔ میڈیا کے اندر جا کر اپنی بات پیش کرنا ایک معاملہ ہے اور اپنی بات کو دنیا کے سامنے رکھنے کے لیے میڈیا کا استعمال کرنا دوسرا معاملہ ہے۔ میڈیا کو مسلمانوں اور اسلام کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر کو مثبت رنگ دینے کے لیے آمادہ کرنا بالکل ہی مختلف بات ہے اور میڈیا اداروں میں مسلم نمائندگی میں اضافے کا مسئلہ ایک الگ اور اہم مسئلہ ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ میڈیا کے ساتھ مسلمانوں کے رشتے خوشگوار ہوں۔ ایک دوسرے کے تعلق سے بدگمانیوں اور غلط فہمیوں کا ازالہ ہو اور ایسے حالات پیدا ہوں کہ دونوں ایک دوسرے کے مخالف نہیں معاون بن جائیں۔ اس مقصد کے حصول کی ذمہ داری چونکہ مسلمانوں پر زیادہ عاید ہوتی ہے اس لیے انھیں ہی پیش قدمی کرنی چاہیے، انھیں ہی دوستی کا ہاتھ بڑھانا چاہیے اور انھیں ہی بہ تقاضائے مصلحت و مصالحت ذرا سا جھک کر میڈیا کو اپنے گلے لگانا چاہیے۔

یہ حقیقت کسی سے مخفی نہیں اور اسے اجاگر کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ میڈیا کا دور ہے۔ ''قلم گوید کہ من شاہ جہانم'' جیسے شہرہ آفاق مقولے میں اب بے انتہا وسعت آ گئی ہے۔ اب قلم کے زمرے میں الیکٹرانک میڈیا کے تمام آلاتِ حرب وضرب بھی آ گئے ہیں۔ اب جنگیں صرف زمینوں اور آسمانوں پر ہی نہیں لڑی جاتیں بلکہ میڈیا ہاؤسز میں بھی لڑی جاتی ہیں۔ اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ جو فریق اس ہتھیار سے لیس ہو گیا اس نے نصف جنگ بغیر لڑے جیت لی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہمارے سامنے موجود ہیں۔ آج میڈیا صرف ذرائع ابلاغ نہیں ہے بلکہ وہ بہت کچھ ہو گیا ہے۔ اس نے کروڑوں اور اربوں انسانوں کو ذہنی طور پر معذور اور اپاہج بنا کر رکھ دیا ہے۔ اور خود ان کی بیساکھی بن کر کھڑا ہو گیا ہے۔ اس کے دائرہ کار و دائرہ اثر میں

وسعت، اس کی اثر انگیزی، اس کی اہمیت اور اس کی قدر و قیمت کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ آج تمام تر شعبہ ہائے حیات اپنی بقا کے لیے اسی پر منحصر ہیں۔ کسی بھی میدان میں کام کرنے والے افراد اور اداروں اور تنظیموں کے لیے بھی یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنی سرگرمیوں، اپنی خدمات یا اپنی مصنوعات سے دنیا کو باخبر کرنے کے لیے اس کی خدمات حاصل کریں۔

ان حقائق سے قطع نظر آج ایک بار پھر مناظروں کا دور زندہ ہو گیا ہے۔ آج پھر مختلف بہانوں سے اسلام، پیغمبر اسلام، شعائر اسلام اور مسلمانوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ کتابیں بھی لکھی جا رہی ہیں اور اخبارات کے ذریعے بھی مسلمانوں کو ہدف تنقید بنایا جا رہا ہے۔ مناظروں نے آج اپنا چولا اور میدان دونوں بدل لیے ہیں۔ یعنی اب عوامی جلسے مناظروں کا مرکز نہیں بنتے بلکہ اب نیوز چینلوں کے اسٹوڈیوز میں مناظرے ہوتے ہیں۔ عالمی سطح پر دیکھیں تو اسلام اور اہل اسلام پر چوطرفہ یلغار ہے۔ ہندوستانی تناظر میں دیکھیں تو ایک خاص مکتب فکر کے حامل افراد کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف ایک محاذ کھول دیا گیا ہے۔ یہ محاذ کئی سطحوں پر قائم ہے۔ جن میں ہلکی پھلکی جھڑپوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو نشانہ بنانا، ان کے مذہب کو ہدف تنقید بنانا اور ان کے تشخص اور اسلامی شعائر کو مٹانے کی کوشش کرنا شامل ہے۔ آج سب سے بڑا مقابلہ اگر کہیں چل رہا ہے تو وہ نیوز چینلوں پر چل رہا ہے۔ ایک مخصوص گروہ کی جانب سے اپنے ایجنڈے کی تبلیغ کے لیے بے شمار ماہرین پیدا کر دیے گئے ہیں۔ یہ ماہرین ہر جگہ ہیں۔ حکومت میں بھی ہیں، سیاسی جماعتوں میں بھی ہیں، انتظامیہ میں بھی ہیں اور میڈیا میں بھی ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں کے دوران اس مخصوص گروہ نے جن محاذوں پر بہت زیادہ محنت کی ان میں ایک محاذ اپنے ایجنڈے کی تبلیغ کرنے والے ماہرین پیدا کرنا بھی ہے۔ جب سے مرکزی حکومت کی زمام ایک خاص مکتب فکر کے حامل افراد کے ہاتھوں میں آئی ہے، نیوز چینلوں پر ان کے مبلغین کا سیلاب آ گیا۔ آج تقریباً تمام چینلوں پر پرائم ٹائم میں کسی نہ کسی اہم مسئلے پر پینل ڈسکشن یا اجتماعی مباحثہ ہوتا ہے۔ ان مباحثوں میں اگر کوئی فریق بہت زیادہ تیاریوں کے ساتھ آتا ہے تو وہ وہی ہے جو مرکز میں برسر اقتدار ہے۔ آج جو نئے نئے ترجمان پیدا ہو گئے ہیں ان کو ذہنی طور پر اس طرح تیار کر دیا گیا ہے کہ ایک پرانی اور تاریخی

سیاسی جماعت کے پاس بھی ان کے دلائل کو رد کرنے والے موجود نہیں ہیں۔

مسلمانوں کی حالت تو اور بھی دگر گوں ہے۔ مسلم مسائل پر ہونے والے مباحثوں میں مسلم موقف کی وضاحت یا اس کے دفاع کے لیے جو مسلم نمائندے شریک ہوتے ہیں یا جن کو بلایا جاتا ہے وہ کسی بھی اہم سوال کا کوئی معقول اور قائل کن جواب نہیں دے پاتے۔ دو چار لوگ ایسے ہیں جو مخالفانہ حملوں کو کچھ دیر تک جھیل لیتے ہیں لیکن بیشتر ایسے ہیں جو پہلے ہی حملے میں پست ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں کی جانب سے ایسے متعدد لوگ مباحثوں میں حصہ لیتے ہیں جن کو نہ عالمی تاریخ کا علم ہے نہ عالمی تہذیبوں اور ثقافتوں کا۔ نہ دوسرے مذاہب کا مطالعہ ہے نہ ہندوستانی عوام کو درپیش مسائل اور چیلنجوں کا۔ یہاں تک کہ وہ مسلم معاملات و مسائل سے بھی ناواقف ہوتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ انھیں اپنے مذہب کے بارے میں بھی ضروری معلومات نہیں۔ بعض اوقات ان کے جوابوں یا اول جلول باتوں سے بڑی مضحکہ خیز صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ جو لوگ کچھ جانتے ہیں وہ یا تو ان مباحثوں میں شریک ہونا تضیع اوقات سمجھتے ہیں یا میڈیا والے ان کو بلاتے نہیں۔ میڈیا والے بھی ایسے مسلمانوں کو بحث میں حصہ لینے کی دعوت دیتے ہیں جو پھسڈی ہوں، جو ناکارہ ہوں۔ تاکہ ان کا اپنا مقصد پورا ہوتا رہے۔ اس قسم کے لوگ بڑے شوق سے جا کر مسلمانوں اور اسلام کا مذاق اڑوا کر واپس آجاتے ہیں۔

مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ کسی بھی طرح میڈیا کو اپنے حق میں ہموار کریں۔ اگر ہم نے اس کا اعتماد جیت لیا یا اسے کم از کم اس حد تک نرم کر لیا کہ وہ ہمارے موقف سے دلچسپی لے اور اس کو اپنی رپورٹوں کے ذریعے دنیا کے سامنے پیش کرے تو ہمارا کام آسان بھی ہو جائے گا اور ہم اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب بھی ہو جائیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ میڈیا اداروں اور میڈیا نمائندوں کے ساتھ روابط بڑھانے اور ان سے اپنے رشتے استوار کرنے کے کیا کیا طریقے ہو سکتے ہیں۔ اس کے لیے پروفیشنل انداز میں سوچنے اور کام کرنے کی ضرورت ہے۔ فی الحال ہم اس پر غور کرتے ہیں کہ مسلمانوں اور اسلام کے حوالے سے میڈیا کے رویے میں تبدیلی کیسے آئے، وہ اپنے زاویہ نگاہ کو ہمدردانہ انداز میں کیسے بدلے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے سلسلے

میں مثبت انداز فکر اپنائے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس کے قریب جائیں اور اسے اپنا قریبی بنائیں۔ اس کام کے لیے پہلی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے اداروں میں ایک میڈیا سیل ہو جس میں کئی افراد پر مشتمل ایک ٹیم ہو جس کے پاس تمام میڈیا اداروں کے بارے میں معلومات ہوں۔ ان کے دفاتر کے پتے، فون نمبر، ای میل آئی ڈی، میڈیا ہیڈ، نیوز ایڈیٹر، اینکر، رپورٹر اور کیمرہ مین وغیرہ کے ناموں اور کنٹیکٹ نمبروں کی پوری فہرست ہو۔ گویا ایک میڈیا ڈائرکٹری بنانے کی ضرورت ہے اور ممکن ہو تو اسے چھپوایا بھی جائے۔ ہمارے پاس جو ٹیم ہو اس کے الگ الگ ارکان کے ذمہ الگ الگ کام دیے جائیں۔ مثال کے طور پر کوئی میڈیا ہیڈ کے رابطے میں رہے۔ کوئی رپورٹروں کے، کوئی اینکروں کے اور کوئی کیمرہ مینوں کے۔ اور یہ تمام کام مربوط انداز میں ہونے چاہئیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلومات رکھی جائیں کہ کس ایشو کو بالخصوص مسلمانوں کے معاملات کو کس ادارے کا کون سا رپورٹر کور کرتا ہے۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ان تمام افراد سے ہم بوقت ضرورت ہی رابطہ قائم کریں۔ اس وقت تو ہمیں رابطہ کرنا ہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی اور کبھی کبھی بلاضرورت بھی ان سے رابطہ رکھنا چاہیے تا کہ ان سے ہمارے اچھے تعلقات قائم ہوں۔ مختلف مواقع پر جیسے مسلمانوں اور ہندوؤں کے تہواروں پر انھیں یاد رکھا جائے۔ اگر ان کا کوئی تہوار ہے تو اخلاقی تقاضے کے تحت انھیں فون کر کے یا ای میل کے ذریعے مبارکباد پیش کی جائے۔ اپنے تہواروں پر بھی انھیں یاد رکھا جائے اور ممکن ہو تو کسی بہانے سے کوئی تقریب منعقد کی جائے اور اس میں ان کو مدعو کیا جائے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم ہمیشہ صرف خبروں کے لیے یا کوریج کے لیے ہی انھیں بلائیں۔ انھیں دوسرے مواقع پر بھی بلائیں اور ان کے گوش گزار کریں کہ یہ تقریب صرف ملنے ملانے کے لیے ہے کوریج کے لیے نہیں۔ حالانکہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ ہم اس میں ہمیشہ کامیاب ہی ہوں۔ ایک بڑے صحافی کا قول ہے کہ صحافی بہت تن آسان ہوتا ہے۔ اگر وہ حقیقی اور جینوین صحافی ہے تو صرف کوریج کے لیے ہی گھر سے باہر قدم نکالنا چاہے گا۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وہ اگر کسی دوسرے کام سے باہر نکلا ہوا ہے تو اس کی صحافتی نگاہ ہر معاملے میں کوئی نہ کوئی نکتہ تلاش کرنے کی کوشش کرتی

رہتی ہے۔ کبھی کبھی بلا ضرورت اور بلا وجہ بھی کوئی اسٹوری مل جاتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان سے دوستانہ مراسم قائم کیے جائیں اور انھیں اس کا بھی لالچ دیا جائے کہ آپ آئیں گے تو ممکن ہے کہ آپ کو کوئی اسٹوری مل جائے یا کسی اسٹوری کے لیے مواد مل جائے۔ رپورٹروں کو مطمئن کرنے کے لیے انھیں تحائف بھی دیے جا سکتے ہیں۔ لیکن یہ معاملہ ذرا نازک ہے۔ اس سلسلے میں بہت سوچ سمجھ کر اور محتاط ہو کر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ مختلف بزنس ادارے عید ملن، ہولی ملن اور دوسرے پروگراموں کے بہانے میڈیا نمائندوں کو مدعو کرتے ہیں۔ انھیں مختلف ذرائع سے خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس روش کو اپنایا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ غیر مسلم صحافی ہمارے معاملات پر توجہ نہیں دیتے لہٰذا وہ ہماری بات کیوں سنیں گے۔ یہ بات درست ہو سکتی ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہمیں ان اداروں میں مسلم صحافیوں اور کارکنوں کی تلاش کرنی چاہیے۔ ان میں اگر ہمیں ملی اور اسلامی ذہن رکھنے والے لوگ مل جائیں تو کیا کہنے۔ ان سے ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے۔ ہم ان کی مدد سے دوسروں تک رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس وقت بعض انگریزی اور ہندی اخباروں میں باصلاحیت اور قابل اور ملی درد رکھنے والے مسلم صحافی موجود ہیں۔ ان کی موجودگی کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان اخباروں میں مسلمانوں سے متعلق بہت ہی مثبت رپورٹیں شائع ہوتی ہیں۔

اس پورے معاملے کے لیے ہمارے پاس ایک مناسب اور مخصوص بجٹ بھی ہونا چاہیے۔ اس میں کسی بھی طرح کی کمی نہیں ہونی چاہیے۔ میڈیا نمائندوں کے ساتھ باوقار انداز میں اور عزت و احترام کے ساتھ پیش آیا جائے۔ وہ جو کچھ بھی پوچھیں ان کا خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا جائے۔ ان کی کسی بات پر مشتعل ہونے کے بجائے ان کے سوالوں یا ان کی باتوں کو سمجھا جائے اور مناسب انداز میں ردعمل ظاہر کیا جائے۔ اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جائے کہ گفتگو موضوع کے اندر ہو۔ تقریر نما بیانات کی ضرورت نہیں۔ ٹو دی پوائنٹ گفتگو کی جائے۔ غیر ضروری تفصیلات سے گریز کیا جائے۔

اگر کسی معاملے پر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ردعمل ظاہر کرنے کی ضرورت ہے تو ضرور کرنا چاہیے۔

خاموش رہنا قرین دانش نہیں۔ لیکن میں پھر وہی بات کہوں گا کہ ردعمل بھی ٹو دی پوائنٹ ہو۔ اخباروں میں اگر کوئی بیان دینا ہے تو وہ بس چند سطور پر مشتمل ہو اور اسی میں ساری ضروری باتیں آجانی چاہئیں۔ لمبی لمبی تقریروں کو پڑھنے یا ان میں سے خبر نکالنے کا وقت نہ پرنٹ میڈیا کے پاس ہے اور نہ ہی الیکٹرانک میڈیا کے پاس۔ اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ ہم جس اخبار کے لیے کوئی ردعمل تیار کریں تو وہ اسی زبان میں ہو جس میں وہ اخبار چھپتا ہے۔ اخباروں کے مدیروں کے نام خطوط یعنی لیٹر ٹو دی ایڈیٹر بھی لکھے جانے چاہئیں۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ بہت سے لوگ جب دیکھتے ہیں کہ ان کا خط شائع نہیں ہوا تو وہ بددل ہو جاتے ہیں اور خطوط ارسال کرنا بند کر دیتے ہیں۔ ہمیں بددل ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہمیں بار بار خطوط لکھنے چاہئیں۔ اس تعلق سے کاروباری اشتہارات کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔ اخبار یا ٹی وی پر بار بار کوئی اشتہار دیکھنے سے وہ ذہن پر نقش ہو جاتا ہے اور صارف کو جب اس چیز کی ضرورت ہوتی ہے تو اس کا ذہن فوراً متعلقہ اشتہار پر چلا جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم مسلسل خطوط لکھتے رہے تو کبھی تو ایڈیٹر یا نیوز ایڈیٹر یا شفٹ انچارج یا متعلقہ شخص اس پر نظر ڈالے گا۔ وہ یہ بات محسوس کیے بغیر نہیں رہے گا کہ فلاں معاملے پر یا فلاں شخص کے ذریعے بار بار کوئی چیز آتی ہے ذرا اسے دیکھنا چاہیے۔ یا وہ اپنے کسی ماتحت سے کہہ سکتا ہے کہ ذرا دیکھنا یہ کیا ہے، یہ بار بار کیوں لکھ رہے ہیں، ان سے ملو یا ان سے رابطہ کر کے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرو۔

ہمارے پاس ایک ایسی ٹیم ہونی چاہیے جو مختلف مسائل کے ماہرین پر مشتمل ہو۔ اس کی بھی ایک ڈائرکٹری ہو۔ ہمیں چاہیے کہ ہم اس ڈائرکٹری کو میڈیا اداروں تک پہنچائیں اور ان سے گزارش کریں کہ اس میں مختلف ایشوز پر بولنے اور ردعمل ظاہر کرنے والوں کے نام مع ان کے پتے اور کنٹیکٹ نمبر اور ای میل آئی ڈی موجود ہیں، آپ بوقت ضرورت ان سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔ جو ڈائرکٹری بنائی جائے اس میں ہر ایکسپرٹ کے نام کے آگے اس کے خاص میدان کا اندراج بھی ہو۔ تاکہ اگر کوئی اینکر یا رپورٹر کسی موضوع پر مسلمانوں کا کوئی ردعمل معلوم کرنا چاہے تو وہ اس ڈائرکٹری سے فائدہ اٹھا سکے۔ ہمارے جو ایکسپرٹ ہوں وہ بھی ہمیشہ اس کے لیے تیار

رہیں کہ انھیں کسی بھی وقت کسی بھی میڈیا ہاؤس میں جا کر اپنی رائے دینی ہے یا کسی مباحثے میں حصہ لینا ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی معقول ایکسپرٹ نہیں ملتا تو دوسرا پوائنٹ آف ویو رکھنے کے لیے پروڈیوسر حضرات کسی کو بھی بلا کر بٹھا لیتے ہیں اور ان سے ایسے سوالات کیے جاتے ہیں جن کے جواب ان کے پاس نہیں ہوتے۔ اس طرح مسلمانوں کا کیس مضحکہ خیز شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ہمارے پاس ایکسپرٹ کی ٹیم ہو تو اس سبکی سے بچا جا سکتا ہے۔

نیشنل میڈیا کے بارے میں مسلمانوں کا یہ خیال بڑی حد تک درست کہ وہ مسلم ایشوز پر منفی طرز فکر سے کام لیتا ہے۔ وہ ایسی چیزوں کو اچھالتا ہے جن سے مسلمانوں اور ان کے مذہب کی بدنامی ہو۔ وہ مسلمانوں کی شبیہ ایسے رنگوں سے بناتا ہے جو بدنما ہوں اور جن سے ایک کریہہ اور ڈراونی صورت سامنے آئے۔ اسی کے ساتھ یہ شکوہ بھی بجا ہے کہ میڈیا میں متعصب ذہنوں کی بڑی کارفرمائی ہے۔ جانبدار افراد کی بھرمار ہے۔ سیاسی جماعتیں اور مخصوص مذہبی گروہ ان کو اپنا ہمنوا بنانے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی درست ہے کہ ایسے بہت سے صحافی پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا میں اب بھی موجود ہیں جو حقیقی صحافت سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جو ایشوز پر بات کرتے ہیں۔ کرنسی کی چمک دمک سے جن کی آنکھیں خیرہ نہیں ہوتیں یا جو مختلف قسم کی آسائشوں اور سہولتوں کے عوض اپنے ضمیر کا سودا نہیں کرتے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ایسے صحافیوں کو اس سے دلچسپی نہیں ہوتی کہ فلاں رپورٹ سے مسلمانوں کی یا کسی کی بھی بدنامی ہوگی یا نیک نامی۔ اس سے کسی خاص مذہب کے لوگوں کا فائدہ ہوگا یا نقصان۔ وہ صرف اور صرف خبروں پر اپنی توجہ مرکوز کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں ہے جو حقیقی مسلم ایشوز سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ جو جانبداری سے کام نہیں لیتے۔ جو میڈیا میں رہ کر ہمارا بھی کام کرتے ہیں۔ جو یہ سمجھتے ہیں کہ میڈیا کا ایک بہت بڑا طبقہ متعصب ہے اور مسلمانوں کی امیج خراب کرنا چاہتا ہے۔ وہ میڈیا کے اندر رہ کر ہمارا مقدمہ لڑتے ہیں۔ گجرات کے فسادات ہوں یا بابری مسجد کے انہدام کا واقعہ ہو یا دوسرے ایسے معاملات ہوں جن کا براہ راست تعلق مسلمانوں سے رہا ہے، غیر جانبدار اور انصاف پسند صحافیوں نے مظلوموں کے حق میں رپورٹنگ کی ہے۔ ہمیں ایسے لوگوں کی تلاش

کرنے اور ان کے ساتھ روابط قائم کر کے ان سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔

اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس کی سب سے زیادہ اہمیت ہے کہ میڈیا اب خبریں دیتا نہیں بلکہ بیچتا ہے۔ جو خبر اپنے دامن میں بکنے کے جتنے زیادہ امکانات رکھتی ہے، وہ اس کو اتنا ہی زیادہ ہائی لائٹ کرتا ہے۔ یہ بات بھی بہت حد تک درست ہے کہ بہت سے ہندی اور انگریزی کے صحافی اسلام اور مسلمانوں سے متعلق بہت سی باتوں اور مسائل سے لاعلم رہتے ہیں۔ وہ سنی سنائی باتوں کو یا افواہوں کو حقیقت سمجھتے ہیں اور انہی کی بنیاد پر اپنی رپورٹیں تیار کرتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کی شناخت کی جائے اور جب مسلمانوں اور اسلام سے متعلق کوئی تنازعہ اٹھے تو انھیں حقیقی صورت حال بتائی جائے اور ان کے ذہنوں سے لاعلمی کے غبار صاف کیے جائیں۔ اس بارے میں ہم علما اور مثبت فکر کے حامل دانشوروں کی خدمات حاصل کر سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فتویٰ اور جہاد کا معاملہ ہے۔ وہ ہر مسلم مذہبی شخص کی جانب سے یا کسی امام کی جانب سے دیے جانے والے بیان کو فتویٰ قرار دے دیتے ہیں اور اسی طرح جہاد کے حقیقی مفہوم سے بھی وہ واقف نہیں۔ انھیں یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ اسلام میں اصل جہاد کسے کہتے ہیں۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مسلمان اپنے بارے میں یا اسلام کے بارے میں لوگوں کو بتا نہیں پاتے۔ مثال کے طور پر آج خود مسلمانوں کو ہی اس کا بہت کم علم ہے کہ تحریک آزادی کے آغاز میں مسلمان اور علما ہی پیش پیش رہے ہیں۔ اگر کسی پروگرام میں غیر مسلموں کے سامنے ایسے حقائق آتے ہیں تو وہ حیرت زدہ رہ جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اس بارے میں بھی میڈیا کے لوگوں کو باخبر کریں۔

اخبار یا ٹی وی یا ریڈیو سب کی اپنی جگہ پر اپنی اپنی اہمیت ہے۔ کسی کی زیادہ تو کسی کی کم۔ لہٰذا ان سب پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اس تعلق سے یہ بات بڑی اہم ہے کہ ہمیں اپنی ساری توجہ صرف نیشنل میڈیا پر ہی مرکوز نہیں کرنی چاہیے۔ مقامی میڈیا اور مقامی اخبارات یا مقامی زبانوں کے پریس کی کچھ کم اہمیت نہیں ہے۔ چھوٹے چھوٹے اخبارات نازک مواقع پر بڑے بڑے رول ادا کر جاتے۔ گجرات فسادات کے دوران اگر کئی گجراتی اخباروں نے اشتعال انگیز

رپورٹنگ کی تھی تو کئی اخباروں نے حقائق کو سامنے رکھنے میں اہم رول ادا کیا تھا۔ اسی طرح بابری مسجد انہدام کے موقع پر فیض آباد اور لکھنؤ کے بعض چھوٹے اور گمنام اخباروں نے بھی بڑی مبنی بر انصاف رپورٹنگ کی تھی۔ ہمارے پاس جو فنڈ ہو اس میں ان کا بھی خاطر خواہ حصہ ہونا چاہیے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کے بارے میں بھی تمام تفصیلات رکھیں اور ان کے ایڈیٹروں اور نمائندوں کے ساتھ ربط ضبط بڑھائیں۔

ایک معاملہ میڈیا اداروں میں مسلم نمائندگی میں اضافے کا ہے۔ حالیہ کچھ برسوں میں میڈیا میں مسلم نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور بہت سے مسلم نوجوان مختلف نیوز چینلوں پر انتہائی اہم ذمہ داریاں انجام دے رہے ہیں۔ اخباروں میں بھی خاصی تعداد میں مسلم نوجوان آئے ہیں۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ پہلے جہاں ایسے مسلم صحافی جو ملی درد رکھتے ہوں خال خال پائے جاتے تھے مگر آج وہ اکثر اداروں میں موجود ہیں۔ جس کی وجہ سے مسلمانوں کے تعلق سے ان اداروں کے رویے میں تبدیلی آئی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ میڈیا اداروں میں ملی درد رکھنے والے مسلم نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بااثر اور ذمہ دار اور اسی کے ساتھ مخیرّ اور سرکردہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے مسلم نوجوانوں کی ہر طرح سے مدد کریں جو میڈیا کے پیشہ ورانہ کورسز کر کے میڈیا کو اپنے ذریعۂ معاش کے طور پر اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسے نوجوان ان اداروں میں پہنچتے ہیں تو اس شکایت میں کمی آسکتی ہے کہ میڈیا مسلمانوں کے ساتھ سوتیلا یا دشمنوں جیسا سلوک کرتا ہے۔

اگر ہم ان اہم اور مشکل مراحل کو طے کرنے میں کامیاب ہو گئے تو میدان ہمارے ہاتھ میں ہوگا۔ شرط صرف اتنی سی ہے کہ ہم اپنا رویہ بدلیں اور میڈیا کے ساتھ دشمن کے بجائے ایک دوست جیسا سلوک کریں۔ اپنے طویل پیشہ ورانہ تجربے کی روشنی میں میرا ذاتی خیال ہے کہ اگر ہم اس کو اپنا دوست بناتے ہیں تو وہ بھی ہم سے دشمنوں جیسا سلوک نہیں کرے گا۔

میڈیا اور طلبائے مدارس

میڈیا کی اہمیت سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کرسکتا۔ مسلمان بھی اس کی اہمیت، اثر انگیزی اور پروپیگنڈے کی قوت سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ اس کے شکار بھی ہیں۔ اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ صالح فکر کے مسلم نوجوان بڑی تعداد میں میڈیا میں آئیں۔ اس سلسلے میں دینی مدارس پر بھی بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ انھیں چاہیے کہ وہ بھی اس کی اہمیت کو سمجھیں، اس کی طرف متوجہ ہوں اور میڈیا کو بطور پیشہ اختیار کرنے کے لیے طلبہ کی حوصلہ افزائی کریں اور اس کی راہ ہموار کریں۔ لیکن اس کے لیے انھیں عملی قدم اٹھانا ہوگا۔ سب سے پہلی بات تو یہ کہ انھیں مدارس کے نصاب میں ایک سبجکٹ میڈیا کا بھی شامل کرنا چاہیے۔ طلبہ کے علم میں اضافے کے لیے پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا سے وابستہ صحافیوں کو موقع بہ موقع ادارے میں مدعو کیا جانا چاہیے اوران سے لیکچرز دلوائے جانے چاہئیں۔ وقت کا تقاضہ ہے کہ طلبائے مدارس کے درمیان سے ایک ایسی کھیپ نکلے جو میڈیا میں جانے کی صلاحیت رکھتی ہو اور جو صرف اردو اور عربی سے ہی واقف نہ ہو بلکہ انگریزی، ہندی اور دوسری زبانوں میں بھی لکھنے اور بولنے کی مہارت سے لیس ہو۔ مختلف یونیورسٹیوں اور کالجوں میں میڈیا کی تعلیم دی جاتی ہے اور ڈپلومہ و ڈگری کورسز کرائے جاتے ہیں۔ فارغین مدارس کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کریں کہ وہ ان میں داخلہ لے سکیں۔ اگر وہ ڈپلومہ یا ڈگری لے کر نکلتے ہیں تو یقیناً انھیں میڈیا ہاؤسز میں کام کرنے کے مواقع ملیں گے۔

حالیہ برسوں میں فارغین مدارس کی بڑی تعداد میڈیا میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن اردو میڈیا میں جانے والوں کی تعداد زیادہ اور ہندی اور انگریزی میں جانے والوں کی کم ہے۔ ہم لوگ اردو

والے ہیں۔ خود ہی لکھتے اور خود ہی پڑھتے ہیں۔ ضرورت برادران وطن کو پڑھانے کی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ فارغین مدارس انگریزی اور ہندی میں بھی لکھنے کی اچھی استعداد پیدا کریں۔ اس سلسلے میں انگریزی اور ہندی کے صحافیوں کی خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اگر وہ نہ ملیں تو انگریزی داں حضرات سے رابطہ قائم کریں اور کسی کو اپنا استاد بنائیں۔ استادی شاگردی کے بغیر فن میں جلا پیدا نہیں ہوتی۔ پہلے صحافت میں استادی شاگردی کی بڑی مستحکم روایت موجود تھی۔ لیکن کمپیوٹر کی آمد نے اس روایت کو کمزور کیا ہے۔ آج اردو اخباروں میں کوئی استاد نہیں ہوتا۔ جبکہ پہلے اخباروں کے دفاتر میں نوآموز صحافیوں کو سینئر صحافیوں کے حوالے کر دیا جاتا تھا جو انھیں صحافت کے گُر سکھاتے تھے۔

میڈیا میں جانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ تین چار زبانیں جانیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کو ان تمام زبانوں میں سے کسی میں بھی کام کرنے کا موقع مل جائے گا۔ آپ لوگ عربی داں تو ہیں ہی، اردو اور انگریزی داں بھی بنیں۔ ترجمے کی مشق بھی کی جانی چاہیے۔ اس میدان میں آپ کے کرنے کا کام یہ ہے کہ آپ عربی اخباروں کا مطالعہ کریں اور ان کی اہم خبروں اور مضامین کا ترجمہ کریں۔ یہ چیزیں مختلف اخباروں میں شائع ہوسکتی ہیں۔ اسی طرح ہندی اور انگریزی اخباروں کے مطالعے کو بھی اپنی روزمرہ کی مصروفیت میں شامل کر لیں۔ ترجمے کے دوران جس لفظ کا مطلب معلوم نہ ہو اس کو یا تو لغت میں دیکھ لیں یا اپنے کسی ساتھی سے پوچھ لیں۔ لغت میں دیکھیں تو اس کے اوپر نیچے کے بھی دو چار الفاظ دیکھ لیں اور ان کے معنی ذہن نشین کر لیں۔ ساتھیوں سے پوچھنے میں کسی جھجک کا مظاہرہ نہ کریں۔ آجکل گوگل ترجمے کا بڑا زور ہے۔ آپ اس پر بالکل انحصار نہ کریں۔ انگریزی سے ہندی میں گوگل ترجمہ تو کسی حد تک درست ہوتا ہے حالانکہ اس میں بھی بڑی خامیاں ہوتی ہیں۔ لیکن انگریزی سے اردو ترجمہ تو اللہ کی پناہ۔ جانے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا آپ اس پر بالکل بھروسہ نہ کریں۔ اس سے جتنا دور رہیں اتنا ہی اچھا ہے۔ ورنہ آپ کی زبان خراب ہو جائے گی اور آپ ترجمہ نگاری کی صلاحیت سے بھی محروم ہو جائیں گے۔

اگر آپ نے صحافت کو پیشے کے طور پر اختیار کر لیا ہے تو اس سے وفاداری برتیں۔ صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ کچھ لوگ بہت جلد بہت بڑے صحافی بن جانا چاہتے ہیں۔ لیکن

یاد رکھیں کہ بڑے صحافی یوں ہی نہیں بن جاتے۔ مولانا آزاد بہت بڑے صحافی تھے۔ لیکن انھوں نے بھی الہلال نکالنے سے قبل چھ سال تک اس پر غور و خوض کیا تھا اور کم از کم نصف درجن اخباروں میں کام کیا تھا اور کئی چھوٹے موٹے اخبارات بھی نکالے تھے۔

اخباروں میں عملی تجربہ مضامین کی اشاعت سے بالکل مختلف چیز ہے۔ مولانا ماہر القادری بھی ایک بڑے صحافی تھے۔ انھوں نے ''فاران'' نامی ایک مذہبی ماہنامے کا اجرا کر کے بڑا نام کمایا تھا۔ وہ بہت اچھے شاعر بھی تھے۔ انھیں بھی صحافت کا بڑا شوق تھا۔ ان کے مضامین اپنے دور کے ایک بڑے اور مقبول عام اخبار ''مدینہ'' بجنور میں شائع ہوتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ مدینہ جیسے اخبار میں کام کریں۔ وہ اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ چونکہ وہ بہت بڑے ادیب اور شاعر ہیں اور ادب و انشا سے خوب واقف ہیں لہٰذا اخبار میں کام کرنا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوگا۔ انھوں نے مدینہ اخبار میں درخواست دے دی۔ انھیں بلایا گیا اور ایک انگریز افسر کا بیان ترجمہ کرنے کو دیا گیا۔ وہ رات بھر لے کے بیٹھے رہے۔ جو ترجمہ کیا وہ بھی انتہائی ناقص۔ وہ بہت بد دل ہوئے اور ''مدینہ'' چھوڑ کر واپس چلے جانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ لیکن اس وقت اس اخبار کے ایڈیٹر نصر اللہ خاں عزیز نے ان کو سمجھایا اور پھر انھوں نے محنت و مشقت سے کام لیا اور ایک بڑے صحافی بنے۔ خشونت سنگھ انگریزی کے بہت بڑے صحافی اور کالم نگار تھے۔ ان کا کالم ''نا کاہو سے دوستی نا کاہو سے بیر'' بہت مقبول تھا۔ تمام بڑے اخبار اس کو شائع کرتے تھے۔ وہ اس کالم کو سادہ اور آسان زبان میں لکھتے جو چھوٹا مگر بہت جامع ہوتا۔ تقریباً سو سال کی عمر میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے اپنی خودنوشت میں لکھا ہے کہ اواخر عمر میں بھی وہ اپنا کالم لکھنے کے بعد کم از کم چھ مرتبہ پڑھتے تھے تب کہیں جا کر اخبار میں چھپنے کے لیے بھیجتے تھے۔

جیسا کہ میں نے ذکر کیا کہ حالیہ برسوں میں فارغین مدارس کی بڑی تعداد اردو صحافت میں داخل ہوئی ہے۔ لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ بہت سے فارغین بھی اردو کے بہت سے ریسرچ اسکالرس کی مانند اچھی اردو نہیں لکھ پاتے۔ اچھی اردو جاننے اور لکھنے کے لیے فارسی زبان کی شدبد ضروری ہے۔ اس کے علاوہ شعر و ادب سے بھی دلچسپی ہونی چاہیے۔ جس نے اس سمندر میں

غوطے نہیں لگائے وہ اچھی زبان نہیں لکھ سکتا۔ اس کے پاس الفاظ کا ذخیرہ نہیں ہوگا۔ مترادفات نہیں ہوں گے۔ خوبصورت الفاظ اور مترادفات کے موتی اسی بحر ذخار میں ملیں گے۔

اگر آپ کوچۂ صحافت میں قدم رکھیں تو مثبت صحافت کریں۔ یاد رکھیں قلم بہت محترم ہوتا ہے۔ اس کو بڑا وقار حاصل ہے۔ آپ اس کا احترام کریں گے تو وہ دنیا میں آپ کو محترم بنا دے گا۔ آپ کو چاہیے کہ آپ اس کے وقار کو ملیا میٹ نہ ہونے دیں۔ جس ہاتھ میں قلم ہوتا ہے، قلم اس سے بہت کچھ تقاضے کرتا ہے۔ آپ کو اس کے تقاضے کا لحاظ رکھنا ہوگا۔ بہت سے صحافی حضرات اہل ثروت کو بلیک میل کرتے ہیں اور ان کے خلاف جھوٹی سچی باتیں لکھ کر مالی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ خبردار! آپ ایسا ہرگز نہ کریں۔ اپنے قلم کو ان آلائشوں سے پاک رکھیں۔ کسی کی کردارکشی نہ کریں۔ دروغ گوئی اور مبالغہ آرائی سے بچیں۔ صرف سچ کو اپنا معیار بنائیں۔

اگر کام کے دوران یا اس کے بعد کسی نے اپ کی کسی رپورٹ یا کسی مضمون میں کسی خامی اور غلطی کی نشاندہی کی ہے تو آپ ہرگز برا نہ مانیں۔ اس کو اپنا دشمن سمجھنے کے بجائے اپنا دوست اور خیرخواہ سمجھیں۔ کیونکہ اگر اس نے آپ کی غلطی کی نشاندہی نہ کی ہوتی تو آپ یہ جان ہی نہیں پاتے کہ آپ کون سی غلطی کرتے چلے آرہے تھے۔ اگر آپ کے ذمہ خبرسازی کا کام ہے تو یہ جاننا بے حد ضروری ہے کہ خبر کیسے بنائی جاتی ہے۔ خبرسازی میں ''الٹا اہرام'' کو ذہن میں رکھنا ہوتا ہے۔ اہرام میں بنیاد چوڑی ہوتی ہے اور اوپری حصہ پتلا اور نوکیلا ہوتا چلا جاتا ہے۔ آپ کو بنیاد سے آگے نہیں بڑھنا ہے بلکہ سب سے پہلے اوپری سرے پر پہنچنا ہے۔ میں اسے مثال کے طور پر سمجھاتا ہوں۔ اگر کہیں کوئی پروگرام ہو رہا ہے، جس میں پہلے کچھ چھوٹے لوگوں نے تقریریں کیں اور آخر میں صدر اجلاس نے یا جو سب سے اہم شخص ہے وہ، یا مہمان خصوصی نے خطاب کیا۔ ہمیں وہیں سے اپنا آغاز کرنا ہے۔ یعنی مہمان خصوصی یا صدر جلسہ کے خطاب سے خبر شروع کرنی ہے۔ پھر رفتہ رفتہ نیچے آنا ہے۔ یعنی سب سے اہم شخص سب سے اوپر اور غیر اہم شخص نیچے۔ خبر کی ہیڈنگ یا سرخی میں بھی یہی التزام کرنا ہے۔ یعنی سب سے اہم شخص نے جو بات کہی ہے اس میں سے سرخی نکالنی ہے۔ اور اگر کسی ایک موضوع پر کئی افراد نے تقریریں کی ہیں تو آپ یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان تمام تقریروں کا جو

لب لباب ہے اس کو ہیڈنگ بنائیں۔ ایسے پروگراموں کی خبر سازی میں ایک انٹرو یا ابتدائیہ بنانا ہوتا ہے۔ انٹرو میں خلاصہ آجائے تو بہت اچھی بات ہے۔ اس کے بعد پھر اس خلاصے کی تشریح کریں۔

یہ بھی یاد رکھیں کہ خبر خبر ہوتی ہے تقریر نہیں۔ اخباروں کے دفاتر میں بالخصوص مدارس کی جانب سے جو خبریں ارسال کی جاتی ہیں ان میں غیر ضروری تفصیلات ہوتی ہیں۔ بھاری بھرکم الفاظ استعمال کیے جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خبر کہیں گم ہو جاتی ہے۔ وہ خبر نہیں تقریر ہوتی ہے۔ تقریر بالکل نہیں ہونی چاہیے۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ جو خبر جتنی بڑی ہے وہ اتنی ہی اہم ہے، جی نہیں۔ جو خبر چھوٹی اور ٹو دی پوائنٹ ہے وہ زیادہ اہم ہے۔ خبروں میں لفاظی نہیں چل سکتی۔ خبر خبر ہوتی ہے ادب نہیں۔ ادب میں آپ بھاری بھرکم الفاظ اور پرشکوہ جملوں کا استعمال کریں مگر خبر میں نہیں۔ خبر انتہائی آسان، عام فہم اور سادہ زبان میں ہونی چاہیے۔ مولانا محمد عثمان فارقلیط اپنے دور کے بڑے جید صحافی تھے۔ انھوں نے ہندو پاک کے متعدد اخباروں میں کام کیا تھا۔ وہ جمعیۃ علمائے ہند کے مقبول اخبار ''الجمعیۃ'' کے آزادی کے بعد پچیس سال تک ایڈیٹر رہے۔ ان کے اداریے بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے تھے۔ کم تعلیم یافتہ اور عالم و فاضل سبھی پڑھتے تھے۔ لیکن ان کی زبان انتہائی سادہ ہوتی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ میں ایسی زبان لکھتا ہوں جو ایک رکشہ چلانے والا بھی سمجھ لے۔ اور اخبار میں یہی زبان ہونی چاہیے۔ اگر آپ اردو صحافت میں ہیں تو آپ کو اس کا بھی خیال رکھنا ہوگا کہ آسان زبان لکھنے کے ساتھ اردو کے مزاج کو بھی سامنے رکھیں۔ ہندی نیوز چینلوں کی زبان اردو میں نہیں چل سکتی۔

یہ محض چند مشورے ہیں ورنہ کہنے کو بہت سی باتیں ہیں۔ اگر آپ ان مشوروں پر عمل کریں تو ایک اچھے اور بڑے صحافی بن سکتے ہیں۔ میری دعا ہے اور خواہش بھی کہ آپ لوگوں میں بڑے صحافی پیدا ہوں جو اپنے دور کے مولانا آزاد، مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمد عثمان فارقلیط، مولانا ظفر علی خاں، مولانا عبد المجید سالک اور مولانا غلام رسول مہر اور میڈیا میں جا کر چیلا پتی راؤ، خشونت سنگھ، کلدیپ نیر، پرنے رائے، راج دیپ سردیسائی اور رویش کمار بن کر ابھریں اور آسمان صحافت پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمکیں۔

اسلاموفوبیا

مغربی میڈیا کا مرغوب موضوع

مغربی میڈیا پہلے بھی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف محاذ کھولے ہوئے تھا اور اب بھی کھولے ہوئے ہے۔ اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنا اس کا پسندیدہ موضوع ہے۔ وہ اپنی رپورٹنگ سے پوری دنیا میں اسلاموفوبیا کی لہر پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہتا ہے اور وہ اس میں بڑی حد تک کامیاب بھی ہے۔ نائن الیون واقعہ کے بہت پہلے سے ہی میڈیا اپنے اس ایجنڈے پر عمل پیرا رہا ہے۔ البتہ اس واقعہ کے بعد اس کی اسلام دشمنی کی دھار تیز ہوگئی اور اس نے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنا اپنا اون پوائنٹ پروگرام بنالیا۔ وہ مسلمانوں کو وحشی قوم کی مانند پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور یہ باور کراتا ہے کہ دہشت گردی اور مسلمان ایک دوسرے کے مترادف یعنی ہم معنیٰ ہیں۔ میڈیا کی یہ مہم اثر دکھاتی ہے اور اسلام مخالف قوتیں اسلام اور مسلمانوں کے خلاف حملے تیز کردیتی ہیں۔ جس کا خمیازہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو بھگتنا پڑتا ہے۔

دراصل مغربی میڈیا پوری دنیا کے میڈیا پر حاوی ہے۔ دوسرے خطوں کا میڈیا بھی اس کی نقالی کرتا ہے اور اس کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اسلام اور مسلمانوں کو بدنام کرنے کی مہم میں شامل ہے۔ اس سلسلے میں دنیا کے مختلف اداروں کی جانب سے سروے کرائے گئے ہیں اور بعض میڈیا اداروں نے بھی سروے کیا ہے۔ سروے رپورٹوں کے نتائج کے مطابق مغربی میڈیا اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جی جان سے برسرپیکار ہے۔ چونکہ میڈیا کسی بھی معاملے میں رائے عامہ

بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے لہٰذا تعلیم یافتہ افراد بھی اس کے بے بنیاد پروپیگنڈے کے شکار ہو جاتے ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کو انسانیت کے دشمن تصور کرنے لگتے ہیں۔ وہ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں کہ اسلام تو پوری دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا ہے۔ ہمارے آخری پیغمبر کو رحمت اللعالمین کہا گیا ہے۔ لیکن مغربی میڈیا اس کو نظر انداز کرتا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ لوگ مسلم نام والی تنظیموں کی سرگرمیوں کو اپنی دلیل میں پیش کرتے ہیں۔ خاص طور پر داعش، القاعدہ یا اسی طرح کی دیگر مسلم ناموں والی تنظیموں کو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان جیسی تنظیموں کی سرگرمیاں انسانیت مخالف ہیں اور کوئی بھی ان کی حمایت نہیں کر سکتا۔ یہاں تک کہ مسلمانوں کی اکثریت بھی ان سرگرمیوں کی تائید و تصدیق نہیں کرتی۔ بلکہ ۹۹ فیصد مسلمان ان کے خلاف ہیں اور وہ اس بات میں یقین رکھتے ہیں کہ ان تنظیموں کا حقیقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسلام کی ان کی اپنی تشریح ہے جسے امت مسلمہ نہیں مانتی۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ان تنظیموں کے وجود میں آنے سے قبل اسلام اور مسلمانوں کو ہدف نہیں بنایا جاتا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ یہ تنظیمیں آج کی پیداور ہیں لیکن اسلاموفوبیا کا رجحان صدیوں پرانا ہے اور میڈیا اس رجحان کو ہوا دیتا اور اسلام کے خلاف عالمی فضا بنانے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔

میڈیا کے پروپیگنڈے کا یہ نتیجہ ہے کہ بہت سے لوگوں کے اذہان مسموم ہو گئے ہیں اور وہ بھی وہی بولی بولتے ہیں جو میڈیا بولتا ہے۔ کناڈا کے کٹر مصنف مارک اسٹین کا کہنا ہے کہ مسلمان جس معاشرے میں رہتے ہیں اسی کے درپے ہو جاتے ہیں۔ ڈنمارک کا سیاست داں اور دائیں بازو کا مقبول رہنما گریٹ وائلڈرس مسلمانوں کی مقدس کتاب قرآن مجید کو امریکہ، یوروپ اور پوری دنیا میں دہشت گردی، تشدد اور نفرت کی وجہ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ دہشت گرد سرگرمیوں میں ملوث عناصر (نعوذ باللہ) قرآن سے تشدد کی ترغیب حاصل کرتے ہیں۔ برطانیہ کے رجعت پسند سیاست داں اور کمنٹیٹر ڈگلس مری کے مطابق برطانیہ میں اسلام جتنا کم ہوگا دہشت گردی بھی اتنی ہی کم ہوگی۔

بائیں بازو کے سرکردہ کمنٹیٹر بھی اسی قسم کے اسٹیریوٹائپ خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر امریکہ کا نیوروسائنٹسٹ سیم ہیرس اس بات پر زور دیتا ہے کہ اسلامی اصول و نظریات اور مسلم دہشت گردی میں براہ راست رشتہ ہے۔ اسی طرح امریکی کامیڈین اور ٹیلی ویژن پروڈیوسر بل ماہر کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کے اندر عدم رواداری اور وحشی پن کے جراثیم ہیں جو ان کو داعش جیسے دہشت گرد گروپ کے قریب کرتے ہیں۔ سومالی نژاد ڈنمارک امریکی کارکن اور رائٹر ایان ہرسی علی کا عقیدہ ہے کہ تشدد اسلام کے نظریے میں پنہاں ہے۔

لیکن یہ تمام لوگ اس بات کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رجحان سازی غیر حقیقی پروپیگنڈے کی بنیاد پر ہے۔ سچائی یہ ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان بم دھماکوں اور سویلین کے قتل اور دہشت گردی کی تمام شکلوں کی پرزور انداز میں مذمت کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں جو سروے کیے گئے ہیں ان کے نتائج بتاتے ہیں کہ ۹۹ فیصد مسلمان دہشت گردی کی نہ صرف سختی سے مذمت کرتے ہیں بلکہ اس کو سرے سے خارج کرتے ہیں۔ ۲۰۱۶ء میں برطانوی مسلمانوں نے ایک سروے کیا تھا جو بے حد خرچیلا تھا اور جس میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا تھا کہ دس برطانوی مسلمانوں میں سے نو نے دہشت گردی کو سرے سے خارج کر دیا ہے۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ دہشت گرد کارروائیوں میں ملوث افراد سے ہمدردی رکھتے ہیں یا ان کے خلاف ہیں تو ۹۰ فیصد نے کہا کہ وہ ان کے خلاف ہیں اور ان کی مذمت کرتے ہیں۔

جب یہی سوال جرمنی، فرانس اور برطانیہ میں عام لوگوں سے کیا گیا تو انھوں نے وہی بات کہی جو مسلمانوں نے کہی تھی۔ فرانسیسی عوام کے ایک فیصد نے، جرمنی کے ایک فیصد اور برلن کے نصف فیصد عوام نے مسلمانوں کی رائے سے عدم اتفاق کیا۔ نارتھ امریکہ میں کیے جانے والے سروے کا بھی یہی نتیجہ نکلا تھا۔ سروے کرنے والے امریکہ کے ایک بین الاقوامی ادارے ''پیو ریسرچ سینٹر'' نے اپنے سروے میں مسلمانوں سے پوچھا کہ کیا سیاسی، سماجی اور مذہبی بنیادوں پر سویلین کے قتل کو جائز ٹھہرایا جا سکتا ہے تو ۸۴ فیصد کی رائے تھی کہ نہیں بالکل جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

مغربی میڈیا جب چاہتا ہے کوئی نئی اصطلاح گھڑ دیتا اور کوئی نیا شوشہ چھوڑ دیتا ہے۔ دنیا

کے بہترین رسائل جن میں ادبی، تحقیقی اور سیاسی پرچے شامل ہیں مغربی ممالک سے شائع ہوکر ساری دنیا میں پھیل جاتے ہیں۔ان رسائل میں اکثر اوقات ایک خاص نقطۂ نظر پیش کیا جاتا ہے جو مغربی دنیا کے مفادات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ عالمی شہرت کے رسالے ٹائم، اکانومسٹ اور نیوز ویک پر یہودی لابی غالب ہے۔ یہ رسالے ہر ہفتے بین الاقوامی سیاست پر تبصرے کرتے اور تجزیے شائع کرتے ہیں۔ان کی رپورٹوں اور مضامین کی بنیاد پر بعض اوقات حکومتیں تک بدل جاتی ہیں۔ جب کسی نا قابل قبول حکمراں کو بدلنا مقصود ہوتا ہے تو میڈیا سے ہراول دستے کا کام لیا جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مغربی میڈیا بڑی طاقتوں کی خفیہ ایجنسیوں کی ملی بھگت سے ایسے حکمرانوں کی ذاتی زندگی اور قومی کردار کے بارے میں من گھڑت کہانیاں شائع کرتا ہے اور آزادیٔ اظہار کے نام پر ان شخصیات کی اس طرح کردارکشی کی جاتی ہے کہ نہ صرف عالمی سطح پر ان کا امیج خراب ہوتا ہے بلکہ خود ان ممالک کے عوام بھی اپنے حکمرانوں سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ بڑی طاقتوں کے ذریعے ناپسندیدہ حکمرانوں کے بارے میں عجیب وغریب خفیہ داستانیں پھیلائی جاتی ہیں۔ جبکہ اپنے حواری اور پسندیدہ حکمرانوں کی ایسی حرکات چھپائی جاتی ہیں۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ موجودہ دور میں میڈیا کا کردار فیصلہ کن حیثیت اختیار کرگیا ہے اور جو مقاصد ماضی میں فوجی یلغار سے حاصل کیے جاتے تھے وہ اب میڈیا کی یلغار سے حاصل کیے جاسکتے ہیں۔

اگر ہم میڈیا کے کرادر کا مزید جائزہ لیں تو پائیں گے کہ مغربی میڈیا کی مہربانی سے ایک مردہ اصطلاح میں جان ڈال دی گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک متروک اصطلاح پوری دنیا میں مقبول ہوگئی۔ وہ اصطلاح ہے فنڈامنٹلزم یعنی بنیاد پرستی کی۔ انگریزی لغات کے مطابق فنڈامنٹلزم کا مطلب ہے عیسائیت کے پرانے اعتقادات پر یقین رکھنا۔ موجودہ عیسائیت جو سائنس سے متاثر ہے، اس کے مقابلے میں پرانی تعلیمات کو اور بائبل انجیل کے اصل الفاظ کو ماننا۔لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے تو اسلام میں دراصل بنیاد پرستی کا تصور اس طرح موجود نہیں جس طرح عیسائیت میں ہے۔لیکن مغربی میڈیا نے اسلام میں بنیاد پرستی کی اصطلاح ایجاد کرکے

ان مسلمانوں کو نفرت اور تضحیک کا نشانہ بنایا ہے جو عملاً مسلمان ہیں۔ اسلام میں بنیاد پرستی کا مطلب اسلام کے بنیادی عقائد پر عمل کرنا ہے۔ ہر وہ مسلمان جو نماز پڑھتا، روزے رکھتا اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے اسے مغربی میڈیا بنیاد پرست کہے گا۔ یعنی اگر مسلمان نماز پڑھتا ہے تو وہ بنیاد پرست ہے اور اگر وہ تہجد گزار ہے تو پھر وہ بہرحال دہشت گرد ہے۔

یہ اصطلاح چند برس قبل افغانستان کی جنگ کے حوالے سے استعمال ہونی شروع ہوئی اور چند ہی برسوں میں اس نے دنیائے اسلام کو معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مغربی میڈیا نے نہایت ہوشیاری سے بنیاد پرستی کا مطلب جاہل، ترقی دشمن، دہشت گرد، دقیانوسی اور کٹر نظریات کے حامل کے طور پر پیش کیا۔ مغربی میڈیا نے اسلامی بنیاد پرستی کے تصور کو مسخ کیا ہے اور اس کا مفہوم بدل کر دنیائے اسلام کو معذرت خواہانہ انداز اپنانے پر مجبور کر دیا ہے۔ میڈیا کس طرح اسلامی بنیاد پرستی کا حلیہ بگاڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اخبارات کے مطابق کہا جا رہا ہے کہ خواتین کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وجہ اسلامی بنیاد پرستی کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔ اسلامی سزاؤں کو ظالمانہ سزائیں کہا جاتا ہے۔ پردے کے احکامات کا میڈیا میں سرعام مذاق اڑایا جاتا ہے۔ جہاد کو دہشت گردی کا نام دیا جاتا ہے۔

غرضیکہ اسلام کے زریں اصولوں کو دہشت گردی کا جامہ پہنا دیا گیا ہے اور اس کا سارا کا سارا کریڈٹ مغربی میڈیا کو جاتا ہے۔ وہ جس طرح اسلام کو بدنام کرنے کی کوشش میں صحافتی اصولوں کی دھجیاں اڑاتا ہے وہ اپنے آپ میں ایک بہت بڑا جرم ہے۔ لیکن وہ یہ جرم دھڑلے سے کر رہا ہے اور کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں کہ تمھارے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ بلکہ دنیا کا بہت بڑا طبقہ اس کی رپورٹنگ سے متاثر ہو جاتا ہے اور وہ اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں وہی رائے بنا لیتا ہے جو میڈیا بنانا چاہتا ہے۔

ویبینار

عہد حاضر کا جدید پلیٹ فارم

انسانی تخیلات کی رفتار بہت تیز ہے۔ زمانہ کتنی ہی ترقی کر لے اور خواہ وہ پوری کائنات کو مسخر کر لے تب بھی وہ اختراعات و تخیلات کے قافلے کو پابہ زنجیر نہیں کر سکتا۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جدت طرازی خواہ کتنی ہی اونچی جست لگا لے وہ قدیم انسانی اقدار و روایات کو زیر نہیں کر سکتی۔ ایک بہت پرانا مقولہ ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہوتی ہے۔ جب کرونا وائرس کے خونی پنجے نے پوری دنیا کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور قزاقِ اجل نے اس کی سرپرستی میں انسانی زندگی کی پونجی لوٹنی شروع کر دی تو پوری دنیا یکلخت ایک نادیدہ دشمن کے نشانے پر آ گئی۔ دنیا کی سب سے ذی شعور مخلوق یعنی انسانوں پر بیک جنبشِ وائرس سکتہ طاری ہو گیا۔ دنیا ٹھپ ہو کر رہ گئی اور ایسا محسوس ہونے لگا کہ اب کارخانۂ عالم کی گرم بازاری دوبارہ شروع نہیں ہو سکتی۔ وائرس کے نشانے پر انسان کیا آیا اس کی تخلیقی حس بھی متاثر ہو گئی اور اس کے ذہنِ رسا کا قافلہ تھک کر بیٹھ گیا۔ لیکن پھر قدرت کے عطا کردہ اُس کے شعور نے دھیرے دھیرے انگڑائی لینی شروع کی اور پھر اس قافلے نے جنبش کی۔ آگے بڑھنے لگا اور اب ایک بار پھر زندگی کی ہماہمی لوٹ آئی ہے۔

کرونا وائرس کے بحرانی دور میں جہاں زندگی ٹھپ ہو کر رہ گئی تھی وہیں انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے ایسی اونچی جست لگائی کہ دنیا میں مواصلات اور ربط وضبط کا ایک نیا کلچر پیدا ہو گیا۔ یہ نیا کلچر ہر جگہ دیکھنے میں آیا۔ حکمراں طبقے میں بھی اور عوامی حلقوں میں بھی۔ دانش گاہوں

میں بھی اور کاروباری اداروں میں بھی۔ رفتہ رفتہ پوری دنیا آن لائن ہوگئی۔ انٹرنیٹ انسانی سماج کا جز ولاینفک بن گیا۔ گو کہ پوری دنیا کے بند ہو جانے کی وجہ سے کچھ دنوں تک تمام زبانوں کی ادبی و صحافتی سرگرمیاں ماند پڑ گئی تھیں لیکن پھر انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی نے مہمیز لگائی اور ان سرگرمیوں کا سلسلہ از سر نو شروع ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ ادب کی ایک نئی صنف نے جنم لیا جسے کرونائی ادب یا کرونا ادب کہا جانے لگا۔ کرونا افسانے لکھے جانے لگے اور کرونا غزلیں اور نظمیں کہی جانے لگیں۔ بلاشبہ ادبی ذخیرے میں یہ ایک اضافہ ہے۔ البتہ منظر نامہ قدرے تبدیل ہو گیا۔ پہلے ادبی مباحث کے لیے سمینار ہوا کرتے تھے۔ لیکن لاک ڈاون کے دور میں جبکہ سماجی فاصلے کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی بہت سی پابندیوں اور بندشوں میں جکڑ اٹھی، سمیناروں کا انعقاد ناممکن ہو گیا۔ ایسے میں دنیا کو ایک نیا لفظ ''ویبینار'' مل گیا اور کانفرنسوں کے لیے ویب کانفرنسنگ کا لفظ استعمال ہونے لگا۔

بہرحال اردو زبان و ادب کا قافلہ بھی دیگر زبانوں کے قافلوں کی مانند کرونا بحران کی زد پر آیا اور اس کی بھی گاڑی کچھ دنوں تک پٹری سے اتری رہی۔ لیکن اہل اردو بھی دوسروں سے کم نہیں۔ وہ بھی انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی کے فیوض و برکات سمیٹنے کی اہلیت و قابلیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا انھوں نے بھی دوسری زبانوں کے ادیبوں اور دانشوروں کی مانند خود کو آن لائن کر لیا۔ اردو ادب کی سرگرمیاں بھی از سر نو شروع ہو گئیں اور ویبیناروں اور ویب کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ چل پڑا۔ رفتہ رفتہ اہل اردو اس سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ گھر بیٹھے عالمی ویبیناروں، عالمی کانفرنسوں اور عالمی مشاعروں کا انعقاد کرنے لگے۔ نئی نسل کے لیے تو اس نئے کلچر کو اپنانا بہت آسان تھا۔ لیکن پرانی نسل نے بھی خود کو اس نئے ماحول میں ڈھال لیا۔ وہ بھی آن لائن ہو گئی۔ اس نے بھی ویبیناروں میں شرکت شروع کر دی۔

آن لائن پروگراموں کے انعقاد میں بڑی سہولتیں ہیں۔ کمپیوٹر یا اسمارٹ فون پر دعوت نامہ تیار کیجیے اور مہمانوں کی خدمت میں واٹس ایپ یا ای میل کے ذریعے ارسال کر دیجیے۔ اس میں میزبانوں کے لیے بھی آسانی ہے اور مہمانوں کے لیے بھی۔ میزبان کے لیے یہ آسانی ہے کہ

نہ تو کارڈ چھپوانا ہے، نہ کہیں ہال بک کرنا ہے، نہ ظہرانے عشائیے یا ناشتے کا انتظام کرنا ہے۔ یہاں تک کہ مقالہ نگاروں کو کوئی اعزازیہ بھی نہیں دینا ہے۔ بس انٹرنیٹ کا کنکشن چاہیے۔ البتہ اطلاعات کے مطابق یونیورسٹیوں یا سرکاری اداروں کی جانب سے ہونے والے ویبیناروں اور ویب کانفرنسوں میں اعزازیہ بھی دیا جاتا ہے۔قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے بھی عہدِ کرونا میں جو ویبینار کروائے ان کے مقالہ نگاروں کو اس نے بھی اعزازیہ دیا۔لیکن انفرادی طور پر جو لوگ ویبینار کرتے ہیں وہ اس کا اہتمام نہیں کرتے۔ بہر حال ویبیناروں میں مہمانوں کو بھی کہیں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لیے بھی بس انٹرنیٹ کے کنکشن کی ضرورت ہے۔ گھر بیٹھے دنیا جہان کے کسی بھی کونے میں ہونے والے ویبینار میں شرکت کر لیجیے۔ مشاعرہ پڑھ لیجیے۔ یہ معاملہ کم خرچ بالانشیں ہے۔ بلکہ بے خرچ بالانشیں ہے۔ مشرق کی ایک کہاوت ہے کہ ہرّ ے لگے نہ پھٹکری اور رنگ آئے چوکھا۔ عام طور پر یونیورسٹیوں یا اردو کے بڑے اداروں یا پھر خودکفیل قسم کے نجی اداروں کی جانب سے جو سمینار ہوتے ہیں ان کے مقالوں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی روایت رہی ہے۔ لیکن بیشتر ویبیناروں کے مقالے کتابی صورت میں شائع نہیں ہوتے۔ انھیں بھی کتاب کا قالب ملنا چاہیے۔ البتہ اطلاعات کے مطابق دہلی و بیرون دہلی کے بعض ادبی اداروں کی جانب سے ویبیناروں میں پیش کیے جانے والے مقالات کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں۔ یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

جیسا کہ سب جانتے ہیں کہ ہر چیز کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ ویبینار یا آن لائن پروگراموں کے بھی دو رخ ہیں۔ ابھی تک اس کے مثبت پہلو کا ذکر کیا گیا۔ اب ذرا اس کے منفی پہلو پر غور کر لیتے ہیں۔ ویبینار اور آن لائن کانفرنس یا مشاعرے کے لیے پہلی شرط انٹرنیٹ کا کنکشن ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہر جگہ انٹرنیٹ کا کنکشن موجود ہی ہو۔ اور اگر ہے بھی تو اس کی کوئی گارنٹی نہیں کہ اس میں رکاوٹ پیدا نہیں ہوگی۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ مقالہ پڑھتے پڑھتے مقالہ نگار کی آواز گم ہوگئی یا چہرہ غائب ہو گیا۔ اب انتظار کیجیے کہ کنکشن بحال ہو تب پھر مقالہ سنا جائے۔ ایسے پروگراموں میں سامعین تو ہوتے ہی نہیں ہیں یا ہوتے ہیں تو بہت کم۔ عام طور پر

دیکھا گیا ہے کہ اسکرین پر صرف مقالہ نگار یا مقرر موجود ہے باقی سب لوگ غائب ہیں۔ کوئی اپنی ویڈیو بند کر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا ہے تو کسی کی ویڈیو تو نہیں بند ہے لیکن اس کی توجہ کہیں اور ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ بعض اوقات میزبان بھی غائب ہو جاتا ہے۔ صدر اور مہمان خصوصی بھی غائب ہو جاتے ہیں۔ گویا صرف مقالہ نگار ہوتا ہے۔ وہی پڑھتا ہے اور وہی سنتا ہے۔ سمیناروں میں بہت سے لوگ لحاظ ملاحظے میں بھی بیٹھے رہتے ہیں۔ جبکہ ویبیناروں میں ایسی کوئی قید نہیں ہوتی۔ اس کا ایک منفی پہلو یہ بھی ہے کہ اب ہر شخص عالمی ہو گیا ہے۔ ایسے ایسے لوگ جن کو عام حالات میں نہ سمیناروں میں کوئی پوچھے اور نہ ہی مشاعروں میں وہ بھی بین الاقوامی حیثیت کے حامل ہو گئے۔ ایسے لوگ خود زوم پر ویبیناروں اور مشاعروں کا اہتمام کر کے عالمی سطح پر چھا گئے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے لوگوں نے شہرت کے لالچ میں ویبیناروں کے معیار کو گرا دیا ہے۔ کسی کو بھی پکڑ لیا اس سے مقالہ پڑھوا لیا یا کسی بھی ایسے شاعر کو مدعو کر لیا جس کو عام حالات میں مشاعروں کے منتظمین سامع کی حیثیت سے بھی بلانا گوارہ نہ کریں۔

لیکن اس نئی صورت حال کا ایک خوشگوار پہلو یہ ہے کہ اس نے مسافتیں ختم کر دیں اور قربتیں بڑھا دی ہیں۔ پہلے بین الاقوامی شخصیات کے خیالات جاننے اور ان سے استفادہ کرنے کے لیے بین الاقوامی سمیناروں اور کانفرنسوں کے انعقاد کا انتظار کرنا پڑتا تھا اور چل کر سیمینار ہالوں اور کانفرنس گاہوں تک جانا پڑتا تھا۔ لیکن اب آپ گھر بیٹھے ان سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ بس آپ کے پاس انٹرنیٹ کنکشن اور ویبینار کا لنک ہونا چاہیے۔

بہرحال جیسا کہ ذکر کیا گیا ہر چیز کا ایک مثبت پہلو ہوتا ہے اور ایک منفی۔ ویبیناروں اور ویب کانفرنسوں میں بھی مثبت اور منفی دونوں پہلو موجود ہیں۔ سوال یہ ہے کہ آپ مثبت پہلو سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں یا منفی پہلو سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل اردو بھی انفارمیشن ٹیکنالوجی کی ترقی سے فیضیاب ہو رہے ہیں اور اردو زبان و ادب کا قافلہ بھی دوسری زبانوں کے قافلوں کے دوش بدوش آگے بڑھ رہا ہے۔ ہمیں اس نئی اور خوشگوار تبدیلی کا خیر مقدم کرنا چاہیے۔

پس نوشت

''میڈیا روپ اور بہروپ'' پر

اہلِ علم کے گراں قدر تأثرات

(نوٹ: ''میڈیا روپ اور بہروپ'' کو اردو حلقوں میں جو پذیرائی حاصل ہوئی ہے وہ موجودہ اردو دشمن ماحول میں حیرت انگیز ہے۔ اس کتاب پر شعبہ صحافت کے علاوہ دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والے اہل علم نے بھی گراں قدر تأثرات کا اظہار کیا ہے اور یہ سلسلہ تادمِ تحریر جاری ہے۔ انھی میں سے کچھ تأثرات کو اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے)۔

ڈاکٹر مقتدیٰ حسن ازہری

سہیل انجم نے اپنی کتاب ''میڈیا: روپ اور بہروپ'' میں بڑی خوبی کے ساتھ میڈیا اور اس سے متعلق مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اردو زبان میں میڈیا کے موضوع پر بعض کتابیں ضرور موجود ہیں پھر بھی اس زبان کے قارئین کو مزید کا اشتیاق رہتا ہے۔ زیر نظر کتاب میں مصنف نے اس شوق کی تکمیل کی ہے اور جدید و تازہ معلومات پیش کر کے قاری کو متاثر کیا ہے۔

مصنف نے موجودہ میڈیا میں کے نقائص کی نشان دہی کی ہے اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں اس کی ناکامی پر اظہار افسوس کیا ہے۔ کتاب کو مصنف نے چار اہم حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ہر

حصہ کے ذیل میں جو عناوین مذکور ہیں ان کے ذریعہ تقریباً تمام جزئیات کا احاطہ ہو گیا ہے اور اس طرح موجودہ دور کے انسان کے ذہن میں میڈیا سے متعلق جو سوال بھی آ سکتا ہے اس کا جواب بڑی حد تک کتاب میں موجود ہے۔

پیش لفظ میں مصنف نے لکھا ہے کہ ''میں نے اس کتاب میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا اور بالخصوص الیکٹرانک میڈیا کے مختلف پہلوؤں کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے اور انتہائی غیر جانبدارانہ انداز میں میڈیا کے کردار کو پرکھنے کی کوشش کی ہے۔'' کتاب کا مطالعہ کرنے والا ہر شخص تصدیق کرے گا کہ مصنف کے جائزے میں گہرائی ہے اور انھوں نے اپنی غیر جانبدارانہ حیثیت کو برقرار رکھا ہے اور موضوع کے لحاظ سے اس کی اہمیت ہے کیونکہ مصنف میڈیا کے سلسلے میں اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ وہ جانبدار بن گیا ہے جبکہ اس کا فرض غیر جانبداری ہے۔

دوسرے حصہ میں ایک عنوان ''میڈیا اور ہمارا معاشرہ'' ہے۔ اس عنوان کے تحت مصنف نے موجودہ دور کے انقلاب اور ذرائع ابلاغ کی وسعت و تاثیر کی جانب اشارہ کیا ہے اور بعض مضر پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے۔ اسی حصہ میں ایک عنوان ''نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل'' کا ہے۔ قومی ذرائع ابلاغ کی ناہمواری اسی بحث میں سمٹ کر آ گئی ہے۔ سہیل انجم نے مذکورہ عنوان پر احتیاط کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ لیکن میڈیا کی جانبداری اور غلط روی نے انھیں مجبور کیا ہے کہ بعض دل خراش واقعات سامنے لائیں اور ان کی روشنی میں ذمہ داروں کے کردار کا جائزہ لیں۔

درس گاہوں اور عبادت گاہوں کو بھی آج کی دنیا نے ایک مسئلہ بنا لیا ہے۔ عبادت گاہوں میں آدمی کی فکر و کردار میں نکھار آتا ہے اور آخرت کے حساب و کتاب سے ڈر کر عمل میں ہمواری پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح درس گاہوں میں انسان کو علم و عمل سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ اسی بنا پر صحیح طور پر کہا جاتا ہے کہ مدارس انسان سازی کے کارخانے ہیں۔ لیکن افسوس کہ ہم نے مذکورہ دونوں مقامات سے کسی طرح کا فائدہ حاصل کرنے کے بجائے انھیں اپنے لیے دردسر بنا لیا ہے۔ مصنف کی اس عبارت پر غور فرمائیے: ''مدارس و مساجد کے تعلق سے قومی میڈیا کا رویہ بہت ہی خطرناک اور تشویش انگیز ہے۔ ہند نیپال اور ہند بنگلہ دیش سرحد پر واقع مدارس و مساجد کو ملکی سلامتی کے لیے

خطرہ بنا کر پیش کیا جا رہا ہے اور میڈیا اس کو بری طرح اچھال کر ان کی شبیہ خراب کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔'' عربی کا ایک معروف جملہ ہے کہ انسان جو نہیں جانتا اس کا دشمن ہوتا ہے۔ کچھ اسی طرح کی صورت حال ملک میں مسلم قوم کے تعلق سے ہے۔ لگ بھگ چودہ صدی گزر چکی، ملک کے کسی نہ کسی حصہ میں اسلام اور مسلمانوں کا وجود رہا ہے۔ آج کا دور تو سروے اور شماریات کا دور ہے پھر بھی اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے ابتدائی قسم کی معلومات بھی برادران وطن بلکہ اسلام پر لکھنے والوں کو نہیں ہیں اور وہ اس دین کے تعلق سے سنی سنائی باتوں سے '' کام چلا لیتے'' ہیں۔ مصنف نے اس طرح کی ناواقفیت کا سبب معلومات کی سطحیت اور مسلم دشمن ذہنیت کو قرار دیا ہے۔

'' حدیث دیگراں'' کے ذریعہ اگر کسی حقیقت کا اعتراف ہو تو اس کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔ ہمارے ملک میں عدل و مساوات اور اخلاق و کردار سے متعلق ایسی بہت سی مثالیں موجود ہیں جن میں غیر مسلم حضرات نے مسلمانوں کی حمایت میں لب کشائی کی ہے۔ سہیل انجم نے اس طرح کی متعدد شہادتیں جمع کی ہیں اور یہ ان کی کتاب کی خوبی ہے کہ غیر مسلم اہل انصاف کے بیانات اس کے حق میں ہیں۔ مصنف نے '' دہشت گردی مدارس اور میڈیا'' کے زیر عنوان عمدہ بحث کی ہے اور تصویر کے دونوں رخ کو سامنے کیا ہے۔ پہلے انھوں نے مدارس کے خلاف لکھنے والوں کے اقتباسات پیش کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ ملک کی اسلامی تعلیم گاہوں کے بارے میں بعض اخبار نویسوں کے خیالات کتنے زہریلے ہیں۔ پھر ان منصف مزاج صحافیوں کی تحریریں پیش کی ہیں جو تعصب و جانبداری کے مرض سے بری ہیں۔ یہ بحث دلچسپ ہے۔ دونوں طرح کے خیالات پڑھ کر انسان کو تسلی ہو جاتی ہے کہ دنیا میں ابھی انصاف اور اس کے حمایتی موجود ہیں۔ یقین جانیے دنیا اگر ایسے لوگوں سے خالی ہو جائے گی تو آمریت پسندوں کا راج ہوگا اور مظلوموں کی آہیں بھی سننے والا کوئی نہ ہوگا۔

ہندوستان کثیر المذاہب اور کثیر الالسنہ ملک ہے، یہاں کی قومی و حکومتی زبان ہندی اور اعلیٰ طبقہ کی زبان انگریزی ہے۔ ذرائع ابلاغ سے متعلق گفتگو میں ہر زبان کے میڈیا کی بات آئے گی۔ سہیل انجم نے ہندی و انگریزی پریس پر گفتگو کی ہے اور ان کی پہچان کی جانب اشارہ کیا ہے۔

ہندی پریس کے مقابلہ میں انگریزی پریس میں قدرے معاملہ فہمی و وسعت قلبی کا ذکر کیا ہے اور ہندی پریس کی تنگ نظری کا ذکر کیا ہے۔

گجرات کے فساد پر بھی مصنف نے عمدہ روشنی ڈالی ہے اور بحث کے اختتام پر الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کو سراہا ہے کہ انھوں نے حق گوئی کی جو مثال قائم کی ہے وہ قابل تعریف ہے۔ پھر اپنی اس توقع کا اظہار کیا ہے کہ آئندہ بھی صحافیوں کی ٹیم اپنی ذمہ داری محسوس کرے گی اور بلا امتیاز مذہب و فرقہ غیر جانبدارانہ انداز میں رپورٹنگ کرے گی۔

نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن کی کہانی دلچسپ ہے اور پچھلے برسوں کے تناظر میں دیکھا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا کوئی فرد قابل اعتبار نہیں! مصنف نے اسٹنگ آپریشن کے موضوع پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ میں اس دلچسپ بحث کے اقتباسات پیش نہیں کر سکتا۔ قاری اسے کتاب میں پڑھ سکتا ہے۔ مصنف نے صرف ہند ہی نہیں بلکہ امریکہ وغیرہ کے واقعات بھی پیش کیے ہیں اور دکھایا ہے کہ کس طرح دنیا دولت کی لالچ میں ضمیر کی آواز اور امانت داری کے اصولوں کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔

مصنف نے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا تقابلی جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ الیکٹرانک میڈیا کا دور شروع ہونے کے بعد عام لوگوں کو کسی حد تک یہ یقین ہو گیا تھا کہ اب پرنٹ میڈیا اپنی اہمیت کھو دے گا اور لوگ الیکٹرانک میڈیا کی طرف متوجہ ہو جائیں گے مگر ایسا ہوا نہیں۔ مصنف نے اس مقام پر دونوں قسم کے میڈیا کے مابین تقابل کر کے دونوں کے مثبت و منفی پہلوؤں کی نشاندہی کی ہے جس سے قاری کو دونوں قسم کے ذرائع ابلاغ کی حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے۔ اس مفید بحث کے اختتام پر مصنف نے جو متوازن نتیجہ اخذ کیا ہے وہ کچھ یوں ہے: ''مجموعی طور پر الیکٹرانک میڈیا پرنٹ میڈیا کا دشمن نہیں ہے۔ بلکہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں''۔

ایس ایم ایس ذریعہ ترسیل پر روشنی ڈالنے کے بعد مصنف نے ریڈیو اور ٹی وی نشریات کے آغاز و ارتقاء کی بحث کی ہے اور اس سلسلہ میں مفید معلومات پیش کی ہیں اور ہندوستان میں ریڈیو نشریات۔ آزاد ہندوستان میں ریڈیو نشریات اور ٹیلی ویژن کی ابتداء و ارتقاء وغیرہ اس مبحث کی

سرخیاں ہیں جنہوں نے اپنے دامن میں بہت ساری معلومات جمع کر لی ہیں۔

کتاب کا چوتھا حصہ ''اردو منظر نامہ'' کا عنوان رکھتا ہے۔ اس کے ضمن میں مصنف نے ''الیکٹرانک میڈیا اور اردو'' کے زیر عنوان ریڈیو اور ٹی وی نشریات، فلم اور اردو، نیوز چینل اور اردو، نیوز چینلوں کے اثرات بد جیسے ذیلی عناوین پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے بعد ''اردو پریس اور جذباتیت'' کا عنوان قائم کیا ہے اور چبھتے ہوئے سوالات کے ذریعہ ملت کے افراد کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کہتے ہیں کہ اردو اخبارات کسی بھی معاملے کو مذہبی رنگ دے دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ان کے مسلمان ہونے کی وجہ سے ملازمتیں نہیں دی جاتیں۔ مصنف اسے کسی حد تک صحیح مانتے ہوئے سوال کرتے ہیں کہ کیا کبھی ہم اردو صحافیوں نے مسلمانوں کو یہ بتانے کی بھی زحمت گوارا کی ہے کہ آئی اے ایس اور دیگر اعلیٰ امتحانوں میں مسلمانوں کی شمولیت کتنی فیصد ہوتی ہے؟ کیا ہم نے کبھی مسلمانوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ فلاں محکمہ میں بھرتی ہو رہی ہے یا ہونے والی ہے مسلمان وہاں قسمت آزمائی کریں؟ کیا اردو اخبارات کے صحافیوں نے آئی اے ایس جیسے باوقار مقابلوں کی تیاری کی غرض سے مسلم طلباء کے لیے کوئی کوچنگ شروع کی؟ اس طرح کے متعدد سوالات قائم کر کے مصنف نے اردو اخبارات کی تقصیر اور جذبات ابھار کر منفعت اندوزی کی بات کی ہے پھر جذباتیت کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ چوتھے حصہ کی ایک سرخی اردو صحافت کے مسائل سے متعلق ہے اس میں مصنف نے سب سے پہلے زبان کے مسئلہ کو اٹھایا ہے۔ بحث کے آغاز میں ان کا یہ جملہ دلچسپ ہے کہ ''مختلف مسائل کے انبار میں دبی ہم عصر اردو صحافت کی داستان نہ تو رزمیہ ہے نہ ہی طربیہ، ہاں اسے حزنیہ ضرور کہا جا سکتا ہے۔''

دو سو سے زائد صفحات والی کتاب میں سہیل انجم نے ''قصۂ درد'' کے لیے بھی گنجائش نکالی ہے اور سوا چار صفحات میں اس قصہ کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ انھوں نے اس عنوان کے ذیل میں جو کچھ لکھا ہے ان کا اپنا تجربہ ہے۔ لیکن دوسروں سے اس کا تطابق بھی مستبعد نہیں، علم و تحقیق کی دنیا میں قدر دانی کم اور استحصال زیادہ ہے۔ اسی لیے مسائل میں الجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور سمجھا جاتا ہے

کہ ''ہیرو'' کے بغیر کوئی انھیں حل نہیں کر سکتا۔ مصنف نے اس سرخی کے ذیل میں یاد دہانی کرائی ہے کہ ملک میں دو شعبے ایسے ہیں جن کی بدولت اردو بحیثیت زبان زندہ ہے۔ ان میں ایک شعبہ اردو اخبارات و رسائل یا اردو صحافت کا ہے اور دوسرا شعبہ اسلامی مکاتب و مدارس کا ہے جہاں ابتدائی اور پرائمری سطح پر ہی اردو کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے اور جب تک یہ دونوں شعبے قائم ہیں اردو کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا خواب کسی بھی قیمت پر شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

کتاب کا آخری عنوان اردو ویب سائنس سے متعلق ہے۔ سہیل انجم لکھتے ہیں کہ ذرائع ابلاغ میں اب اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی کے ساتھ ساتھ انٹرنیٹ بھی شامل ہو گیا ہے۔ انٹرنیٹ کی مدد سے آپ اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر پوری دنیا کی سیر کر سکتے ہیں۔ آج انٹرنیٹ کی شاہراہ اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ آپ کوئی بھی چیز تلاش کریں وہ انٹرنیٹ پر مل جائے گی۔ یہ شاہراہ ہر جگہ موجود ہے۔ یہاں تک کہ یہ ہمارے بیڈ روم سے بھی گزر رہی ہے۔ ایک اطلاع کے مطابق دنیا بھر میں اردو کی کئی سو ویب سائٹ موجود ہیں اور کمپیوٹر اسکرین پر ان کی آئی ڈی ٹائپ کر کے وہاں تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے۔ ہندوستان، پاکستان اور دیگر ملکوں کے اخبارات آپ انٹرنیٹ پر پڑھ سکتے ہیں۔ گویا پورا جہانِ اردو انٹرنیٹ پر موجود ہے۔ اگر انٹرنیٹ پر موجود اردو مواد کو یکجا کر کے شائع کرنے کی کوشش کی جائے تو اس کے لیے لاکھوں صفحات درکار ہوں گے۔

کتاب میں کام کی بہت ساری باتیں ہیں۔ جو لوگ بالاستیعاب مطالعہ کریں گے انھیں اندازہ ہوگا کہ سہیل انجم نے کس طرح سنجیدگی اور بصیرت کے ساتھ موضوع کا حق ادا کیا ہے اور ادبی چاشنی کے ساتھ قارئین کو محظوظ کیا ہے۔ اس کتاب سے میڈیا کا مثبت و منفی کردار ہمارے سامنے آ گیا ہے اور ہم اس کے سلسلے میں رائے قائم کرنے کی پوزیشن میں ہیں۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میڈیا سے متعلق جو بات کہی جائے گی متوازن ہوگی۔ یہ کتاب ہمارے سامنے میڈیا کی وہ کوششیں بھی لاتی ہیں جنھیں وہ حق و انصاف کی حمایت میں انجام دیتا ہے۔

(ماہنامہ ''محدّث'' بنارس کے جنوری ۲۰۰۹ء کے شمارے میں شائع مضمون کی تلخیص)

جی۔ڈی۔چندن

''قومی آواز'' کے شعبۂ ادارت کے ممتاز اور نوجوان رکن سہیل انجم کی نئی کتاب جو''میڈیا روپ اور بہروپ'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے موجودہ اردو صحافت کا سنجیدہ احتساب ہے جو ما بعد آزادی کے گہرے مشاہدے اور شخصی تجربے کا ثمرہ ہے۔قریب سوا دو سو صفحات کی یہ پر از معلومات کتاب اپنی نوعیت کی منفرد کاوش ہے جس میں فاضل مصنف نے الیکٹرانک میڈیا کے موجودہ گھنے موحول میں اردو پرنٹ میڈیا کی آبرو اور استقامت کا صاف گوئی سے مخلص جائزہ لیا ہے۔

اس امر سے انکار نہیں ہوسکتا کہ عوامی ترسیل اور ابلاغ کے نظام میں آج انگریزی میڈیا کا غلبہ ہے۔فاضل مصنف نے اس میڈیا کے انٹ سنٹ اور بعض اوقات بدگماں کوریج کی بالخصوص ایسے واقعات کی جو مسلم علاقوں میں رونما ہوتے ہیں متعدد مثالیں پیش کی ہیں۔موصوف نے کہا ہے کہ یہ علت عام طور پر نام نہاد ''بریکنگ نیوز'' اور سنسنی خیزی کے نام پر ہوتی ہے جو صحافت کی صداقت اور دیانت کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔اس ملک کے ایک وسیع حصے میں یہ میڈیا اپنی ساکھ کھو رہا ہے۔فاضل مصنف نے کہا ہے کہ اس امر کا تدارک ہونا چاہیے۔کچھ انگریزی اخباروں نے اس خلفشار کا نوٹس لیا ہے۔لیکن اردو صحافیوں کو اس بدعت کے خلاف جس سنجیدہ، مصمم اور منظّم ڈھنگ سے بیدار ہونا چاہیے وہ مفقود ہے۔

ایسے معاملے کو پریس کے علاوہ اردو دوستوں کو پارلیمنٹ اور وزارت متعلقہ کی پارلیمنٹری کمیٹی میں اٹھانا چاہیے۔مزید ضرورت ہے کہ خود ''اردو پرنٹ میڈیا میں ایک لائق طبقہ'' ٹی وی کے نیوز چینلوں پر باقاعدہ نظر رکھے جو نہ صرف ان کی کوریج بلکہ اردو زبان کے استعمال پر بھی توجہ دے اور ٹی وی کی لغزشوں پر اپنے نتائج سے متعلقہ انگریزی حلقوں کو مطلع کرے۔

اس بارے میں لائق مصنف نے کام کی ابتدا کر دی ہے اور ان کی دریافتیں اور تجویزیں الیکٹرانک میڈیا کے ذمہ دار حلقوں تک پہنچنی چاہئیں۔ان کی ابتدا کا خاکہ کتاب کے ''پیش لفظ''

میں شامل ہے جو بڑا نکتہ رس اور خیال افروز ہے۔ پانچ صفحات کے اس نوٹ میں گویا کوزے میں دریا بند کیا گیا ہے۔صرف اسی کی ترسیل سے الیکٹرانک میڈیا کے بگاڑ اور مرض کا علاج شروع ہو سکتا ہے۔کتاب ایک صالح پیغام کی سفیر ہے۔اس پیغام کی تائید اور حمایت مشہور کالم نگار جناب سعید سہروردی، بزرگ مدیر جناب محفوظ الرحمٰن اور قومی آواز کے موجودہ دانشور مدیر جناب موہن چراغی نے کی ہے۔ان بزرگوں کے تبصرے کتاب کا ابتدائیہ حصہ ہیں جن سے کتاب کی اہمیت دوبالا ہوگئی ہے۔

پوری کتاب کے چار حصے ہیں۔ان میں سے ابتدائیہ یعنی حصۂ اول مقدمہ نگاری کی نذر ہے جس کا خاکہ اوپر پیش کیا جا چکا ہے۔دوسرے حصے میں مصنف نے میڈیا کے خدوخال پیش کیے ہیں۔تیسرے حصے میں میڈیا کی تفصیلی شناخت کے مختلف پہلو ہیں۔چوتھا اور آخری حصہ حاصل کلام ہے۔میں اسے جان غزل کہوں گا۔اس میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو زبان کے رشتے کی گہرائی اور وسعت کے حقائق پیش کیے گئے ہیں۔ساتھ ہی اردو پریس کی معروف خصوصیات، کوتاہیاں اور مسائل ہیں۔کتاب کے آخری باب میں اردو کی قابلِ ذکر ویب سائٹس کا خالہ پیش کیا گیا ہے جس سے مصنف کی موضوع فہمی اور واقعات نگاری کا مزید ثبوت ملتا ہے۔

مصنف کی کاوش میں تحقیق اور تخیل دونوں فعال رہے ہیں۔کتاب دریافتوں کی محنت اور موضوع کی دردمندی سے معمور ہے۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے ملک کے نظام نشریات میں ریڈیو اور بولتی فلم کے ابتدائی کرشموں نے اردو کی گود میں آنکھ کھولی اور ملک میں سامعین اور ناظرین کے ایسے حلقے تیار کیے جو اردو کے رسیا ہو گئے۔بعد میں ٹی وی کی مقبولیت کا آغاز منجملہ دیگر پبلک کے انھیں حلقوں سے ہوا لیکن حیرت ہے کہ آج ٹی وی اردو کے احسانات سے بے رخی اور بے مروتی برت رہا ہے۔کتاب اس بے رخی پر بڑی رقت سے مخاطب ہے۔

(بزرگ صحافی اور حکومت کے ادارے پریس انفارمیشن بیورو کے سابق اردو آفیسر)

حقانی القاسمی

معاملہ میڈیا کا ہے اس لیے ذرا قافیہ بدل کر کچھ کہنا زیادہ مفید ہوگا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اب صحافت: ''ہوس کے پنجہ خونیں میں تیغ کارزاری ہے'' (اقبال)

ملک اور معاشرے کی صحت کے لیے صحافت مضر اور مہلک ثابت ہو رہی ہے۔ صحافت کا مقصد صرف خوف، تشدد اور تشویش کی تجارت ہے۔ اقبال کے مصرعے میں ذرا سی تحریف کر کے کہا جا سکتا ہے کہ: ''کھا گئی روحِ صحافت کو ہوائے زر وسیم''۔ عصر حاضر کی صحافت میں سب سے زیادہ قتل سچائی کا ہوا ہے یا صداقت کی توہین وتضحیک ہوئی ہے۔ نیوکلیائی بم سے بھی اتنا نقصان نہیں ہوا جتنا کہ صحافت کے تاریک اور تنگ ذہن سے ہوا ہے۔ اس نے معصوم بستیوں کو بھی ''مقتل'' میں تبدیل کر دیا ہے۔ جو صحافت کبھی چراغ راہ تھی، جس کا کام ''چمن کی ہر کلی کو درد آشنا'' کرنا تھا اب وہی صحافت دوست دشمن کے خانوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ فرقہ وارانہ خطوط پر ذہن و دل کی تقسیم کا سہرا صحافت کے سر ہے اور بہت سے فسادات کی ذمہ داری بھی صحافت پر عائد ہوتی ہے۔ زیادہ حوالوں کی ضرورت نہیں، ودیا بھوشن راوت کی ایک کتاب Press and Prejudice کافی ہے۔

یہ عصری صحافت کا نہایت خوفناک اور بھیانک چہرہ ہے جسے خود ہماری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ مگر اسی کے ساتھ صحافت کا ایک اور چہرہ بھی ہے جو انسانی دردمندی اور ذہنی کشادگی سے روشن ہوا ہے۔ صحافت کے ''دو چہروں'' سے وہ ایک کتاب آشنا کراتی ہے جس کا نام ''میڈیا روپ اور بہروپ'' ہے اور لکھنے والا ایک کشادہ ذہن، غیر متعصب حقیقت پسند صحافی ہے جس نے دو دماغ، دو زبان، دو زاویہ نگاہ سے نہیں بلکہ ایک وسیع تر ہمہ گیر ذہن اور چشم جہاں بیں سے کتاب لکھی اور وہی کچھ رقم کیا جو عدل وانصاف کا تقاضا ہے۔

بیدار ذہن، زندہ ضمیر اور کھلی آنکھوں سے صحافت کے جملہ جوانب و جہات کا احاطہ کرنے والے مصنف کا نام سہیل انجم ہے جو میڈیا کے مضرات ومنکرات، مفسدات ومہلکات سے بھی آگاہ ہیں اور اس کے حسنات وممکنات سے بھی۔ میڈیا کے مالہٗ وماعلیہ پر ان کی نظر گہری ہے اس لیے انھوں نے نہایت غیر مشروط ذہن سے ایک جامع اور مفید کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں ان

کا مشاہدہ اور مجاہدہ دونوں شامل ہیں۔ ایسی کتاب اگر کسی اردو پروفیسر نے لکھی ہوتی تو دانشورانہ مغالطے کا ملغوبہ ہوتی یا انگریزی کتابوں کا چربہ۔ مگر سہیل انجم ذہنی، جذباتی اور عملی طور پر صحافت سے جڑے ہوئے ہیں اس لیے انھوں نے کتابوں کے درمیان بیٹھ کر کتاب نہیں لکھی بلکہ تحقیق و تجسس کی راہ پر چل کر کچھ ایسے حقائق کا سراغ انھیں ملا جس کی روشنی میں انھوں نے بہت دور تک کا سفر کیا اور کامران ہوئے۔

''میڈیا روپ اور بہروپ'' تین ابواب پر محیط ہے۔ دو ابواب فکر انگیز اور معنی خیز ہیں تو ایک باب معلوماتی۔ ''میڈیا اپنے آئینے میں'' ایک نہایت وقیع اور بحث انگیز باب ہے جس میں نہایت نازک اور حساس مباحث و مسائل پر گفتگو کی گئی ہے۔ سہیل انجم نے ان مسائل پر بے خطری اور بے باکی کے ساتھ اپنے قلم کو جنبش دی ہے جن پر لکھتے ہوئے بڑے بڑوں پر لرزش طاری ہو جاتی ہے۔

انھوں نے جہاں میڈیا کی فرقہ وارانہ ذہنیت کی بیخ کنی کی ہے وہیں صحافت کی سیکولر سوچ کو سلام کیا ہے۔ دونوں طرح کی ذہنیت کا تجزیہ نہایت منطقی انداز میں کیا ہے۔ صحافت (الیکٹرانک، پرنٹ) کے ایجابی اور سلبی پہلوؤں پر لکھتے ہوئے بعض ایسے حقائق کا انکشاف کیا ہے کہ آنکھیں حیرت سے کھلی رہ جاتی ہیں۔ انھوں نے گورومورتی، ہردیہ نارائن دیکشت، ایم ایس نیگی وغیرہ کی زعفرانی ذہنیت کو جہاں بے نقاب کیا ہے، وہیں پربھاش جوشی، پی رمن، مینا کنڈا سوامی، رویندر پنڈیا، تیستا سیتل واڈ، راج دیپ سردیسائی، پرفل بدوائی، راجندر شرما اور ہرش مندر جیسے صاف ستھرے ذہن رکھنے والے دانشوروں کے بارے میں کلمات تحسین وستائش لکھے ہیں، جنھوں نے مسلمانوں کے دفاع میں اپنا سارا زورِ قلم صرف کیا اور حق گوئی کی سزا بھگتی۔ ان لوگوں نے جس بے خطری اور جرأت مندی کے ساتھ اقلیتوں پر مظالم اور اتہامات والزامات کے بارے میں لکھا اس سے صحافت کا انسانی چہرہ سامنے آتا ہے جبکہ مسلم مسائل پر ہندی وانگریزی پریس سے وابستہ مسلمان اپنے چہرے کی چمک برقرار رکھنے کے لیے مہر بلب رہتے ہیں یا پھر اتنی دھیمی آواز میں بولتے ہیں کہ کسی کو سنائی نہ دے۔ جانے ایسے موقعوں پر ان کے قلم کی قوت کہاں کھو جاتی ہے۔

سہیل انجم نے اس کتاب میں بہت سے مشکل معرکے سر کیے ہیں۔ ''دہشت گردی مدارس اور میڈیا'' پر بھی انھوں نے نہایت معروضی انداز میں لکھا ہے اور سارے الزامات کا بطلان کیا ہے اور کسی مسلم دانشور کے حوالہ کے بجائے غیر مسلم سیکولر دانشوروں کے مضامین اور بیانات درج کیے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ مدارس دہشت گردی کے مراکز نہیں ہیں۔ انھیں تو کنز، قدوری، فصول اکبری سے فرصت ہی نہیں ملتی یا پھر یہ ایک دوسرے کو دائرہ اسلام سے خارج کرنے کی جدو جہد میں لگے رہتے ہیں۔ انھیں 'دہشت گردی' کے بارے میں سوچنے کا وقت کہاں میسر ہے۔ مدارس سے غوری و غزنوی نہیں بلکہ فقیر غیور پیدا ہوتے ہیں۔ غیر ملکی امداد تو بچوں کی کفالت کے لیے کم پڑ جاتی ہے چہ جائیکہ اس کا استعمال دہشت گردی کے لیے کیا جائے۔ مدارس کی دہشت گردی محض ایک مفروضہ اور واہمہ ہے۔ اسی طرح 'اسلامی دہشت گردی' کا وجود بھی موہوم اور فرضی ہے۔

سہیل انجم نے نہایت متوازن انداز میں اردو صحافت کی جذباتیت اور ہندی صحافت کی فرقہ واریت پر لکھا ہے اور اس حقیقت کی نقاب کشائی کی ہے کہ ہندی انگریزی ذرائع ابلاغ سے وابستہ ''زے'' سے جاہل ہوتے ہیں اس لیے بغیر سوچے سمجھے مسلمانوں کی '' خلافت'' کرتے رہتے ہیں۔

اردو منظر نامہ کے خصوصی حوالے سے بھی وہ سارے حقائق سہیل انجم نے پیش کر دیے ہیں جن سے اردو صحافت کے زوال پر یقین کرنا آسان ہو جاتا ہے اردو صحافیوں کے استحصال اور شدائد و مشکلات کا بیان انھوں نے بڑی دلسوزی اور دردمندی سے کیا ہے اور درد کا یہ قصہ شبِ ہجراں سے زیادہ دراز ہے۔

سہیل انجم نے میڈیا کی تکنیکی شناخت اور رسائی پر بھی خامہ فرسائی کی ہے۔ چینلوں کے اسٹنگ آپریشن، ایس ایم ایس، ریڈیو ٹی وی نشریات پر تفصیل سے لکھا ہے۔

یہ کتاب فکر انگیز ہی نہیں بلکہ معلوماتی بھی ہے۔ میڈیا پر یہ ایک مکمل، مختلف اور متنوع کتاب ہے جو ہر زاویہ سے مفید ہے۔ فکری نہج اور اسلوب اظہار کے اعتبار سے بھی یہ کتاب ہر شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والوں کے لیے سودمند ثابت ہوگی۔ یہ چند سطریں محض پسندیدگی کا اظہار ہیں و نہ یہ

کتاب خود اپنے اندر اتنی کشش، قوت اور توانائی رکھتی ہے کہ اسے ''حاجت مشاطہ'' نہیں ہے۔ سہیل انجم پوری اردو دنیا کی جانب سے مبارک باد، تحسین وستائش کے مستحق ہیں۔
(مضمون نگار عہد حاضر کے ایک معروف نقاد اور صحافی ہیں)

رضوان اللہ

ادب اور صحافت کے درمیان حد فاصل، ان کے باہمی رشتے اور ارتباط کی بحثیں ایک عرصہ سے جاری تھیں کہ صحافت کا جنّ ایک جست میں ساری حدود وقیود سے باہر آ گیا۔ اس کے پر وبال اور نئی توانائیوں نے سیر کائنات پر اس کو مہمیز کیا۔ صحافت نے روایات کے لباس کو اتار پھینکا، نئے پیراہن اختیار کیے اور عالمگیری کی مہم پر چل پڑی۔ اس نے دنیا بھر کے مناظر کی رنگارنگی کو اپنے بازوؤں میں سمیٹا، ہر راگ کو صدا بند کیا اور پھر نابینا دنیا کو ایسی بینائی بخشی کہ ہر فرد اپنی جگہ پر ہی جہانِ رنگ وبو سے آشنا ہی نہیں اس کی پہنائی اور جلوہ گری سے سرشار ہو گیا۔ صحافت کے پرانے روپ نے بہروپ کے ساتھ میڈیا نام کی ایک نئی عرفیت بھی اختیار کی۔ ادب اپنی جگہ پابہ گل اور مبہوت تھا۔ اس کو بھی اپنے شانوں پر سوار کر کے دنیا کی سیر کرائی اور دنیا کو اس سے روشناس کرایا۔ ادب اور صحافت کے رشتوں کی پرانی بحث اس چکا چوند میں نہ جانے کہاں گم ہو گئی۔

سہیل انجم نے اپنی تازہ ترین تصنیف ''میڈیا روپ اور بہروپ'' میں روایتی صحافت اور جدید میڈیا دونوں کا احاطہ کیا ہے۔ انھوں نے ایک ایسے موضوع کو سوا دوسو صفحات میں سمونے کی کوشش کی ہے جو ہر دم اور لحظہ وسعت پذیر ہے اور اس کا شوق جہانگیری لامحدود اور قوت عمل بظاہر لازوال ہے۔ یہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ میڈیا خود کو مملکت کا چوتھا ستون کہہ کر پھولا نہیں سماتا اور خود کو معلم رموز مملکت سمجھتا ہے اور سیاسیات کے درس دیتا رہا ہے لیکن سہیل انجم اس کو آئینہ دکھاتے ہیں کہ وہ خود کہاں ٹھوکریں کھا رہا ہے۔ وہ اس کو آداب معاشرت کا درس دیتے ہیں۔ ضابطہ اخلاق سے آگاہ وآشنا کرتے ہیں۔ اسی عمل کو سعید سہروردی نے اپنے تعارفی مضمون کا عنوان بنایا ہے ''محاسبہ میڈیا کا''۔

میڈیا اشاعتی ہو یا نشریاتی، قومی ہو یا عالمی، اس پر عام اعتراض تو یہی ہے کہ اس کو ان اخلاقی قدروں کا پاس نہیں رہ گیا جو ہندوستان کی معاشرتی اور اخلاقی روایات کا حصہ ہیں۔ دوسرے یہ کہ مفادات خصوصی کی تکمیل میں صحافتی اصولوں اور ضابطوں کو بھی طاق پر رکھ دیا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ قابلِ اعتراض وہ تعصب ہے جو مسلمانوں کے خلاف بالعموم روا رکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی میڈیا کا ایک حصہ تو ہمیشہ ہی مسلمانوں کے خلاف شمشیر برہنہ رہا ہے لیکن گیارہ ستمبر کے واقعہ کے بعد مغربی بالخصوص امریکی میڈیا نے مسلمانوں کو اپنی دشمنی کی مہم کا ہدف بنایا ہے اور دنیا بھر میں مسلمانوں کو دہشت گرد قرار دیا ہے۔ اس سے ہندوستان کے اس مذموم اور ناعاقبت اندیش میڈیا کی زہرناکی کو اور بھی تقویت ملی ہے۔

سہیل انجم نے اخباری اور نشریاتی حوالوں سے اس پوری صورت حال کو اجاگر کیا ہے اور ان ریکارڈوں کے ذریعے میڈیا کی ان کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے۔ یہ میڈیا کا محاسبہ بھی ہے اور اس کی تادیب وتہذیب بھی۔ انھوں نے جو حوالے دیے ہیں ممکن ہے ان میں سے کچھ عام قاری کی نظر سے گذرے ہوں لیکن یاد کسے رہتا ہے۔ انھیں کتاب کے اوراق میں محفوظ کر لیے جانے کے بعد ان کی یاد دہانی اور تکرار کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ گویا اصلاحی کاوشوں میں معاون ہونے والے شواہد دستیاب ہوتے ہیں۔

زیر نظر تصنیف میں شامل کئی عنوانات کے تحت مضامین میں مذکورہ پہلوؤں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً میڈیا اور ہمارا معاشرہ، نیشنل میڈیا اور مسلم مسائل، مدارس اور میڈیا، میڈیا اور عالم اسلام، میڈیا کا منفی رویہ، قومی پریس اور فرقہ واریت، گجرات فسادات میں میڈیا کا رول وغیرہ۔

سہیل انجم نے ''میڈیا کی تکنیکی شناخت اور رسائی''۔ ''الکٹرانک میڈیا کی رسائی''۔ ''ایس ایم ایس کو انوکھا ذریعہ ترسیل''۔ ''ریڈیو اور ٹی وی نشریات، ابتدا اور ارتقاء''۔ ''اردو منظرنامہ'' کے تحت ''الکٹرانک میڈیا اور اردو'' کے علاوہ ''اردو کی اہم قابلِ ذکر ویب سائٹ'' کی تفصیلات اور ویب سائٹ پر موجود اردو اخباروں کی ایک فہرست اور ان کے پتے درج کر کے اردو والوں کی

ایک ایسی گرانقدر خدمت انجام دی ہے جو با ذوق لوگوں پر احسان کرنے کے مترادف ہے۔ مواصلات میں برقیاتی انقلاب کی برکتوں سے اردو والے اسی حد تک فیضیاب ہوتے ہیں جہاں تک وہ ان کے گھر کی دیوار میں در بنا کر گھس آئے، خود بڑھ کر اس دولت کو لوٹ لینے کا نہ سلیقہ ہے نہ حوصلہ۔ ہمارے اردو ادارے اگر رسمی کارروائیوں سے کچھ وقت نکال کر اس راہ میں رہنمائی کریں اور حوصلہ افزائی کریں، معاونت کریں تو یہ واقعی زبان اور اہل زبان کی بڑی خدمت ہوگی۔ سہیل انجم نے اس طرف اشارہ ہی نہیں کیا ہے راستہ بھی دکھا دیا ہے۔

طباعت میں برقیاتی انقلاب کے طفیل اردو کتابوں کی طباعت بہتر اور نسبتاً صاف ستھری ہو گئی ہے لیکن زبان کی طہارت اسی انقلاب کی زد پر ہے اس کی حفاظت بہت مشکل ہے خصوصاً ایسے لکھنے والوں کے لیے جن کا اوڑھنا بچھونا میڈیا ہے۔ سہیل انجم نے ''میڈیا روپ بہروپ'' میں اس کی کامیاب کوشش کی ہے۔

(مضمون نگار بزرگ صحافی، ادیب، شاعر اور متعدد کتب کے مصنف ہیں)

معین اعجاز

اردو میں شعری مجموعوں یا دوسری اصناف ادب سے ہٹ کر کسی اور موضوع پر کوئی کتاب شائع ہوتی ہے تو بڑی خوشی اور راحت کا احساس ہوتا ہے اور ایسے میں میڈیا کے عروج اور اس کے عیوب و محاسن پر جب کوئی تحریر سامنے آتی ہے تو یہ اعتماد بحال ہو جاتا ہے کہ اردو حلقوں میں قومی اور بین الاقوامی مسائل نیز سماجی معاملات اور صورت حال کے حوالے سے غور و فکر کے دروازے بند نہیں ہوئے ہیں۔ ادھر کوئی دو دہائیوں کے عرصے میں میڈیا بطور خاص الیکٹرانک میڈیا میں جو انقلاب آیا ہے وہ اس بات کا متقاضی ہے کہ اس کے تمام پہلوؤں پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ اطمینان کی بات ہے کہ سہیل انجم نے ''میڈیا: روپ اور بہروپ'' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی جس میں پرنٹ اور الیکٹرانک دونوں طرح کے میڈیا اور ان کی کارکردگی کا ذکر اور محاسبہ کیا گیا ہے۔ الیکٹرانک میڈیا نے پوری دنیا میں حالیہ دہائیوں میں انقلاب برپا کیا ہے اور ہندوستان میں

بھی اس ''یلغار'' کا بھرپور اثر پڑ رہا ہے۔ ہندوستان چونکہ جمہوری ملک ہے اور اظہار کی پوری آزادی ہے اس لیے جہاں غیر ذمہ دارانہ رپورٹنگ کی مثالیں ملتی ہیں وہیں جمہوریت کا وہ فیض بھی نمایاں طور پر نظر آتا ہے جو آزادی تقریر و تحریر سے عبارت ہے۔

سہیل انجم نے اپنی کتاب میں پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے تقریباً تمام پہلوؤں کا سنجیدگی اور غیر جانبداری سے جائزہ لیا ہے اور اس سے یہی اندازہ ہوتا ہے کہ میڈیا سے متعلق معاملات اور مسائل پر ان کی بڑی اچھی نظر ہے۔ حالیہ برسوں میں پرائیویٹ ٹی وی چینلوں کی جو بھرمار ہوئی ہے اس سے جہاں سماجی سطح پر بیداری آئی ہے وہیں بہت سارے معاملات میں کنفیوژن بھی پیدا ہوا ہے اور زرد صحافت کی مثالیں بھی سامنے آئی ہیں۔ الیکٹرانک میڈیا انتہائی طاقتور میڈیا ہے جو ذہنوں پر براہ راست اثر مرتب کرتا ہے اور اس لیے اس سے وابستہ لوگوں کو ذمہ داری کا ثبوت بھی دینا چاہیے۔ سہیل انجم نے اس بات کی نشاندہی مختلف ابواب میں کی ہے۔ انھوں نے جہاں گجرات فسادات میں الیکٹرانک میڈیا کے رول کو سراہا ہے وہیں اس کے غیر ذمہ دارانہ رول کی تنقید بھی کی ہے۔ مثلاً دہشت گردی اور مختلف مقامات پر ہونے والی تخریب کارانہ سرگرمیوں کے ضمن میں اکثر نیوز چینلوں نے یکطرفہ اور جانبدارانہ رویہ اختیار کیا ہے جس سے ہندوستانی سماج کے ایک حلقے میں مایوسی اور بددلی پیدا ہوئی ہے۔ یہ ایک بنیادی نکتہ ہے جس پر میڈیا سے وابستہ افراد کو غور کرنے کی ضرورت ہے۔ الیکٹرانک میڈیا کو جو طاقت اور برتری حاصل ہے اس کا بے جا استعمال سماج میں بے چینی اور انتشار کا باعث بن سکتا ہے۔

سہیل انجم نے ایک اور بڑی اہم بات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ میڈیا کے عروج کے ساتھ نئے صحافیوں کی بھیڑ بھی اکٹھا ہوگئی ہے۔ ان میں سے بہت سے ایسے بھی ہیں جو سیاسی اور سماجی صورت حال سے ناواقف ہوتے ہیں۔ بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس معاملے میں وہ ''نابالغ'' ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی مثال یہاں میں بھی دے دوں۔ ایک مشہور نیوز چینل کے ایک اینکر کو جب سابق وزیر اعظم اندر کمار گجرال نے یہ بتایا کہ ان کے والد قیام پاکستان کے بعد پاکستان کی قانون ساز اسمبلی کے رکن تھے تو اس اینکر کو یقین ہی نہیں آرہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بے ہوش

ہوتے ہوتے رہ گیا۔ سہیل انجم نے اس کتاب میں ایسے کچھ اینکروں کا ذکر کیا ہے جو اس پیشے میں بحال کیے جانے کے لائق نہیں ہیں۔ میڈیا کی انتظامیہ کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔

پرائیویٹ ٹی وی چینلوں کی خبروں کی اگر بات کی جائے تو میں یہاں یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ ریڈیو اور دوردرشن کے مقابلے پرائیویٹ نیوز چینل بہت پیچھے ہیں۔ اکثر ایسا لگتا ہے کہ پرائیویٹ چینل شتر بے مہار کی صورت چوبیس گھنٹے بھاگتے رہتے ہیں جبکہ ریڈیو اور دوردرشن کی خبروں میں اعتدال اور توازن کو واضح طور پر محسوس کیا جا سکتا ہے۔ بیشک کچھ پابندیاں بھی ہوتی ہیں جو بسا اوقات کھلتی ہیں لیکن مجموئی طور پر دیکھا جائے تو بعض ضابطوں کی بندش ذمہ داری کے ساتھ کام کرنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ راقم الحروف نے سرکاری الیکٹرانک میڈیا کے دشت کی سیاحی میں ایک عرصہ گزارا ہے اور بغیر کسی تعصب کے یہ عرض کرنا چاہتا ہے کہ پرائیویٹ چینلوں کو بھی اپنے رویے میں مثبت تبدیلی لانی چاہیے اور اس سلسلے میں ریڈیو اور دوردرشن کی مثال کو سامنے رکھنا چاہیے۔ ضابطوں کی بعض بندشیں مثبت طریقۂ کار کو بھی فروغ دیتی ہیں۔ جمہوری معاشرے میں آزادی کے ساتھ ذمہ داری کا احساس بھی ضروری ہوتا ہے۔

خوشی کی بات ہے کہ ان تمام پہلوؤں پر سہیل انجم نے سنجیدگی سے بحث کی ہے اور امید ہے کہ اس کتاب کے نئے ایڈیشن میں یا اس موضوع پر کوئی دوسری کتاب لکھتے وقت وہ پرائیویٹ چینلوں اور ریڈیو اور دوردرشن کی خبروں اور حالات حاضرہ کے پروگراموں کا موازنہ زیادہ تفصیل سے کریں گے۔ اس موضوع پر لکھنے کی اچھی صلاحیت ان کے اندر موجود ہے۔ وہ خود صحافی ہیں اور صحافت کے رموز و نکات سے واقف ہیں۔ ''میڈیا: روپ اور بہروپ'' ان کی ایک ایسی کاوش ہے جس کی داد انھیں ملنی ہی چاہیے۔

(مضمون نگار آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں پروگرام ایگزیکیٹیو رہے ہیں)

محمد مصطفیٰ علی سروری

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے شعبہ ترسیل عامہ وصحافت کے لئے میڈیا اور میڈیا سے جڑے موضوعات پر اردو کتابوں کا حصول شروع سے ہی ایک سنگین مسئلہ رہا ہے۔لیکن جناب سہیل انجم کی کتاب ''میڈیا روپ اور بہروپ'' نے اس مسئلے کو بڑی حد تک حل کر دیا ہے۔عمومی طور پر تمام طلبائے صحافت کے لیے اور خصوصی طور پر اردو یونیورسٹی کے طلبا کے لئے یہ ایک بہترین کتاب ہے۔ میں اپنے تمام طلبا کو اس کے مطالعہ کی سفارش کرتا ہوں تا کہ وہ صرف میڈیا کے نظریاتی پہلو سے ہی آگاہ نہ ہوں بلکہ اس کی عملی صورت حال اور چیلنجوں سے بھی واقفیت حاصل کر سکیں۔عصر حاضر کے طلبا کو میڈیا کی اہمیت اور اس کے دوررس اثرات کو اس کتاب کی مدد سے سمجھنا نسبتاً آسان ہو گیا ہے۔

(ایسوسی ایٹ پروفیسر، شعبہ ترسیل عامہ وصحافت، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد)۔

ڈاکٹر شفیع ایوب

سہیل انجم ایک منجھے ہوئے صحافی ہیں۔ایک ایسا صحافی جو صحافت کے تمام رموز واسرار سے واقف ہے اور اہلِ زبان بھی ہے۔اردو صحافت سے متعلق ایک تلخ حقیقت یہ ہے کہ یہاں جو اہلِ زبان ہیں وہ تکنیکی گیان سے نابلد اور جو تکنیکی جانکاری رکھتے ہیں وہ معیاری اور اچھی زبان سے ناواقف ہیں۔ یہ اردو صحافت کا المیہ ہے۔جے این یو میں ماس کمیونیکیشن کی تدریس سے وابستگی نے میرے سامنے جو پہلا چیلنج پیش کیا وہ معیاری اور قابلِ فہم کتب کی فراہمی کا تھا۔ یونیورسٹی کے نصاب میں درجن بھر کتابوں کے نام درج کر دیے گئے تھے۔لیکن ان میں سے بیشتر بے وقت کی راگنی۔ پھر ہر طرف شور بلند ہوا کہ اردو میں ماس میڈیا کی کتابیں دستیاب نہیں ہیں۔ جو لوگ ترسیل، عوامی ترسیل، ذرائع ترسیل اور صحافت میں کیا فرق ہے یہ بھی نہیں جانتے تھے وہ ان موضوعات پر کتابیں لکھ کر صاحبِ کتاب ہو گئے۔ دانش گاہوں میں دھڑا دھڑ ان موضوعات پہ

ریسرچ کرائے گئے۔ بے چارے نگراں کی بھی غلطی نہیں کہ ترسیل اور ترسیلی نظام کبھی اس کا موضوع نہیں رہا۔اور ریسرچ اسکالر کو ایم فل و پی ایچ ڈی کر کے نوکری پانے کی جلدی تھی۔مقالہ یونی ورسٹی میں جمع کر کے ڈگری لینے کے بعد اس کی اشاعت بھی ضروری ہے۔ لیجیے صاحب ماس میڈیا کے حوالے سے نا قابلِ فہم اور اغلاط سے بھرپور ایک کتاب آ گئی بازار میں۔ ایسے میں ''میڈیاروپ اور بہروپ'' جیسی کتاب کا آنا تازہ ہوا کے جھونکے جیسا تھا۔ دراصل ماس میڈیا کا دائرہ بہت پھیلا ہوا ہے۔سیاسیات،سماجیات،اخلاقیات،لسانیات اور نفسیات سے لیکر قانون اور تکنیک تک اس کا دائرہ وسیع ہے۔سہیل انجم کی تحریریں مختلف میدانوں میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔سہیل انجم جیسے چند لوگ ہیں جو زبان داں ہیں اور لفظ کی طاقت کو پہچانتے ہیں،صحافت کی جملہ فنی اور تکنیکی جانکاری سے لیس ہیں۔ان کی تحریروں نے ماس کمیونیکیشن کے طلبہ کی بہت سی پریشانیوں کو دور کیا ہے۔اب اس کتاب کا چوتھا ایڈیشن شائع ہونے جا رہا ہے۔اتنی قلیل مدّت میں کسی علمی کتاب کا چوتھا ایڈیشن آنا اپنے آپ میں کتاب کی اہمیت وافادیت کی دلیل ہے۔ میں جناب سہیل انجم کو مبارکباد پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ماس کمیونیکیشن کی تدریس کے حوالے سے ہمارے سامنے جو دشواریاں ہیں ان کو کم کرنے میں ان کی تحریریں معاون ثابت ہونگی۔

(استاد ہندستانی زبانوں کا مرکز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی)۔

عبدالمعید مدنی

یہ کتاب تجرباتی اور عملی نقطۂ نظر سے تصنیف کی گئی ہے۔مصنف خود ایک معروف صحافی ہیں اور برسوں سے پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا سے بھی جڑے ہوئے ہیں۔اس لیے اس کے نشیب و فراز سے واقف ہیں اور اس کے رموز و اسرار سے بھی آگاہ ہیں۔انہیں میڈیا کی خوبیوں اور خامیوں کی بھی خبر ہے۔ایک باشعور صحافی اور باضمیر انسان اور اچھا مسلمان ہونے کے ناطے وہ با مقصد میڈیا کو پسند کرتے ہیں جو اخلاقی اور انسانی قدروں کا لحاظ رکھے اور حق و انصاف کی بات

کرے اور ذرائع ابلاغ کو ضابطوں اور اصولوں کے تحت استعمال کرے۔

کتاب کا موضوع ہندوستانی قومی میڈیا ہے۔ ہندوستانی قومی میڈیا بحیثیت مجموئی اپنا صاف ستھرا امیج نہیں رکھتا اور اس کی مضرت افادیت پر غالب ہے۔ اس کی وجوہ مصنف نے بتلائے ہیں۔ خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ میڈیا کا محور عمل بازار ہے یا دوسرے لفظوں میں حصول زر کی بے تابی اور ہوس ہے۔ اور یہ بے تابی و ہوس مختلف شکلوں میں اور اصلاً دو شکلوں میں ظاہر ہوتی ہیں۔ ننگا پن عام کر کے جنسی ہوس بھڑکانے اور اس کے لیے گرسنگی کا احساس بڑھا کر دوسرے فرقہ پرستی کا بیج بو کر اور سنسنی پھیلا کر۔ ہوس زر کا روگ انھیں بکنے پر بھی مجبور کر دیتا ہے۔ کتاب میں اس موضوع کی کوریج زیادہ ہے اور تفصیل کے ساتھ بے شمار مثالوں اور اقتباسات کے ذریعہ اسے واضح کیا گیا ہے۔ دوسرا خطرناک مسئلہ جو قومی میڈیا کا ہے وہ ہے مسلم مسائل کو نظر انداز کرنا، بگاڑنا اور مسلم دشمنی کا مظاہرہ کرنا۔ فرقہ وارانہ فساد یا مسلمانوں سے جڑنے والے کسی سماجی، تعلیمی، شخصی اور مذہبی واقعہ کے رونما ہونے کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف زہر افشانی کرنا اسلام اور مسلمانوں کی شبیہ بگاڑنا مصنف نے چار پانچ مضامین میں میڈیا کے منفی کردار کی نشاندہی کی ہے۔ اس منفی رویے کے مقابلے میں کچھ انصاف پسند صحافیوں، مقالہ نگاروں، رپورٹروں اور نامہ نگاروں کی حق پسندی اور حقیقت پسندانہ تحریروں کی اہمیت کو اجاگر کرنے سے مصنف نہیں چوکتے ہیں۔ ان کے بڑپّن اور انصاف پسندی کا انھوں نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

مصنف نے حقیقت پسندانہ جائزے کے ذریعہ اس بات کی وضاحت کی ہے کہ سماج پر میڈیا کا عمومی اثر بہتر نہیں ہے لیکن اس کے باوجود میڈیا کی اہمیت و ضرورت اور اس کے دور رس نتائج کے وہ منکر نہیں ہیں بلکہ بسا اوقات میڈیا کے منفی رویے سے خیر کا پہلو نکل آتا ہے۔ ہندوستانی میڈیا اپنی تعصب پسندی اور فرقہ واریت کے بنیادی عنصر کے سبب بابری مسجد سانحے اور نائن الیون سانحے کو محور فکر و عمل بنا کر ہسٹیریائی جنون کا شکار ہو گئی ہے اور دنیا میں زرد صحافت کا نمائندہ بن گئی ہے مصنف نے اعلامی نیوز، اکتشافی خبر ناموں، تجزیاتی تبصروں، انفجاری خبروں کی ٹی سیریز اور اشتہارات سب کا جائزہ لیا ہے سب کا کھنڈن کرنے کے بعد سب کے منفی رول پر افسوس کا

اظہار کیا ہے۔ تیسری فصل میں مصنف نے ریڈیو، ٹیلی ویژن اور ایس ایم ایس کی تاریکی کی تفصیلات دی ہیں الیکٹرانک میڈیا کی ہمہ گیر رسائی پر تفصیلی گفتگو کی ہے اور اسے پڑھنے اور دیکھنے والوں کی اعدادی تفصیل دی ہے۔

اس میں سب سے تفصیلی گفتگو جراحاتی اور مہم جویانہ الکٹرنک میڈیا کی کارروائیوں پر ہوتی ہے۔ گفتگو کا عنوان ہے ''نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن'' اس کی افادیت کا اعتراف ہے لیکن اس کی قانونیت عدم قانونیت اصول و بے اصولی پر لمبی بحث ہے۔ حاصل یہ کہ اس کے لیے اخلاقی ضابطہ بندی ضروری ہے۔

پریس کونسل کے اخلاقی ضابطوں اور قوانین پر عمل نہ ہونے کا انھوں نے بجا طور پر شکوہ بھی کیا ہے۔ اردو صحافت کی کسمپرسی نارسائی اور اردو زبان کی مظلومیت اور اردو صحافیوں کی پریشانیوں اور معاشی ناہمواریوں کی داستان بھی سنائی ہے۔ الیکٹرنک میڈیا اور صحافتی دنیا اردو دنیا سے بھرپور استفادہ کرتی ہے اور مطلب نکال کر برطرف ہو جاتی ہے۔ اردو کا جائز مقام دلانے کے لیے بھی کوشش نہیں کرتی۔ ہندوستان میں یہ عام روش بن گئی ہے۔ اس فصل کے آخری مضمون میں دنیا بھر میں اہم اردو ویب سائٹس کی تفصیل دی گئی ہے جو لائق مطالعہ ہے۔ یہ کتاب میڈیا پر ایک بہترین عملی جائزہ اور تعارف ہے اس کا مطالعہ قارئین کے لیے بہت مفید ہوگا۔

(مضمون نگار معروف عالم دین اور کالم نگار و مصنف ہیں)

ابن احمد نقوی

موجودہ میڈیا کے حمام میں جہاں اب بے لباسوں کی اکثریت ہے وہیں کچھ ایسے باضمیر ذمہ دار اور دیانت دار صحافی بھی ہیں جنھوں نے اس حمام میں رہ کر بھی روش عام کے مطابق خود کو بے لباس نہیں ہونے دیا اور عصمتِ قرطاس و قلم پر لوکی داغ نہیں آنے دیا۔ ایسے ہی صحافیوں میں ایک نام سہیل انجم کا ہے۔ یہ نام صحافت میں کافی معتبر اور معروف ہے۔ سہیل انجم نے قلیل مدت میں اپنی شناخت بنائی ہے اور مقام حاصل کر لیا ہے۔ انھوں نے روایتی ڈگر سے ہٹ کر اپنے لیے

نئی راہ بنائی ہے ان کے لیے صحافت پروفیشن (پیشہ) بھی ہے اور مشن بھی۔ وہ اس دور میں جب کہ صحافت بے آبرو اور صحافی بے وقار ہو چکا ہے۔ صحافت کی پرانی اور اعلیٰ قدروں کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ جو کبھی صحافت کی پہچان تھیں۔ آج کے اس دور میں جب کہ پیسہ ہی سب کچھ ہے اور عیش کوشی مطمحِ حیات بن گئی ہے۔ پرانی قدروں کو سینہ سے لگا کر عیش و فراغت کی راہوں سے بچ کر چلنا اور اپنے ضمیر کو مردہ نہ ہونے دینا خود ایک جہاد ہے۔ سہیل انجم اور ان جیسے بیدار ضمیر صحافی ہی آج صحافت کی صداقت و عظمت کے علم بردار ہیں۔

''میڈیا: روپ اور بہروپ'' ان کی ایک بہت اہم کتاب ہے جس میں انھوں نے میڈیا کے روشن اور تاریک دونوں پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ وہ چونکہ ''محرم راز درونِ مے خانہ'' یا عام الفاظ میں ''گھر کا بھیدی'' ہیں اس لیے انھوں نے وہی کچھ لکھا ہے جو دیکھا ہے پرکھا ہے اور جس خارزار سے وہ گزرے ہیں۔ اسے ہم صحافت میں ان کا سفر نامہ یا ان کی سوانح بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس میں انھوں نے کھل کر میڈیا کی نقاب کشائی کی ہے۔ اس کے مکروہ خد و خال کو دکھایا ہے اور مثالیں دے کر اپنے دعوے کو ثابت کیا ہے اسی کے ساتھ انھوں نے اپنے قبیلے کے ان گرامی مرتبت افراد کے نام بھی گنائے ہیں جنھوں نے اس شعلہ زار میں رہتے ہوئے بھی حرف حق کہنے کا حوصلہ رکھا اور طاغوتی طاقتوں سے مرعوب نہیں ہوئے۔ اس کے لیے بھی انھوں نے نام بنام مثالیں پیش کی ہیں۔ ان صحافیوں کی تحریروں کے اقتباس پیش کیے ہیں۔ ان عظمت مآب صحافیوں کو سلام۔

سہیل انجم نے یہ کتاب لکھ کر نہ صرف اپنے قبیلے کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی ہے بلکہ پوری قوم کو آئینہ بھی دکھایا ہے کہ تم جسے معتبر سمجھتے ہو وہ اکثر اوقات کس قدر نا معتبر ہوتا ہے۔ یہ جرأت اظہار اور حوصلہ انسان میں اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب وہ خود بے داغ ہو۔ وہی دوسروں کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ سکتا ہے جس کی اپنی رگیں صحت مند اور توانا ہوں۔ ایسی اہم اور بے باک کتابیں تاریکیوں میں چراغ کا کام کرتی ہیں اور اس خارزار میں قدم رکھنے والوں کو گرنے یا گمراہ ہونے سے روکنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مسلم تنظیمیں ایک عرصہ سے اس بات پر زور دیتی رہی ہیں کہ مسلمانوں کو میڈیا میں زیادہ تعداد میں آنا چاہیے تاکہ وہ نہ صرف میڈیا کو ایک صحت مند

راہ دے سکیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق میڈیا کا جو منفی رویہ ہے اور جسے ایک مخصوص ذہنیت رکھنے والا طبقہ غذا فراہم کرتا ہے اس کا تدارک بھی ہو سکے۔ سہیل انجم کی کتاب کا مطالعہ کر کے اس کی ضرورت کا احساس شدید تر ہو جاتا ہے، ساتھ ہی خوشی بھی ہوتی ہے کہ میڈیا میں سہیل انجم جیسے بے باک اور بے داغ صحافی موجود ہیں جو حرف حق کو حرف برہنہ کی طرح کہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ ان سے درخواست ہے کہ وہ ایسے نو آموز صحافیوں کی تربیت کی طرف توجہ فرمائیں جو صحافت کی اعلیٰ قدروں کے محافظ بن سکیں اور ان کی ہی طرح صحافت کو مشن سمجھ کر کمٹمنٹ کے ساتھ کام کریں۔ کہتے ہیں کہ چراغ سے چراغ جلتے ہیں لہٰذا انھیں نئے چراغ جلانے کے اپنے فرض کے تئیں بیدار رہنا چاہیے۔ اس کتاب کو وسیع تر حلقوں تک پہنچانے کے لیے اگر اس کا پورا یا بعض اہم مقالات کا ہندی میں ترجمہ کیا جائے تو بات دوسروں تک پہنچنے میں آسانی ہوگی۔ جو لوگ میڈیا اس کے ذہن اور اس کے طریقہ کار کو سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ کتاب بے حد معلومات فراہم کرنے والی ہے کیونکہ یہ اس میدان کے ایک ''ایکسپرٹ'' کے تجزیہ پر مشتمل ہے اور ایک طرح سے ریسرچ پیپر ہے۔ ہمارے دینی مدارس کے جو طلبہ صحافت میں آنا چاہتے ہیں ان کے لیے یہ مشعل راہ ثابت ہوگی۔ انہیں بطور خاص اس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

(مضمون نگار بزرگ صحافی، قلمکار اور دانشور ہیں)

ڈاکٹر رضوان احمد

گزشتہ ایک دہائی میں اردو صحافت پر ایک درجن سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سے بیشتر میری نظر سے گزری ہیں۔ ان میں کئی اعتبار سے سہیل انجم کی نئی کتاب ''میڈیا۔ روپ اور بہروپ'' بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ اس لحاظ سے بھی کہ یہ ایسے گوشوں کا احاطہ کرتی ہے جو دوسروں کی نظروں سے اوجھل رہے ہیں۔ ایک جانب جہاں انھوں نے اردو اخبارات کو اپنا موضوع بنایا ہے وہیں دوسری جانب الیکٹرانک میڈیا کا بھی بھرپور جائزہ لیا ہے اور ہر موضوع کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔

ان کے کئی مضامین پہلے اخبارات و رسائل میں پڑھنے کا موقع ملا اور سیمیناروں میں سننے کا بھی۔ لیکن اب یکجا ان کا مطالعہ کیا تو دو آتشہ لطف آیا۔ انھوں نے جو موضوع اٹھایا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں میڈیا اور خوف کی نفسیات اور قومی پریس اور فرقہ واریت کے علاوہ گجرات فسادات میں میڈیا کا رول بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر آخرالذکر کی اہمیت اس لحاظ سے بھی ہے کہ گجرات فساد ختم ہو گیا مگر اس کے اثرات بد آج بھی باقی ہیں۔ گجرات فسادات میں میڈیا کا رویہ مثبت اور منفی دونوں رہا ہے۔

میڈیا کے اثرات کیا ہیں، اس کی پہنچ کس حد تک ہے، اسٹنگ آپریشن کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں اس پر انھوں نے مبسوط مقالہ لکھ کر تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا انھوں نے تقابلی مطالعہ بھی پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ ایس ایم ایس جیسے جدید تر ذریعہ ترسیل پر معلوماتی بحث کی ہے۔ اس کتاب کا آخری باب میرے لیے خاصا پرکشش اور پر از معلومات ہے کیونکہ زندگی کے چالیس برسوں تک میں نے اخبارات کے کالموں کی خاک چھانی ہے مگر الیکٹرانک میڈیا کی دنیا میرے لیے نئی ہے۔ اس لیے اردو کی اہم اور قابل ذکر ویب سائٹس جیسا مضمون میرے ذہن میں نئے ابواب وا کرتا ہے، نئی معلومات بہم پہنچاتا ہے۔

صحافت کے طلبا کے لیے تو یہ کتاب اہم اور مفید ہے ہی مگر صحافت سے دلچسپی رکھنے والے تمام اصحاب کے لیے بھی قابل مطالعہ ہے۔ میں اس کتاب کی اشاعت پر سہیل انجم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

(مرحوم رضوان احمد ایک حق گو صحافی اور روزنامہ عظیم آباد ایکسپریس پٹنہ کے مدیر رہے ہیں)

عارف اقبال

میڈیا سے متعلق اس کتاب میں میڈیا کے موضوع پر مختلف النوع عنوانات سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے میڈیا کا گہرائی سے جائزہ لیا ہے۔ وہ محض ایک صحافی نہیں بلکہ تحقیق و تجزیہ پر بھی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے تمام ہی مضامین میں یہ رنگ دیکھنے کو ملتا ہے۔ وہ حق گوئی اور صداقت

کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ لہٰذا میڈیا کی کمزوریوں پر انھوں نے بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ نیشنل میڈیا پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا کہنا ہے ''فسادات میں میڈیا دو قسم کے رول ادا کرتا ہے۔ ایک فساد سے قبل فساد کی فضا ساز گار کرنا اور دوسرا فساد شروع ہونے کے بعد جانبدارانہ رپورٹنگ سے اسے اور بھی ہوا دینا۔'' اسٹنگ آپریشن کو بچھو کا ڈنک مارنے والا آپریشن قرار دیتے ہوئے مصنف نے طنزیہ لب و لہجے میں ایک جگہ لکھا ہے ''حقیقت تو یہ ہے کہ اسٹنگ آپریشنوں کی صحافت نے تمام اعلیٰ صحافتی قدروں کو پامال کر کے رکھ دیا ہے۔ اب اہلِ صحافت کو چاہیے کہ وہ صحافتی اخلاقیات کی ایک نئی کتاب مرتب کریں جس کے صف اول پر جلی حروف میں لکھا جائے کہ دھوکہ دینا، جھوٹ بولنا، روپ بہروپ بھرنا اور عورت کو بطور چارہ استعمال کرنا کسی بھی اعتبار سے نہ تو غلط ہے نہ ناپسندیدہ۔'' اردو اخبارات کی جذباتیت پر کلام کرتے ہوئے اور ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مصنف ایک جگہ لکھتے ہیں: ''ان اخبارات کا عام طور پر یہ رویہ ہوتا ہے کہ یہ کسی بھی معاملہ کو فوراً مذہبی رنگ دے دیتے ہیں خواہ روزگار کا معاملہ ہو، تعلیم کا معاملہ ہو، ریزرویشن کا معاملہ ہو، ملازمتوں کا معاملہ ہو یا پھر عراق امریکہ جنگ ہو، اسرائیل فلسطین کشمکش ہو یا پھر ایسا ہی کوئی دوسرا معاملہ ہو۔'' اس طرح پوری کتاب میں اپنے موضوع کے لحاظ سے مصنف نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ وہ اس اہم تصنیف پر قابلِ صد مبارک باد ہیں۔ یہ کتاب اردو کے علاوہ اردو سے جڑے ہر فرد کے لیے قابل مطالعہ ہے کیونکہ اس میں موجودہ میڈیا کی برہنہ تصویریں بڑی جرأت کے ساتھ دکھائی گئی ہیں اور جمہوریت کے اس چوتھے ستون کے بارے میں از سر غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔

(مضمون نگار رسالہ ''اردو بک ریویو'' کے ایڈیٹر ہیں)

ارشد امان اللہ

یہ کتاب سہیل انجم کے ۱۹ مضامین کا مجموعہ ہے جو ہندوستانی میڈیا کے مواد، تکنیک، اپروچ اور رجحانات سے بحث کرتی ہے۔ یہ کتاب ان معنوں میں اہم ہے کہ مصنف نے ایک طرف

جہاں کچھ ایسے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو بالکل نئے اور اچھوتے ہیں، وہیں دوسری طرف اردو صحافت کی دنیا میں رائج چند برائیوں پر بے باک تبصرہ بھی کیا ہے۔

مصنف بذات خود ایک ورکنگ صحافی ہیں لہٰذا ان کے ذاتی تجربات جا بجا ان کے خیالات کو تقویت بخشتے ہیں۔ فی الحال میڈیا کی نکیل بازار کے ہاتھ میں ہے جو گلوبلائزیشن اور لبرلائزیشن کے زیر اثر شتر بے مہار کی طرح دنیائے میڈیا کو اتھل پتھل کرنے کے در پے ہے۔ مسالہ اور سنسنی خیزی اب نیوز میڈیا کا لازمہ بن چکے ہیں۔ ٹی آر پی اور قارئین کی تعداد میں اضافہ کی ہوڑ نے پروفیشنلزم کی نئی قواعد کی تدوین شروع کر دی ہے۔ ایسے میں سہیل انجم نے صحافیوں کے لیے پریس کونسل آف انڈیا کی گائیڈ لائنس کی معنویت کو از سر نو دریافت کرنے کی بحث اٹھائی ہے۔ انھیں تکلیف ہے کہ یہ ہدایات بری طرح پامال ہو رہی ہیں جس کا نتیجہ جھوٹی خبروں اور متعصب رپورٹنگ کی اشاعت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ تکنیکی ترقی اور معلوماتی انقلاب کے زیر اثر میڈیا میں نئے ابعاد جڑ گئے ہیں اور اس کی کارکردگی میں گوناگوں پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ لہٰذا مصنف کا خیال ہے کہ پریس کونسل کو اپنی بعض پرانی ہدایات پر از سرِ نو غور کرنا چاہیے اور ان کو مزید لبرل بنانا چاہیے تھا کہ صحافیوں کو اپنے فرائض کی انجام دہی کے راستے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئے۔

اسی بحث سے جڑا ہے سماج میں میڈیا اور صحافیوں کے رول کا مسئلہ بھی۔ جب بات اسٹنگ آپریشن کے تناظر میں کی جائے تو یہ مسئلہ اور بھی سنگین ہو جاتا ہے۔ حالیہ دنوں میں اسٹنگ آپریشن کا چلن ہندستانی میڈیا میں اٹھان پر ہے۔ اس کتاب میں حصول خبر کے اس نئے طریقے پر مختلف زاویے سے نظر ڈالی گئی ہے۔ ہندوستان میں اسٹنگ آپریشن کی داغ بیل تہلکہ ڈاٹ کام نے ڈالی لیکن آپریشن در یودھن اور آپریشن چکرویوہ کے بعد یہ سوال پوری شدت سے اٹھنے لگا ہے کہ کیا میڈیا کو لوگوں کی ذاتی زندگی میں جھانکنے کا حق ہے اور اگر نہیں تو اسے اس روش پر چلنے سے روکنے کے لیے کیا کرنا چاہیے؟ گرچہ اسٹنگ آپریشن کے ماہرانیردھ بہل کا دعویٰ ہے کہ ان کا مقصد صرف اور صرف 'بدعنوانیوں کو بے نقاب کرنا' ہوتا ہے اور وہ صرف 'عوامی مفاد' میں ہی ایسا کرتے ہیں، سوال یہ ہے کہ کیا میڈیا کو کچھ بھی کرنے کی آزادی ہے نیز 'عوامی مفاد' جو کہ ایک مبہم اصطلاح ہے،

کی تشریح کا حق کیا ہر ایک شہری کو حاصل ہے؟ کیا ایسا کرتے وقت میڈیا عدلیہ اور انتظالیہ کے دائرہ کار پر شب خون نہیں مارتا ہے؟

کتاب کے ایک اور دلچسپ مضمون میں مصنف نے ایس ایم ایس کو بھی ایک ذریعۂ ابلاغ تسلیم کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ رائے عامہ کو ہموار کرنے میں کس حد تک معاون ہے۔ یہ عجلت پسند میڈیم ہر کس و ناکس کی دسترس میں ہے۔ خاص کر نوجوان طبقہ اسے سنجیدگی سے لیتا ہے اور جم کر اس کا استعمال کرتا ہے۔ اس میڈیا کی بڑھتی مقبولیت اور اہمیت کے پیش نظر ہی مشہور میڈیا اسکالر سدھیش پچوری نے اسے 'موبائل ڈیموکریسی' سے تعبیر کیا ہے۔ خاص کر جب کوئی اخبار یا ٹی وی چینل کسی مسئلہ پر یا پروگرام کے بارے میں عوامی رائے جاننے کے لیے اس کا استعمال کرتا ہے تو اس کی تاثیر دوبالا ہو جاتی ہے۔ اس عمل میں موبائل سروس فراہم کرنے والی کمپنیوں کے فوائد اور ان میں کارپوریٹ میڈیا ہاؤس کے حصے سے بھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ایس ایم ایس کی رفتار کا ساتھ دینے کی خاطر ہر زبان کی لفظیات جس عمل سے گزر رہی ہے وہ بھی اپنے آپ میں مطالعہ کا ایک دلچسپ موضوع ہے۔

ایک مضمون پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے تقابلی مطالعہ کے لیے وقف ہے۔ اس کے آخری پیراگراف میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ بعض اوقات اخبارات میں چھپی خبروں کے پیچھے نیوز چینلوں کے رپورٹر بھاگتے ہیں اور بعض اوقات نیوز چینلوں کی خبروں کا پیچھا پرنٹ میڈیا کے رپورٹر کرتے ہیں۔ اخبارات میں چینلوں کے اشتہارات آتے ہیں اور چینلوں میں اخبارات کے۔ اس طرح ٹی وی کی آمد کے بعد اخبارات کے عنقا ہو جانے کی جو پیش گوئی کی گئی تھی وہ سراسر غلط ثابت ہو جاتی ہے۔

مصنف نے مختلف ورنا کولر پریس کی جذباتیت پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ انھیں یہ ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ اردو اخبارات میں جو شیلے مضامین کی روایت کافی قدیم ہے اور آج تک جاری ہے۔ اس طرح کی تحریریں مسلمانوں کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہو رہی ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ سنجیدہ تحریریں مسلم قارئین پڑھنا نہیں چاہتے۔ دوسرے مسائل پر بھی تفصیلی بحث کتاب میں

موجود ہے۔ سب سے برا حال ہے اردو کے کارگزار صحافیوں کا جن کی نہ کوئی یونین ہے اور نہ ہی ان کے سرمایہ دار مالکوں کو ان کے مسائل پر سوچنے کی فرصت۔ اردو صحافت کی خدمت میں ''موم کی طرح جلتے'' ان انسانوں کے تعلق سے اردو دنیا کے چودھریوں کی خاموشی لائق گردن زدنی ہے۔ اردو ویب سائٹ سے متعلق آخری مضمون بے حد معلوماتی ہے۔ اس طرح سہیل انجم کی یہ بر وقت اور جرأت مندانہ کاوش اردو میں میڈیا اسٹڈیز پر موجود لٹریچر میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔
(مضمون نگار ایک فلم ساز اور محقق ہیں)

ڈاکٹر منور حسن کمال

کتاب کے نام سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنف نے میڈیا سے متعلق کئی نئی باتوں کی جانب لوگوں کی توجہ مبذول کرائی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کے مختلف پہلوؤں کا گہرائی و گیرائی سے جائزہ لیا ہے اور اپنے طور پر کوشش کی ہے کہ یہ جائزہ غیر جانب دارانہ انداز میں لیا جائے۔ یقین ہے کہ ان کی یہ کوشش رائیگاں نہیں جائے گی۔ الیکٹرانک میڈیا کی طاقت پرواز سے متاثر ہو کر انھوں نے صحیح لکھا ہے کہ صحافت پہلے صرف اخبارات و رسائل تک محدود تھی، اس میدان میں بلا شرکتِ غیرے اس کے اجارہ داری تھی۔ آج ایک اور شہسوار بھی اس میدان میں کود پڑا ہے جو پہلے شہسوار کے مقابلے میں تیز، زیادہ ذہین، زیادہ چمک دمک رکھنے اور بہت جلد رسائی کی قدرت رکھنے والا مرد میدان ہے۔

''میڈیا کی تکنیکی شناخت اور رسائی'' کے ذیل میں نیوز چینلوں کے اسٹنگ آپریشن، الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا تقابلی جائزہ، ریڈیو اور ٹی وی نشریات: ابتدا اور ارتقا کے ساتھ ساتھ موجودہ زمانے کے اہم ترسیلی ذریعہ ایس ایم ایس سے متعلق بھی تفصیلی گفتگو کی گئی ہے۔ ''اردو منظر نامہ'' کے ذیل میں الیکٹرانک میڈیا اور اردو، اردو پریس اور جذباتیت اور اردو صحافت کے مسائل پر طائرانہ نظر جیسے اہم موضوعات پر اس طرح لکھا گیا ہے کہ صحافت کے وہ گوشے واضح ہو گئے ہیں جو شاید ابھی تک پوشیدہ تھے۔ کتاب کی زبان سلیس اور سادہ ہونے کے ساتھ ساتھ پھیکی اور بے

رس نہیں ہے۔ سہیل انجم نے اپنے متنوع مضامین میں جو بات قاری تک پہنچانی چاہی ہے اس میں وہ کامیاب ہیں۔ یقین ہے ''میڈیا روپ اور بہروپ'' کی اس کے شایانِ شان پذیرائی ہوگی۔

(مضمون نگار صحافی و ادیب ہیں)